

چونکاویے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈائجسٹ

کراچی

ڈ

May 2018

قیمت - 70 روپے



چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ  
ڈائجسٹ  
کراچی

جلد نمبر 19 شماره نمبر 8 مئی 2018ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

منیجر ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت - 70/- روپے

سالانہ قیمت - 1500/- روپے



ادارہ کا کسی بھی رائلز کے خیالات سے متعلق ہونا ضروری نہیں۔ ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات یک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

## گھر بیٹھے ڈر ڈائجسٹ حاصل کریں

قارئین کرام! کیا آپ کو ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کہیں سے بھی نہیں مل رہا؟

اگر ایسا ہے تو ہم آپ کی سہولت کے لئے ان کو چند ضروری ہدایت بتاتے ہیں جن پر

عمل پیرا ہو کر آپ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ با آسانی خرید، یا منگوا سکتے ہیں۔

آپ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ بذریعہ وی، پی منگوا سکتے ہیں، وی پی منگوانے کا طریقہ کار آپ

کوفون پر بتا دیا جائے گا۔

آپ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کے سالانہ خریدار بھی بن سکتے ہیں، ڈر ڈائجسٹ کی سالانہ

قیمت - 1500/- روپے ہے جسے آپ، ایزی پیس، یا پوسٹ آفس سے منی آرڈر کے ذریعے

ہمیں بھیج سکتے ہیں۔ جس سے آپ کو ایک سال تک گھر بیٹھے ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ موصول ہوتا

رہے گا۔

ویسے تو ڈر ڈائجسٹ پاکستان کے ہر شہر میں جاتا ہے مگر پھر بھی اتنے بڑے ملک میں کوئی نہ

کوئی شہر چھوٹ جاتا ہے، اگر آپ کو اپنے شہر میں ڈر ڈائجسٹ موصول نہیں ہو رہا تو اپنے شہر کا

نام، اور اپنے قریبی بک اسٹال، یا ایجنٹ کا نام ہمارے دیئے گئے نمبر پر، یا بذریعہ خط ہمیں لکھ

کر بھیجیں ہم ان سے رابطہ کر کے انشاء اللہ آپ کی پریشانی کا ازالہ کریں گے۔

قارئین کرام ڈر ڈائجسٹ نہ ملنے کی صورت میں ہمارے نمبر پر رابطہ کریں۔

021-32744391

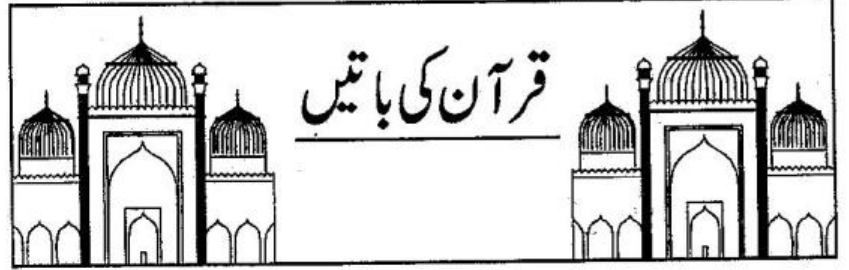
آپ ہمیں ای میل بھی کر سکتے ہیں — dardigest01@gmail.com

منی آرڈر بھیجنے کا پتہ:۔ ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ میز انائن فلوور اردو بازار کراچی۔





## قرآن کی باتیں



☆ اللہ نے کسی آدمی کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے اور نہ تمہاری عورتوں کو جن کو تم ماں کہہ بیٹھے ہو تمہاری ماں بنایا اور نہ تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ تو سچی بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے مومنوں! لے پالکوں کو ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارا کرو کہ اللہ کے نزدیک یہی بات درست ہے۔ اگر تم کو ان کے باپوں کے نام معلوم نہ ہوں تو دین میں وہ تمہارے بھائی اور دوست ہیں اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو اس پر مواخذہ ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 4 سے 5)

☆ اگر تم عجیب بات سنی جا ہو تو کافروں کا یہ کہنا عجیب ہے کہ جب ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا اسر نو پیدا ہوں گے؟ یہی لوگ ہیں جو اپنے رب سے منکر ہوئے ہیں۔ اور یہی ہیں جن کی گردنوں میں طوق ہوں گے اور اہل دوزخ ہیں کہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ (سورۃ نعرہ 13 آیت 5)

☆ تمہارے لئے دریا کی چیزوں کا شکار اور ان کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے یعنی تمہارے اور مسافروں کے فائدے کے لئے اور جنگل کی چیزوں کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں تم پر حرام ہے اور اللہ جس کے پاس تم سب جمع کئے جاؤ گے ڈرتے رہو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 96)

☆ یہ بات تمہارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا پھر اگر یہ لوگ جیٹی کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت حال تو معلوم ہو ہی چلی ہے تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ۔ پھر دونوں فریق اللہ سے دعا والی التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔ یہ تمام بیانات صحیح ہیں اور اللہ کی سوا کوئی معبود نہیں، اور بے شک اللہ غالب اور صاحب حکمت ہے۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 60 سے 62)

☆ اور جان رکھو کہ جو چیز تم کفار سے لوٹ کر لاؤ، اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہل قربت کا اور قیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ پر اور اس نصرت پر ایمان رکھتے ہو جو حق و باطل میں فرق کرنے کے دن یعنی جنگ بدر میں جس دن دونوں فوجوں میں مذہبیٹھ ہوگی، اپنے بندے محمد پر نازل فرمائی۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورۃ انفال 8 آیت 41)

☆ اس دن کفر کے پیشوا اپنے پیروں سے بیزاری ظاہر کریں گے اور دونوں عذاب الہی دیکھ لیں گے اور ان کے

آپس کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے یہ حال دیکھ کر پیر دی کرنے والے حسرت سے کہیں گے کہ اے کاش ہمیں پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ جس طرح یہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں اسی طرح ہم بھی ان سے بیزار ہوں۔ اس طرح اللہ ان کے اعمال حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 166 سے 167)

☆ ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے شب قدر ہزار مہینے سے بہت رہے اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لئے اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں یہ رات طلوع صبح تک امان اور سلامتی ہے۔ (سورۃ قدر 97 آیت 1 سے 5)

☆ اور ہم نے لقمان کو داناتی بخشی کہ اللہ کا شکر کرو۔ اور جو شخص شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے شکر کرتا ہے اور جو ناشکری کرتا ہے تو اللہ بھی بے نیاز ہے۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ بیٹا اللہ کے ساتھ شرک نہ کرنا شرک تو بڑا بھاری ظلم ہے۔ (سورۃ لقمان 31 آیت 12 سے 13)

☆ اور جو لوگ اپنی عورتوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہوں، تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار بار اللہ کی قسم کھائی کہ بے شک وہ سچا ہے اور پانچویں بار یہ کہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے کہ وہ پہلے چار بار اللہ کی قسم کھائے کہ بے شک یہ جھوٹا ہے اور پانچویں دفعہ یوں کہے کہ اگر یہ سچا ہو تو مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتیں مگر وہ صاحب کرم ہے اور یہ کہ اللہ تو بہ قبول کرنے والا اور حکیم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 6 سے 10)

☆ مومنوں! اپنے گھروں کے سوا دوسرے لوگوں کے گھروں میں گھر والوں سے اجازت لئے اور ان کو سلام کئے بغیر داخل نہ ہوا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور ہم یہ نصیحت اس لئے کرتے ہیں کہ شاید تم یاد رکھو اگر تم گھر میں کسی کو موجود نہ پاؤ تو جب تک تم کو اجازت نہ دی جائے اس وقت لوٹ جاؤ تو لوٹ جایا کرو۔ یہ تمہارے لئے بڑی پالیسی کی بات ہے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ جانتا ہے ہاں اگر تم کسی ایسے مکان میں جاؤ جس میں کوئی بستا ہو اور اس میں تمہارا اسباب رکھا ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو پوشیدہ کرتے ہو اللہ کو سب معلوم ہے۔ (سورۃ نور 24 آیت 27 سے 29)

☆ بدکاری کرنے والی عورت اور بدکاری کرنے والا مرد جب ان کی بدکاری ثابت ہو جائے تو دونوں میں سے ہر ایک کو سودے مارو۔ اور اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو شرع اللہ سے حکم میں تمہیں ان پر ہرگز ترس نہ آئے۔ اور چاہئے کہ ان کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت بھی موجود ہو۔ (سورۃ نور 24 آیت 2)

(کتاب کا نام ”قرآن مجید کے روشن موتی“ بشکر یہ شیعہ بک ایجنسی کراچی)



\_\_\_\_\_

☆ نیت صاحبہ یہ حقیقت ہے کہ ہم لوگ فوت کرالہذا پاک اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واضح احکامات کی نافرمانی کر رہے ہیں۔ ہمیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی لگن نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے من میں مٹھو بننے کی فکر ہے۔..... نیت صاحبہ تحریر ہے بی بی والا بی بی! گراف نکال دیا گیا ہے اس کے لئے معذرت۔ کیونکہ وطن عزیز میں تشدید برائے تشدید اور اختلاف برائے اختلاف کے لوگ ہیں اور ہر آدمی کی سوچ الگ الگ ہے۔.....

\_\_\_\_\_

☆ ☆ ☆ ایس حبیب صاحب: چلے خوشی کی بات ہے کہ آپ کی کہانی "پرانی شوہ" شائع ہوگئی اور اب بنی کہانی کے لئے انتظار کی گھڑیاں.....  
 ویسے ماشاء اللہ آپ کو ہندی الفاظ پر عبور حاصل ہے..... ڈر پڑھنے والے قارئین کو ہندی پر عبور حاصل نہیں..... تو پلیز! آئندہ اس پر ڈراما  
 غور کیجئے گا۔ شکریہ۔

☆ ☆ ☆ تھانکار فاطمہ صاحبہ: ڈوڈا انجسٹ میں موٹ و پلیم آپ کی ارسال کردہ کہانی ”حویلی کاراڑ“ آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی اور امید ہے کہ حسب وعدہ آپ جلد از جلد دوسری کہانی بھی ارسال کر دیں گی۔ Thanks۔

انشاء اللہ ذکر کا ہر شمارہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے۔ خاص کر سرور دیکھ کر تو دل خوشی سے جھوم اٹھتا ہے اور اگر ہم اس میں اپنی کہانی بھی کیجے کیسے لیں تو حردہ دماغنا نہیں سنا ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو ”دُر“ کے سب لکھاریوں اور قارئین سے یہ گزارش کریں گی کہ میرے لئے دعا

موجا ایک زبردست سیخویر لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کر دوں پھر تو امتحانات کے بعد ہی ارسال کروں گی۔ تو جناب ہم اپنی تحریر ارسال کر رہے ہیں کی پیشی دور کر دیجئے گا اور پھر شرائع لکھ کر دیجئے گا۔ ڈرے متعلق تمام احباب کو سلام میں یاد رکھئے گا۔ والسلام۔

**شک نور** فیصل آباد سے، السلام علیکم مارچ کا شمار دیکھ کر خوشی ہوئی اپنی کہانی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی خط اور غزل ڈائجسٹ میں نہ  
 مٹی جس سے مجھے تم کو یاد کہہ ہوا۔ راشد نے ظاہر صاحب کی اہلیہ کے انتقال کی خبر سن کر بے حد غمگین ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس

اناز و سبب کی شاعری اچھی تھی۔ آخر میں اب ایک نئی کہانی بھیج رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی اور ایک بات انکل جی میری چار

اپر مل کوسا لگ رہے ہیں میری کہانی شائع کر کے مجھے دوہری خوشی دیں۔ آخر میں پاکستان زندہ باد۔

☆ رشک نور صاحب: ساگر بہت بہت مبارک ہو اور اس خوشی میں کہانی ”آسیبی پارلر“ شامل اشاعت ہے۔ آئندہ ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ کہانی لکھ کر پڑھ لیا کریں اور اس طرح کہانی کی تصحیح ہو جائے گی۔ امید ہے اس بات پر غور کریں گی ضرور۔

**مسز سندس اقبال** راولپنڈی سے، اپریل 2018 کا ڈر پڑھ کر ایک خاص خوشی کا احساس ہوا۔ خوشی کی وجہ یہ ہے کہ ایک جانب سرورق انتہائی معیاری اور شاندار تھا تو ساتھ میں فوریٹ رائٹر احسان الحق صاحب کی کہانی بھی شائع ہوئی۔ المیہ یہ کہ کہانی ہے جسے میں نے تین مرتبہ پڑھا۔ کہانی میں ایک خاص کشش تھی۔ ایک خاص کششانی انداز میں لکھی یہ کہانی بہت کچھ کہانی ہے۔ بہت ہی زبردست۔ شاید بھائی! اہار صاحب سے بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے منہ میاں مضبوط رہتے ہیں۔ سیاستدان سے لے کر عام آدمی تک سب کا یہی عالم ہے۔ اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا ہی نہیں چاہتے۔ خوب سے خوب تر سیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ عوامی رائے سب سے بڑی ہوتی ہے۔ کوئی بھی کردہ اپنی جماعت کی تعریف کرے تو یہ تعریف نہیں ہوتی، محض پروپیگنڈہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت وطن عزیز میں ہر شعبے میں یہی روش ہے۔ Improvement کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ آپس کی بددعا باشت جاری ہے۔ شاید بھائی! یہ بات نہیں یہاں اس لئے عرض کر رہی ہوں کہ اپنے منہ میاں مضبوط بنانا ذات خود کا کام ہی نہیں ہے۔ عوام الناس کی پسند کی کوئی پروا نہ اترنے کی دلیل ہے اور اوپر سے شکوہ بھی ہے کہ کئی مہینے کی خاطر میں نہیں لاتے۔ کام کوئی بھی ہو، سیاست اور اپنی امور سے لے کر ایک عام طالب علم کے پڑھنے تک۔ سب کام محنت کے متقاضی ہیں۔ یہاں تک کہ اس میں وطن عزیز کا ہر رکن بھی شامل ہے۔ اپنی محنت اور کام سے ثابت کریں کہ آپ بحیثیت رائٹر اپنی کہانی کے ساتھ انصاف کر رہے ہیں یا نہیں؟ ہم قارئین، عام لوگ یعنی پڑھنے والے، خود ہی سمجھ جائیں گے کہ رائٹر نے کیا لکھا ہے، کن الفاظ کے ساتھ اور کیا لکھا ہے۔ آپ کا کام ہی آپ کا نام بن جائے گا۔ پھر آپ میں سے کسی کو بھی خود شائستگی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہی بات حکیم محمد سعید شہید صاحب نے بھی اپنی زندگی میں کئی جگہ مٹی میں دو خوشیاں اور ملیں گی۔ ایسے حبیب خان صاحب اور فلک زاہد کی کہانیاں آ رہی ہیں۔ بس تیار ہو جائیں کہ ڈر میں سرورق پڑھنے والی ہے۔ سب کہانیاں لکھنے کا بہت شکر یہ اور سب کے لئے دعاؤں کے ساتھ۔ اب اجازت دیجئے والسلام۔

☆ سندس صاحبہ: آپ کی باتیں حقیقت پر مبنی ہیں، واقعی مجھ سمیت ہر آدمی اپنے منہ میاں مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ میں خود سے اور ہی وطن عزیز سے تعلق لگاؤ نہ گیا ہے اور غور طلب بات ہے کہ نکل سے زندگی جتنی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں زندہ رہی ہے نہ تباری ہے۔

**مسز فرحین حامد** رحیم یار خان سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب، ڈرڈائجسٹ کا شمارہ اپریل 2018ء اس وقت ذریعہ ہے۔ ڈر کا سرورق بہت خوش نما تھا۔ شہباز احمد صاحب (ایڈیٹ آباد) کی بات کو کچھ آگے بڑھاتے ہوئے یہ انتہاء کروں گی کہ ڈر کے سرورق کو مزید خوشفاک بنائیں۔ کیونکہ یہ کوئی غیر معیاری انتہاء بھی نہیں ہے۔ خوشفاک رسالے کا سرورق دیکھ کر خوف آتا چاہئے۔ چھٹیکس۔ اس مرتبہ اپنے فوریٹ رائٹر احسان الحق صاحب کی کہانی کو پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ سر احسان الحق ڈر کے توسط سے میں ایک طویل عرصے سے آپ کے در پر دستک دے رہی ہوں۔ آپ کہاں ہیں؟ کہانی کیوں نہیں لکھ رہے؟ پھر آپ کی صحت کی خرابی کا معلوم ہوا۔ دعاؤں کا ایک سمندر اپنے آنسوؤں کے ساتھ رپ کا سات نک پھینچا، آخر کار آپ کی جانب سے کہانی آگئی اور پڑھ کر جہاں دل خوش ہوا تو دوسری جانب المیہ عوم سے بھی آگاہی ہوئی۔ ایک ایک سطر ملک کی صورت حال کی بالکل صحیح عکاسی کر رہی ہے اور جس انداز میں آپ نے کہانی کی صورت میں المیہ بیان کیا ہے اور کمال یہ ہے کہ اسے کہانی کے طور پر پیش کیا ہے، ایک تقریر بننے نہیں دیا۔ یہ آپ کا ہی خاصہ ہے، سر۔ ایسی دلچسپ، ایسے سے بھرپور، خوب صورت، حقیقت پسندانہ کہانی لکھنے پر آپ کا بہت بہت شکر ہے۔ اور ڈرڈائجسٹ کی میمنٹ کی بھی نہیں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ دوسری کہانی جان لیوا پڑھی جو کہ حسب معمول ایک بہترین اور لا جواب کہانی ہے۔ آخری کہانی بھی پڑھی جو کہ خیم کہانی تھی۔ پسند آئی، مزید کوشش کریں، آپ بہت اچھا لکھ سکتے ہیں۔ فلک زاہد اور ایس حبیب خان کی کہانیاں اس مرتبہ درمیں شائع ہو رہی ہیں۔ دل اور بھی خوشی سے سرشار ہے۔ اس مرتبہ کے لئے انتہائی۔ والسلام۔

☆ فرحین صاحبہ: سچے فلک زاہد اور ایس حبیب صاحب کی کہانیاں شامل اشاعت ہیں خوش ہو جائیے، ٹائٹل اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے بہت بہت شکر ہے، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ Thanks۔

**محمد اسلم جاوید** فیصل آباد سے، السلام علیکم! غیر روایتی اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، جو نبی کام سے فارغ ہوا

اور شہر جانے کا اتفاق ہوا۔ جب بکشل پر پہنچا تو ماہ اپریل کے ڈرڈائجسٹ سے اچانک ملاقات ہوگئی۔ سرورق بڑے کمال کا تھا۔ پرچہ ملنے ہی دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے۔ اس کے تمام سلسلے اچھے ہیں۔ مثلاً خطوط فقر ان کی باتیں، قوس قزح کے اشعار، غزلیں اور کہانیاں وغیرہ خوب سے خوب تر ہوتی ہیں۔ ہر ماہ مقررہ تاریخ پر ڈرڈائجسٹ کا ہمیں بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے خط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے سرشار ہو کے ہم آپ کو خط تحریر کرتے ہیں، اس باغریلوں کا سلسلہ مختصر ساتھ جن کہانیوں نے ساتھ کیا طوفانی رات، نیا گھر، اندر سے سے اچالے تک، جنمیں شاد کرنا، اندر سے سے اسافر وغیرہ ہے۔ تمام احباب کے خطوط پڑھ کر ڈرڈائجسٹ کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پرچے کا اپنا ایک الگ معیار ہے۔ نئے نئے قلم کاروں کو اپنے پرچے میں جگہ دیتے ہیں بڑی مسرت کی بات ہے۔ میں شب و روز پرچے کی ترقی کے لئے دعا گو رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اجازت دیں زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ اسلم صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، زندگی کوشش اور مسلسل کوشش کا نام ہے، یعنی دنیا ہے کھے سے خالی، دکھ چاروں بحر ہے، غم کے سوا یہاں پر سوچو کیا دھڑا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے ناں۔

**ایس امتیاز احمد** کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ اپریل کا شمارہ وقت سے پہلے مارکیٹ میں آ گیا۔ جو کہ ایک اچھا اقدام اور آپ سب کی پر خلوص محنت کے باعث ممکن ہوا۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ Stroy's اور غزلوں کا انتخاب لا جواب رہا۔ لکھاریوں کے قلم نکھرتے جا رہے ہیں اور خوب لکھ رہے ہیں۔ ڈر ایک خوب صورت میگزین ہوتا جا رہا ہے جو کہ قارئین اور لکھاری اور ڈرڈائجسٹ کا خوب صورت اشتراک ہے۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکر ہے۔ ڈر کے تمام اسٹاف اور ڈر کے خوب صورت لکھنے والے رائٹر اور تمام خوب صورت پڑھنے والے دوپور کو دعا سلام۔ اپنا خیال رکھئے گا۔

☆ امتیاز صاحب: ارسال کردہ تحریریں شامل اشاعت ہیں اور مزید تحریریں موجود ہیں جو کہ آنے والے شمارے میں شامل اشاعت ہوں گی۔ اپنا خیال رکھئے گا۔ شکر ہے۔

**محمد دانیال جونہی** روڈہ قتل سے، السلام علیکم! جناب انگل جی آپ کیسے ہیں، امید کرتا ہوں آپ خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے پورے اسٹاف کو سدا خوش رکھے۔ سلامت رکھے اور لمبی عمر دے۔ ڈر میگزین کے تمام قارئین رائٹر کو میرا پیار اور سلام قبول ہوا۔ اپریل کا شمارہ ایک خوشفاک اور بھیا تک ٹائٹل کے ساتھ 25 اپریل کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی خوشفاک اور بھیا تک تھا اور ساتھ ساتھ خوب صورت بھی تھا اس لئے پورے شمار کو آٹھ چاند لگا دیئے۔ جب شمارے کے اندر گیا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ پر لحاظ سے اچھا اور سہل تھا۔ سب کہانیاں بہت، بہت خوشفاک اور بھیا تک تھیں۔ مجھے 5 دن رات کو سوتے وقت ڈر لگتا رہا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں اور ہر لحاظ سے سہل تھیں۔ اگر یہ کہوں کہ فلاں اچھی تھی فلاں بری تھی تو یہ بالکل نا انصافی اور زیادتی ہوگی۔ قوس قزح میں گیا تو دل خوشی سے دوبالا ہو گیا۔ سب غزلیں بہت، بہت ہی سہل تھیں۔ اپنی غزل دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں مزید ایک غزل اور شعر بھیج رہا ہوں۔ پلیز کسی کے شمارے میں ضرور لگا دیئے گا۔ اب تک کے لئے انتہائی زندگی نے وفا کی تو ابھی صفات کے ساتھ آئندہ ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ میری دعا ہے کہ ڈر میگزین دینی اور رات چوٹی ترقی کرے۔ آمین۔

☆ دانیال صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے اور آئندہ ماہ بھی پر خلوص تجزیہ کے لئے شکر ہے قبول کریں، آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

**محمد حنیف شاکر** نکانہ صاحب سے، سلام مسنون کے بعد خیریت کا طالب خداوند قدوس کے فضل و کرم سے خیریت سے اور آپ کی خیریت کے لئے ہر وقت رب ذوالجلال سے دعا گو ہوں۔ جناب 22 مارچ کو ملتان سے گھر واپس پہنچا تو اپریل کا شمارہ میری آمد کا منتظر تھا۔ اسے دیکھ کر ساری تھکاوٹ دور ہوگئی۔ غزل، شعر اور خط شائع کرنے پر بہت بہت شکر ہے۔ سرورق پر ڈرڈائجسٹ کے ساتھ نیلی آنکھوں والی دوشیزہ بھی کچھ ڈری بھی بٹھی ہے۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر ایمان کو تازگی ملی خطوط کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ جناب جب گل اداسی صاحب! احمد خالد صاحب! اور جناب ڈاکٹر عامر شہزاد صاحب نے کاشی شامی کو پسند کیا۔ سب کا دل کی گہرائیوں سے شکر ہے اور کرتا ہوں۔ خطوط میں سب نے اپنی اپنی رائے سے خوب انصاف کیا، لیکن ادارہ نے خطوط کو جو جوابات دیئے ہیں سب خوب سے خوب تر ہیں۔ قوس قزح میں خوب رنگ نکھرے پڑھنے کو ملے غزل کی دنیا میں قدم رکھا تو یہ کیا اس بات تو تمام غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک ایسے معلوم ہوا





بھی نہیں لگتا کہ وہ گھر والوں کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔۔۔۔۔ خیر یہی نظام قدرت ہے۔ ہر شخص نے ایک دن جانا ہے۔۔۔۔۔ ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور پل پل ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا رہے اور آپ تمام گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

**ڈاکٹر رانا عامر شہزاد** ننگنا صاحب سے، محترم ایڈیٹر صاحب، راسخز دیگر لکھنے والے اور قارئین السلام علیکم، 21 مارچ کو ڈیوٹی سے واپسی پر پٹی وی ٹیلی پر پڑنے والی خبریں نے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ اس سے پڑنے لگا۔ ہر روز ایڈیٹر صاحب اتنی جلدی اعزاز کی کاپی بھیجے ہیں جسے دل سے آپ کا ممنون ہوں۔ اس بار سرور قادی بہت خوب صورت اور ڈراما نگاہیہ کی طرح قرائی صفی پڑھ کر روح کو سکون ملا۔ شمارے میں اپنا لیٹر، شعر اور غزل دیکھ کر بہت خوش ہوئی، مگر کہانی شائع نہ ہونے پر واقعی دلی دکھ ہوا۔ جناب کے پاس میری دو کہانیاں (جو میں نے بہت لگن اور محنت سے لکھی تھیں) ایڈوانس پڑی ہوئی ہیں۔ مگر نجانے مجھے انتظار کی لمبی سولی پر کیوں لٹکایا جا رہا ہے؟ اس بار تیسروں میں مسز سندس اقبال، فلک زاہد، رابعہ آفرین، مسز زینت خان، ایس حبیب خان، خدیجہ فاطمہ، مسز فہیمہ فاطمہ، رشک نور، فاطمہ خان، محترم احسان الحق بریلوی، محمد حنیف شاکر اور خالد عباس نے عمدہ اور جامع تبصرے لکھے۔ کہانیوں میں احسان الحق کی ”الیہ“ فاطمہ خان کی ”خونی نمبر“ ایس امتیاز احمد کی ”پراسرار مخلوق“، نینا خان کی ”نیما گھر“ طارق محمود کی ”اندھیرے کا مسافر“ نسرتین رانا کی شہر خوشاں، شانزہ اعوان کی ”بے چین روح“ مریم فاطمہ کی ”طوفانی رات“ اور شہزاد خان کی ”دیران مندر“ ٹاپ اسٹوریز جانت ہوئیں۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔ قوس قزح میں ایس حبیب خان، سمیرہ عباس، حافظ عابد علی، محمد حنیف شاکر، محمد اسلم اور ہر پڑھنے والے صاحب کے بہترین اشعار پڑھ کر خوشی ہوئی، قزل میں ایس حبیب خان، واجد گدوئی، فلک زاہد، محمد حنیف شاکر، رابعہ آفرین، رشک نور اور خالد عباس نے اعلیٰ کمال کی غزلیں لکھیں۔ نیز ایس امتیاز احمد کی ”یہ وقت“، انشیس ستار کی ”اثر“ ایس حبیب خان کی ”رزق مقدر“، نینا خان کی ”ایک حقیقت“ اور شرف الدین جیلانی کی ”گوہر آباد“ عمدہ اور بقی آموز تحریریں دل کو لگیں۔ ماشاء اللہ تمام راسخز بہت محنت سے لکھ رہے ہیں۔ انہی کے دم سے ”ڈور“ اپنے عروج تک پہنچ رہا ہے۔ فلک زاہد صاحب کے لئے دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد از جلد صحت کا صلہ عطا فرمائے۔ تمام راسخز صاحبان سے میری عاجزی سے گزارش ہے کہ براہ مہربانی آپ کہانیوں کے علاوہ اشعار غزل اور دیگر مختاریوں پر بھی ضرور تبصرہ کیا کریں تاکہ نئے اُبھرتے ہوئے شعر اور راسخز کی بھی حوصلہ افزائی ہو آخروہ بھی ڈراما باقاعدہ ”حصہ“ ہیں۔ ایڈیٹر صاحب مجھے آپ سے ایک چھوٹا سا لگہ ہے۔ آپ میری کہانیاں شائع نہیں کر رہے۔ جناب آخر بندہ ناچیز سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ خیر میری دعا ہے کہ پاکستان کا نبرون ڈراما بجسٹ ہمیشہ تر ترقی کرتا رہے۔ (آمین)

☆☆ عامر شہزاد صاحب: خط پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، اگر آپ دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو دل سے یہی صدا آئے گی کہ زیادہ لگہ یا شکوہ ٹھیک نہیں، کیونکہ آپ کی کہانیاں متواتر شائع ہو رہی ہیں اور اگر ایک ماہ کہانی شائع نہ ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ بڑی کہانی لائن میں لگ کر انتظار کی سولی پر لٹک جاتی ہے۔ خوش ہو جائے، کہانی شامل اشاعت ہے۔

**محمد قاسم** ہری پور سے، السلام علیکم، 25 مارچ کو یونیورسٹی سے واپسی پر پڑنے ڈراما بجسٹ کے درشن ہوئے تو دل میں گلزار ہو گیا۔ ٹائٹل خوبصورت بھی تھا اور خوفناک بھی۔ ایڈیٹر صاحب آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری تحریر کو شمارے میں جگہ دی۔ لاورث جن زاوی کے شائع ہونے کا بھی شدت سے منتظر ہوں۔ احسان الحق صاحب نے ہمیشہ بہت اچھا لکھا ہے اس مرتبہ الیہ بھی ان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ فاطمہ خان اور ایس امتیاز احمد کی کہانیاں بھی خوب تھیں۔ غصبت روح ٹاپ آف دی منتھ رہی۔ نینا خان کی کہانی نیا گھر نے بھی متاثر کیا۔ سفاک کون، گنگنا، ایشین اور طوفانی رات بھی اچھی کہانیاں تھیں۔ دیران مندر ایک نہایت خوفناک ناول تھا۔ قسط وار کہانیاں سرپٹ میں دوڑے جا رہی ہیں، ان میں کچھ تبدیلی آئی چاہیے۔ البتہ ردو کا کی آخری قسط تا پڑھنے کا مال ہے، کیونکہ مجھے شمارہ نہ مل سکا۔ ساحل دعا بخاری اینڈ علیہ زاہر کہاں غائب ہیں؟ ان سے بھی کوئی کہانی کھوائیں۔ اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔

☆☆ قاسم صاحب:

**ربیعہ امجد** قصور سے، السلام علیکم ایڈیٹر صاحب امید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے۔ میں کافی سالوں سے ڈراما بجسٹ پڑھ رہی ہوں لیکن کہانی پہلی بار بھیج رہی ہوں۔ میں نے اس سے پہلے نئے افق ڈراما بجسٹ میں ہی لکھا ہے۔ اس کے

علاوہ پچھلے سال صائغ ڈراما بجسٹ کے تہر اور اکتوبر کے شمارے میں دو قسطوں پر مشتمل میرا ایک ناول آیا تھا۔ ڈر کے لیے یہ میری پہلی کہانی ہے امید ہے کہ میری حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ دعاؤں کی طلب گار ربیعہ امجد۔

☆☆ ربیعہ صاحبہ: ڈراما بجسٹ میں ولیم کہانی آئندہ شمارے میں شائع ہوگی اور ہاں کہانی لکھنے کے بعد ایک مرتبہ پڑھ کر اصلاح کر لیا کریں۔ Thanks۔

**فرح انیس**، السلام علیکم جناب ایڈیٹر صاحب امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہونگے اور دعا ہے رب کائنات سے کہ وہ سب پر اپنا فضل و کرم رکھے (آمین) (میرا نام فرح انیس ہے کراچی سے میرا تعلق ہے، پچھلے تین سال سے دو شیروہ اور کچی کہانیاں میں لکھ رہی ہوں، کچھ دنوں پہلے میری محترمہ فلک زاہد سے بات ہوئی جو ڈراما بجسٹ کی لکھاری ہیں ان سے کافی آپ کے شمارے کی تعریف سنی، پہلی بار خریدنے کا اتفاق ہوا اور اندازہ ہوا کہ محترمہ کی تعریف غلط نہیں۔ پھر کیا تھا ڈراما بجسٹ میں میں نے بھی ڈرتے ڈرتے پہلی حاضری لگا دی، پراسرار کہانیوں سے مجھے عشق ہے اور اب اس عشق کا اظہار ڈر کے شمارے میں ایک تحریر بھیج کر کر رہی ہوں اگلے ماہ انشاء اللہ پھر پرتبصرے کے ساتھ حاضری لگاؤں گی زندگی نے وفا کی تو اگلے اوقات ہوگی انا حافظ۔

☆☆ فرح صاحبہ: ڈراما بجسٹ میں خوش آمدید، بہت بہت شکریہ کہ آپ کو ڈراما بجسٹ بہت اچھا لگا، کہانی آئندہ ضرور شائع ہوگی۔ کہانی لکھنے کے بعد پڑھ کر فیئر کر لیا کریں تو اچھا ہوگا۔

**احسان الحق**، السلام علیکم محترم ایڈیٹر صاحبان، راسخز اور قارئین کرام! اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ اپریل 2018ء کا ڈراما بجسٹ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوئی کیونکہ سرور قادی نے حد متاثر کن ہے اور لکھنے والے تمام راسخز نے اس میں خوب لکھا۔ کہانیوں میں فاطمہ خان صاحبہ، ایس امتیاز احمد صاحبہ، قاسم رحمان صاحبہ، رضوان قیوم صاحبہ، نینا خان صاحبہ، طارق محمود صاحبہ، محترمہ دو صاحبہ، نسرتین رانا صاحبہ، گلاب خان مولگی صاحبہ، فکیل نیازی صاحبہ، فرخندہ نیم صاحبہ، شانزہ اعوان صاحبہ، مریم فاطمہ صاحبہ سب نے خوب کاوش کی۔ جان لیوا کے مصنف جناب راشدند بر طاہر صاحب نے اس مرتبہ پھر سے پڑھنے والوں کی جان دکانے کا بیڑا اٹھالیا اور اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے، بہت زبردست لکھا۔ شہزاد خان صاحب کی کہانی بھی خوب رہی۔ اس کے علاوہ فلک زاہد صاحبہ کی علالت کی خبر پڑھ کر دل دعا گو ہے۔ ہماری بہن ایس حبیب خان صاحبہ کے لئے دعا گو ہوں، آپ کا بے حد شکریہ کہ اس مرتبہ آپ کی کہانی سے بڑھ کر ناچیز کے لئے دوسرا کوئی تحفہ نہیں ہوگا ڈراما بجسٹ میں۔ دو صاحبہ سے انتظار کا سارا بندہ کہ چھوٹی ہی تھی لیکن ہر ماہ مستغنی ڈراما بجسٹ میں ضرور لکھیں، شکریہ۔ ڈراما بجسٹ کی منجسٹ اور ٹیم کا خاص شکریہ کہ سارے کو بہترین انداز میں مزین کر کے قارئین اور راسخز کے سامنے لاتے ہیں، بہت شکریہ۔ اب اجازت دیجئے، والسلام و خیر اندیش۔

☆☆ احسان صاحب: لیجئے جس کا انتظار تھا وہ شاہکار آ گیا۔ یعنی فلک زاہد اور ایس حبیب صاحبہ کی کہانیاں شامل اشاعت ہیں۔ اور اب تو امید ہے کہ قارئین کی پسندیدہ یہ دونوں راسخز اپنی اپنی کہانیاں ضرور ارسال کریں گی تاکہ انہیں پڑھنے والے خوش ہو سکیں گے۔ اور ہاں ہم اور قارئین آپ کی محنت کے لئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی صحت عطا فرمائے۔

**عجب گل اداسی** ٹنڈوالہار سے، امید ہے کہ پوری ڈراما بجسٹ نیم اور راسخز حضرات خیر و عافیت سے ہوں گے۔ لیکن میں خیریت سے نہیں ہوں، کیوں کہ جو کہانیاں میں نے اپنے پیچین میں لکھی تھیں وہ میرا بڑا ہاپا آجائے تک ڈراما بجسٹ میں نہیں لگیں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں جب بھی خط لکھتا ہوں تو صرف اسی موضوع پر لکھتا ہوں۔ تو پھر میں کیا کروں؟ اس موضوع سے میرا پیچھا چھوٹے تو میں کوئی دوسری بات چھیڑوں، ہر بار مجھ سے کہا جاتا ہے کہ دل مضبوط کریں آپ کی کہانی لگ جائے گی۔ دل مضبوط کو میں نے مضبوط کر کے پتھر بنا دیا پھر بھی کہانیاں نہیں لگیں۔ اب آپ مجھے صاف صاف، سال مہینہ کا نام واضح بتائیں جس میں میری کہانی لگے گی۔

☆☆ عجب گل صاحب: آپ کا خط پڑھ کر دلی دکھ ہوا، کیونکہ پیچین سے آپ کہانی لکھتے آ رہے ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ کہانی ابھی تک شائع نہیں ہوئی، ویسے بھی پیچین اور بڑھاپے کی سوچ اور شعور میں بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، دکھ تو مجھے بھی بہت ہے لیکن آپ نے بھی یہ سوچا ہی نہیں کہ آپ کی کہانی کیوں شائع نہیں ہو رہی۔ ایک دو کہانی لکھ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا کیا یہ ٹھیک ہے، میں اکثر اور بار بار قارئین سے راسخزوں سے کہتا ہوں کہ جناب لکھتے لکھتے آؤں لکھاری بن جاتا ہے۔ اکثر نئے راسخزوں کی کہانی اصلاح نہیں بلکہ پوری کی پوری لکھنی پڑ جاتی ہے۔ خیر آپ ان باتوں پر غور کیجئے گا اور ہاں میرا یہ پکا وعدہ ہے کہ آئندہ شمارے میں آپ کی کہانی شائع کر دی جائے گی۔ ☆☆



ایس حبیب خان - کراچی

ایک مغرور اور ناک پرکھی نہ بیٹھنے والے شخص کی عبرت ناک اور لرزہ براندام کہانی

”سرائی پر اہلم.....؟“ گویند سے رہا نہ گیا تو اس نے پوچھا۔  
 ”پراہلم.....؟“ ہرش نے کہا اور تھپہ لگایا۔  
 ”اس سنسار میں ایسی کوئی چیز ابھی پیدا ہوئی نہیں ہوئی ہے جو ہرش وردھن کے لئے پراہلم کرسی ایٹ کر پائے، ہرش وردھن خود اس سنسار کے لئے جب پراہلم ہے۔“ ہرش نے غرور سے کہا تو گویند خاموش ہو گیا۔

گاڑی کچھ ہی دیر میں جہنم کے آفس پہنچ گئی۔  
 ”واؤ! ہم تو ترنت پہنچ گئے۔“ ہرش نے کہا۔  
 ”لیس سر! اس شارٹ کٹ سے آدھا سے لگتا ہے۔“ گویند نے بتایا تو ہرش نے سر ہلایا اور تیزی سے گھڑی دیکھتے ہوئے اندر چلا گیا۔  
 جہنم ہرش کا صرف بزنس پارٹنری نہیں بلکہ اس کے بچپن کا دوست بھی تھا اور ہرش اپنی ہر بات، اپنا ہر معاملہ جہنم سے ڈسکس کرتا تھا۔  
 پچاس کروڑ کی ڈیل سائن کرنے کے بعد ہرش اور جہنم بہت خوش تھے اور فانیو اسٹار ہوئے تھے۔  
 کر رہے تھے۔ ہرش کو ایک دم کچھ یاد آیا تو وہ جہنم سے بولا۔

”جہنم یہ جو تیرے آفس کے پیچھے زمین ہے جہاں چھوٹے بڑے ہیں وہ کس کی ہے؟“  
 ”وہ خانہ بدوشوں کی ہستی؟ وہ زمین تو گیتاجی کی ہے۔“ جہنم نے عجیب سے سوپ کا سب لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہی کیڑے کوڑوں کی ہستی! مجھے اپنے راستے میں آنے والی اس جگہ سے صفایا چاہئے اور ویسے بھی وہ کافی کام کی زمین ہے اگر مجھے وہ مل جائے تو میں ان کیڑے کوڑوں کو صاف کر کے اپنے کام میں لے سکتا ہوں۔ کافی بڑی جگہ ہے ساتھ ہی میں اپنا نیا آفس وہیں بنواؤں گا تو میرا آفس تیرے بالکل قریب ہو جائے گا۔“ ہرش وردھن نے سوپ باؤل میں چچہ گھماتے ہوئے کہا۔

”ہوں! وچا تو اچھا ہے مگر یہ سب گیتاجی پر زہر کرتا ہے کہ وہ یہ زمین ہمیں دیں گے یا نہیں۔“ جہنم نے ٹشپن سے منصف کرتے ہوئے کہا۔  
 ”میں آج ہی گیتاجی سے بات کرتا ہوں۔“  
 ہرش نے کہا ساتھ ہی وٹیر آ گیا اور اپنی ٹائزر کے بعد لچ سرود کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

شیکھر گیتا بستر پر لیٹے ہوئے تھے اور ملازم ٹرائل میں ناشتہ لے کر آ رہا تھا، شیکھر گیتا سیدھے ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ان کا موبائل بجا تو انہوں نے اسکرین دیکھی تو اس پر ہرش وردھن لکھا ہوا آ رہا تھا۔  
 انہوں نے کال رد کر دی۔

”تمہارا گیتاجی.....“ ہرش کی چپکتی آواز آئی۔  
 ”تمہارا! کونسی آج کیسے یاد کیا.....؟“

”گیتاجی! مجھے آپ سے ضروری کام تھا، وہ مجھے آپ کی زمین چاہئے تھی، میرے من کو بھانگی ہے اور میں اسے خریدنا چاہتا ہوں، اسی لئے آپ کو فون کیا ہے۔“ ہرش نے سیدی اپنی منوں کا منا گیتاجی کو بتا دی۔  
 شیکھر گیتا کا شمار بھی ہرش کی طرح جانے مانے بزنس میٹروں میں ہوتا تھا کتنو وہ ہرش کی طرح کھنڈور دل اور مطلب پرست قطعی نہ تھے۔ بلکہ اس کے برعکس بڑے ہی دیالو تھے اور یہی کارکن تھا کہ ان کی کروڑوں کی زمین پر غریب اور خانہ بدوش رہ رہے تھے۔

”ارے ابھی ہرش تم کون سی زمین کی بات کر رہے ہو؟ اس شہر میں تو ہماری ان گنت زمینیں ہیں!“ گیتاجی نے ہنستے ہوئے کہا۔

”وہ جہنم کمار کا آفس تو آپ نے دیکھا ہی ہے ناں اس کے پیچھے والی زمین کی بات کر رہا ہوں میں۔“ ہرش نے بتایا۔

”اچھا! اچھا! اس زمین کی بات کر رہے ہو۔ پرنتو ہرش شاکرنا وہ زمین میں نے خود بھی کسی پروجیکٹ کے لئے نہیں لی کیونکہ اس پر غریب لوگ رہ رہے ہیں۔ بے چاروں کے پاس کوئی گھر نہیں تھا مجھے دیا آئی تو میں نے

سب کو ہاں رہنے کی ائموٹی دے دی اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہ زمین میں غریبوں کو ہی دان کر دوں گا پراہلم کی کپاسے میرے پاس بہت زمینیں ہیں اگر ایک کسی کے کام آ جائے تو اس سے بڑا پتہ کیا ہوگا۔“  
 گیتاجی کی بات پر ہرش یوں اچھلا جیسے بچھونے ڈنک مارا ہو، نفرت کی لہر سے جبر تک ہرش کے شریریش دوڑ گئی۔ پھر اس نے بات ختم کر کے فون بند کر دیا۔

”کہاں کھوئے کھوئے ہو ہرش؟“ جہنم نے ٹیبل بجا کر ہرش کو آواز دی جو کہ کافی دیر سے پیپر ویٹ گھما رہا تھا اور لگا ہی سا سنسنے فٹش اور نیم پریس جہنم کی آواز پر ہرش نے چوٹ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے دوبارہ پوچھا۔

”کن خیالوں میں گم ہے؟“ ہرش نے جہنم کی طرف دیکھا اور بولا۔

”یاد رہے گیتاجی کی زمین میں الٹا ہوا ہوں میں اب تک۔“ ہرش کی بات سن کر جہنم نے آرام سے کرسی سے ٹیک لگائی اور بولا۔

”نراش کیوں ہو رہا ہے؟ کوئی اور زمین دیکھ لے، زمینوں کی کی تھوڑی ہے۔“ ہرش نے کھوٹے ہوئے پیپر ویٹ کو ہاتھ رکھ کر روکا اور بولا۔

”مجھے زمینوں کی کی نہیں ہے جو چاہے لے لوں گا؟ بات یہ ہے کہ مجھے وہاں سے اس گنڈ کو صاف کرنا ہے کسی بھی قیمت پر، اور ویسے بھی ہرش وردھن کے من کو جو چیز بھا جائے، وہ کیوں اسی کی ہوتی ہے۔“ ہرش کے انداز میں غرور صاف جھلک رہا تھا۔

”مگر میرے ہر ہرش وردھن! مجھے شک ہے کہ اس مرتبہ تمہاری پھٹا، نراش میں نہ بدل جائے؟ کیونکہ میری گیتاجی کے پتر شکر سے بات ہوئی تھی، گیتاجی تین دن بعد انگلیڈ جا رہے ہیں اپنی ہارٹ سرجری کروانے اور وہاں وہ اپنی بیٹی کے پاس ہی رہیں گے اور واپسی چھ ماہ بعد ہوگی، اور اگر بھگوان کی اچھا سے گیتاجی پر لوک سدھار گئے تو پھر تمہاری تو چھٹی! اور اس سے بھی بڑی

سمیہ یہ کہ گیتاجی نے وہ زمین ان غریبوں کے نام کر دینی ہے۔“ جہنم نے جیڑ کو مودو کرتے ہوئے کہا۔  
 ”تو ہے تو بچپن سے میرے ساتھ، پرنتو مجھے تو ابھی تک جان نہیں پایا ہے، ہرش وردھن ہوں میں، تین دن تو بہت ہیں اس سے پہلے وہ زمین میری ہوگی، ہرش وردھن کی۔“ ہرش نے اٹھ کر جہنم کی مودو ہوتی جیڑ کو روکے ہوئے کہا تو جہنم بھی مسکرانے لگا۔

☆.....☆.....☆

”آؤ بیٹھو ہرش!“ گیتاجی نے ہرش سے کہا اور خود بیڈ پر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ”وہ شکر ہے پتا چلا کہ آپ سرجری کے لئے انگلیڈ جا رہے ہیں تو میں نے سوچا آپ سے ملاقات کر لوں۔“ ہرش نے ہناؤنی انداز سے کہا۔

”یہ تو تمہارا پریم ہے ہرش اور بتاؤ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟“ گیتاجی نے پریم سے کہا۔

”بھگوان کی کپاسے، ویسے گیتاجی آپ نے مجھے وہ زمین نہیں دی، میں بہت نراش ہوا تھا آپ کا جواب سن کے۔“ ہرش نے کہا۔

”ہرش میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ وہ زمین.....“ گیتاجی نے اپنی بات دہرائی۔

”آپ میری بات سمجھے نہیں گیتاجی، پہلے آپ میری بات تو سن لیجیے، مجھے ان غریبوں کو دیکھ کر خیال آیا کہ میں ان کے لئے کچھ کروں تو میں اس زمین پر ان کے لئے گھر اور آشرم بنانا چاہتا ہوں، ساتھ ان غریبوں کے سڑک پر پھرتے بچوں کے لئے انات آشرم جہاں وہ رہیں اور کھانہ کی سکیں اور چھوٹا موٹا کام بھی شروع کرواؤں گا تاکہ وہ اپنے پرپوار والوں کے لئے چار پیسے کمائیں۔ اسی کارن میں وہ زمین لینا چاہ رہا تھا۔“ ہرش نے چال چلتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے ہرش پہلے بتانا تھا ناں! ابھی یہ تو بہت بھنے کا کام ہے۔ ایسا کرو تم یہ زمین یوں ہی رکھو، میں کل جہنم زمین کے پیپر زبجواؤں گا۔“ گیتاجی نے خوشی سے کہا۔



”نہیں! گپتاجی میں یہ زمین آپ سے خریدوں گا۔“ ہرش نے کہا۔

”کیوں، کیا تم مجھے اس پنپے میں بھاگی دار نہیں بناؤ گے؟“ گپتاجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں گپتاجی؟ آپ جیسے دریادل اور دیالونش ہی کے کارن تو وہ دروہن اسنے سے اس زمین پر رہ رہے ہیں اسنے دروہن آپ نے پنپے ہی تو کمایا ہے، اب یہ موقع مجھے دے دیجیے۔“ ہرش نے کہا۔

”پرنتو ہرش.....“ گپتاجی نے کچھ کہنا چاہا مگر ہرش نے اٹھ کر ان کے دونوں ہاتھ تمام کر بیار سے بھیج لئے تو گپتاجی پر ہلانے لگے۔ ہرش دروہن نے گپتاجی کے گھر سے نکلنے ہی اپنے چہرے سے مکاری کا کھوٹا اتار چیک اس کے منہ پر خفاش رقصا تھی کس طرح اس نے چال چل کر گپتاجی کی دمکتی رگ پر ہاتھ رکھ کر ان کی بھاؤ ناؤ سے کھلوا کر کے زمین لے لی تھی اس نے کامیاب چال چلی تھی اس وقت بھی زمین خریدنے کے پیچھے اس کے ساتھ گاڑی میں تھے مگر اس وقت وہ کیول گپتاجی کو چال میں اتارنے آیا تھا پھر اس نے شام کو زمین خریدنے کے پیچھے اور بلیک چیک گپتاجی کو بھجوا دیئے۔

”یہ دیکھ رہا ہے جینن! کیا ہے یہ؟“ ہرش نے بلیک کلر کی فائل جینن کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے یہ؟“ جینن کو ابھی کچھ پتا نہیں تھا۔

”یہ میری جیت کا پروانہ ہے! گپتاجی کی زمین کے پیچھے جو کہ اب میری ہو چکی ہے۔“ ہرش نے چپکتے ہوئے کہا۔

”مان گئے! ہرش کہ تو کتنا ہشتی مان ہے۔“

جینن نے کہا۔ تو ہرش نے گردن اکڑا کر کہا۔

”ہشتی مان ہی نہیں بدھی مان بھی۔“ پھر دونوں زور سے ہنسنے لگے۔

اسنے میں ہرش کا موبائل بجا ہرش نے اسکرین دیکھی تو اس کا بزنس فرینڈ منیش تھا۔

”ہاں بولونش۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”یار ہرش ابھی ساچار نہیں ہیں! میں ابھی اپنی

وائف کے ساتھ اسپتال آیا تھا کہ میرے سامنے

شکر، گپتاجی کو میر جیسی میں یہاں لایا تھا، انہیں دل کا

دورہ پڑا تھا، ڈاکٹر ز نے انہیں بچانے کی بہت کوشش کی

پر تو ان کا دیہانت ہو گیا۔“

منیش کی بات سن کر ہرش کچھ منٹوں کے لئے

بت بن گیا پھر بولا۔ ”اوہ! تو بہت برا ہوا، بڑے ہی

دیالو ہرش تھے گپتاجی، مجھے تو شواہس ہی نہیں ہو رہا ہے

، ابھی دو گھنٹے پہلے ہی تو ان کا سیکرٹری مجھے پیپر دے

کر گیا تھا ان کی زمین میں نے خرید لی ہے ناں۔“ ہرش

نے جان بوجھ کر زمین خریدنے کا منیش کو بتایا تاکہ وہ

سب کو بتائے کہ اب وہ زمین ہرش کی ہے تاکہ کل کو کوئی

ارجن نہ آئے۔

”ہاں بھی کیا کر سکتے ہیں؟ یہ تو سنسار کا نیم ہے

کہ جو ختم لیتا ہے اسے مرتیو آتی ہی ہے۔“ منیش نے

کہا۔

”بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔“ ہرش نے

کہا اور فون بند کر دیا ہرش نے جینن کو بتایا تو وہ بولا۔

”ہرش بہت ہی بھاگی شالی ہے تو، اگر تھوڑا سا

بھی سے نصف ہوتا تو گئی تھی زمین تیرے ہاتھ

سے۔“ جینن کی بات پر ہرش ہنس کر بولا۔

”ہرش دروہن کا بھاگیہ، ہمیشہ دروہن ہی رہتا ہے

۔“ دونوں نے اس چیز کو بیزار میں جا کر سلیمہ بٹ کیا

اور ہرش دروہن نے پہلا پیگ سورگ باسی گپتاجی کے

نام کر کے شروعات کی اور پھر ان کی پارٹی بچ تک چلی۔

☆.....☆.....☆

کوشلیا کماری، اپنے پتر گوتم کی قتالی میں بھوجن

پروں رہی تھی کہ ایک دم اس کے کانوں میں

شور پڑا۔ ”ہے رام! یہ شور کیسا ہے؟“ انہوں نے چونک

کر کہا اسنے میں گوتم دھوتی سنبھالتا ہوا چوکی کے آگے

پاؤں مار کر بیٹھ گیا۔ کوشلیا کماری نے چوکی پر جل بھر گلش

رکھا اور قتالی لا کر رکھ دی جس میں ابلے چاول، کٹوری

میں دال اور ایک طرف ہری مرچ رکھی ہوئی تھیں۔

”گوتم یہ شور کیسا ہے؟“ انہوں نے پرسن کیا۔

”پتا نہیں ماں ٹھیک سے، پرنتو کوئی بات تو ادھیہ

ہے! میں منہ دھور ہاتھ تو کچھ دیکھتیوں کی آوازیں آرہی

تھیں، کتنو میں سن نہیں پایا۔“ گوتم نے دال چاول کا

نوالہ منہ میں رکھا اور ترنت بولا۔

”ماں! تمک تو ڈالا ہی نہیں تو نے۔“ کوشلیا

کماری ساڑھی سنبھالتی تمک کی برنی لائی اور تمک نکال

کر قتالی کے کونے میں رکھ دیا۔

شور ایک دم تیز ہونے لگا تو کوشلیا کماری نے

چھت انداز میں کہا۔ ”تو کھا! میں جرا دیکھ کر آتی ہوں

باہر آخر ہو کیا رہا ہے؟“ پھر وہ جھکی ہوئی ساڑھی سنبھالتی

اپنے لکڑی کے ٹوٹے دروازے سے نکلی اور باہر موجود

دونوں پٹیل دیوتاؤں کو شکر کیا، جن کے آگے سے وہ

روز صفائی کرتی، انہیں جل چڑھاتی اور ان کی دیکھ رکھ

کرتی پھر وہ آگے بڑھ گئی، کوشلیا کماری اک دروہن دودا

تھی اور اس بھرے سنسار میں اس کی کیول ایک سنان

تھی جو اس کے پاس تھی گوتم اس کا پتر، کوشلیا کا پتی ایک

راج مستزی تھا اور جیون بھر دو وقت کی روٹی کے لئے

بھاگ دوڑ کر کے اس سنسار سے چلا گیا اور اب اس کی

جگہ گوتم نے لے لی تھی۔ وہ تو بھلا ہو کوشلیا کے

سر کا جنہوں نے اپنی ذمہ داری نبھاتے ہوئے پر یوار

کے سر چھپانے کے واسطے سمجھتی میں یہ مکان چھوڑا تھا

ورنہ پتی کے دیہانت کے بعد کوشلیا کا جیون سڑکوں

پر بیتا۔

جب وہ باہر گئی تو وہاں پوری بستی موجود تھی وہ

بھی ان کی سمیاس کران سے اسی دشنے میں بات چیت

کرتے لگی۔

”مجھے تو یہ بات اوجت لگ رہی ہے کہ ہمیں

روپے لے لینے چاہئیں۔“ نرورلال نے کہا تو باقی بھی

ہاں میں گردن ہلانے لگے۔

کوشلیا کماری نے کہا۔ ”کتنو! تم لوگ جاؤ گے

کہاں؟ اسنے تم سے میں گھر کہاں ڈھونڈو گے؟ زمین

کہاں سے آئے گی؟“

”کوشلیا دیدی! بات تو تمہاری اوجت ہے پرنتو

ہمارے پاس اس سمجھیر تا کا کوئی دوسرا اپا ہے بھی تو نہیں

ہے! کیول یہ ہی راستہ ہے جس میں بتایا تو تھا کہ گپتاجی نے

جسے زمین چچی ہے اس مالک نے ہمیں روپے لے کر

چندرہ روز میں یہ جگہ خالی کرنے کا آدیش دیا ہے

۔“ نرورلال نے چھت ہو کر کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے، بھیا، پرنتو یہ زمین تو گپتاجی

نے بستی والوں کو دینے کا وجن دیا تھا، تم جا کر بات

کرو ناں شکر بڑا ہے۔“ کوشلیا کماری نے سمجھاؤ دیا۔

”بات تو تمہاری من کو لگ رہی ہے ہم آج ہی

شکر بڑا ہے بات کریں گے۔“ تلسی داس جلدی سے

بولا۔ پھر وہ سب ل کر گپتاجی کے گھر شکر سے ملنے گئے

اور انہیں ہرش دروہن کی چٹاؤنی کے بارے میں بتایا تو

شکر نے دہریے سے ان کی بات سنی اور بولا۔

”یہ بات تو میری جانکاری میں تھی کہ میرے

سورگ باسی پتاجی نے اسنے جیون میں ہی یہ فیصلہ

کر لیا تھا کہ یہ زمین وہ آپ لوگوں کو دے دیں گے پرنتو

! پھر ایسا کیا ہوا کہ انہوں نے اپنے فیصلے کے خلاف

زمین ہرش دروہن کے ہاتھوں بچ دی اس مسئلے میں

میری جانکاری بالکل بھی نہیں ہے ہاں میں ایسا

کر سکتا ہوں کہ ہرش دروہن سے بات کر کے یہ زمین

اس سے دوبارہ خرید کر آپ لوگوں کو دے دوں گا۔

بھگوان کی بڑی کرپا ہے ہمارے پر یوار پر ہمارے

روپوں کی کمی تھوڑی آئے گی اگر اس میں سے تھوڑا سا

دھن آپ لوگوں کے کام آجائے تو کیا برا ہے

؟“ سارے دروہن شکر کی ہلا میں لینے لگے اور شکر

گپتاجی کی آتما کی شانتی کے لئے پراعتنا کرنے لگے وہ

لوگ واپس چلے گئے۔

بہر حال ان کی سوچ کچھ ہی سے کی مہمان

ثابت ہوئی شکر نے ہرش دروہن سے بات کرنے کے

بعد ان لوگوں کو بتا دیا کہ ”ہرش دروہن نے صاف

انکار کر دیا ہے کہ وہ نہ تو یہ زمین بیچے گا اور نہ ہی اپنی دی

گئی چٹاؤنی سے پیچھے بٹے گا اتنا ہی نہیں اگر چند روز گزر گئے تو پھر زبردستی وہ جگہ خالی کر دے گا۔“ شکر کی بات سن کر ان لوگوں کی آس زرا شامیں بدل گئی۔

”ارے بھیا اتنی مہنگائی کے درمیں، اتنے تھوڑے روپوں میں تو کچھ نہ ہو پائے گا! میں کہاں جاؤں گا اپنے رپو اور کولے کر، اب تو میری کنیا بھی دودا ہو رہی ہے۔“ ہنسی داس نے سر پکڑ کر کہا۔

”ارے بھیا! کیوں چتا کرتے ہو، وہ جو پالن ہار ہے ناں وہ ضرور سہا پتیا کرے گا، تم دیکھنا۔“ کوشلیا بولی۔

”کا ہے چٹا نہ کریں؟ ہم تو کھلے آکاش تلے آگے ہیں ہاں تمہارے لئے تو چٹا کی کوئی بات نہیں ہے ناں کوشلیا بہن، تمہارا تو اپنا گھر ہے ناں اپنی زمین ہے ہر ش دروہن کی زمین کی سیسا سہا پت ہو جانے کے بعد تمہاری زمین ہے تو تمہارے لئے تو کوئی سیسا ہی نہیں ہے۔“ گھنٹھام نے تلک کر کہا۔

”کیسی باتیں کرتے ہو گھنٹھام بھیا؟ تمہاری اور میری سیسا سہا پتیا ہے مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا تمہیں ہے، ہم کل بڑے مندر میں جا کر پراختنا کریں گے۔ بھگوان جروہر سہا پتیا کرے گا۔“ کوشلیا کماری نے کہا تو سب لوگوں نے ایک ساتھ ہاں کی اور پھر اگلے روز وہ سب بڑے مندر گئے اور پجاری جی کے ساتھ مل کر پوجا کی۔

بھگوان نے ان کے سچ من سے کی پوجا پر پراختنا سو نیکاری اور تین دن بعد شکر نے انہیں بلاوا بھیجا وہ سب شکر کے پاس گئے تو اس نے کہا۔

”میرے پتانے اپنے جیون میں آپ کو یوں نہیں چھوڑا کہ بے یار و مددگار پھریں تو میں اپنے پتا کے اس کاریہ کو بے کاریہ ہونے دے سکتا ہوں؟ آپ سب ہر ش دروہن سے روپے لے کر وہ زمین خالی کر دیں میں اپنے نئے پردیجٹ کی زمین آپ لوگوں کو دے رہا ہوں آپ لوگ وہاں رہ لیں آپ کے گھر بھی میں بنوا دوں گا۔ روپے آپ لوگ اپنے

پاس رکھ لیجیے گا بس اپنی پراختناؤں میں میرے سو رنگ پاسی پتا جی کو یاد رکھیے گا۔“ سب خوشی سے ناچنے لگے گھنٹھام کوشلیا کماری سے ہاتھ جوڑ کر شامائی کہ اس روز میں نے بڑی ٹھوڑتا سے بات کی تھی۔“ کوشلیا کماری مسکرا کر بولی۔

”ارے چھوڑیے ناں گھنٹھام بھیا! اتھ بھلا تو سب بھلا۔“

کوشلیا کماری نے سو روپو کو گھنٹھام کا رکھیا، پٹیل دیو کو جل چڑھایا اور سارے میں آرتی کر کے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑی ہو گئی اس کے تین دور تک پٹیل دیو اپنی کو دیکھ کر تیر بہانے لگے۔ سارے بستی والے کب کے جا چکے تھے اس نے ساڑھی کے پلو سے تیر صاف کئے اور اندر چلی آئی گوتم اشان کر رہا تھا۔ کوشلیا کماری نے دروازہ بند کر کے رسوئی گھر کی اور قدم بڑھائے ہی تھے کہ پیچھے سے کسی نے دروازہ پیٹا دھڑا دھڑا! کو شلیا نے آرتی کی تھالی ایک طرف رکھی اور دروازہ کھولنے جاتے ہوئے بولی۔

”کون؟“ پھر دروازہ کھولا تو سامنے کچھ لوگ کھڑے تھے۔

”یہ مکان تمہارا ہے۔“ ان میں سے ایک نے پوچھا۔

”ہاں میرا ہے۔ پرنتو کیوں پوچھ رہے ہو یہ؟“ کوشلیا نے کہا۔

”اس گھر کو خالی کر دو۔“ اس آدمی نے کہا۔

”بدی بھرشت ہو گئی ہے کیا تمہاری؟ تمہارے باپ کا مکان ہے جو خالی کر دوں تمہارے کہنے پر۔“ کوشلیا کماری نے کہا۔

”یہ ہمارے صاحب کا حکم ہے!“ دوسرے بندے نے کہا۔

”تیرا مالک کیا بھگوان ہے جو اس کی آگیا کا پالن کر دے؟“ کوشلیا کماری نے غصے سے کہا۔

”تو ابھی جانتی نہیں ہے ہمارے مالک کو جب ہی اتنی اکڑ دکھا رہی ہے بڑھیا اس سے پہلے کہ تیری

شامت آئے سیدھی طرح سے یہ مکان خالی کر دے ابدلے میں دو گنی قیمت ملے گی۔“ انجی میں سے ایک اور نے کہا۔

”چلتے پھرتے نظر آؤ یہاں سے اور ہاں جا کر کہہ دینا اپنے مالک سے کہ کوشلیا کماری بھی اپنا مکان نہیں خالی کرے گی۔ یہ اس کی نہیں، میری زمین ہے۔“ کوشلیا کماری نے مضبوط لہجے میں کہا اور دروازہ بند کر لیا۔

☆.....☆.....☆

ہر ش دروہن کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ ”اس دو کوڑی کی بڑھیا کی اتنی مجال کہ ہر ش دروہن کو منع کرے! تجھے تو میں دیکھ لوں گا تیرا وہ کاٹھ کبار میرے شاندار پردیجٹ کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ہے جسے ملنا بہت ضروری ہے کرتا ہوں تیرا کچھ!“ ہر ش دروہن نے جیتر کو گھماتے ہوئے کہا تو جینن نے اسے شانت رہنے کا کہا اور بولا۔

”بڑھیا کو چھوڑ اس کے بیٹے کو چال میں پھانستے ہیں نیا خون ہے لالچ میں آئے گا آدھے آئے گا۔“ تو ہر ش منہ بناتے لگا۔

پھر جینن نے گوتم کو بلوایا اور اس سے کہا۔ ”دیکھو! تمہاری ماما تو ہو گئی ہیں بوڑھی اور اپنا پورا جیون جی چکی ہیں پر تمہیں تو ابھی جیون شروع کرنا ہے اپنا رپو اور بنانا ہے کیا سارا جیون راج مستری ہی رہو گے اپنا مستقبل بنناؤ۔“

پرنتو گوتم نے صاف انکا کر دیا یہ کہہ کر ”یہ مکان اس کے پتا کی نشانی ہے اور ہم یہ مکان بھی نہیں چھوڑیں گے۔“ جینن نے اس کا جواب سن کر اسے آفریدی کہ ”مکان ان سے تین گنا پر قیمت خریدیں گے، نیا اچھا مکان بنوادیں گے اور گوتم کو کہیں اچھی جگہ پر کام دلوائیں گے۔“

گوتم اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”مجھے سے دیجیے میں اپنی ماما سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔“ گوتم نے ساری کٹھا جا کر کوشلیا کماری کو سنائی

تو اس نے کہا کہ ”وہ اپنا ترن لے چکی ہے اور اپنی اہم سانس تک اس پر قائم رہے گی۔“

گوتم نے جینن کو اپنی ماما کی اور سے اتر دے دیا جو اس نے ہر ش تک پہنچا دیا ہر ش کے اندر ایک گئی جل اٹھی جو اس کے دماغ کو کھولا رہی تھی وہ جنہیں ہر ش دروہن دھرتی پر بیٹھنے والے کیڑے گردان رہا تھا انجی کیڑے کوڑوں نے اس کے سوال پر اسے اپنے دو دروازے دیکھا دیا تھا۔ ہر ش نے کال ملائی اور آرڈر دیا کہ ”کل کام شروع کرو تو سورج نکلنے ہی شروع کرنا۔“ اور فون کاٹ دیا۔

سورج نکل آیا گوتم اور کوشلیا ابھی سو رہے تھے آج کوشلیا کماری کی آنکھ ابھی تک کھلی نہیں تھی ایک دم گڑگڑاہٹ کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا جس سے کوشلیا کماری اچھل پڑی اس نے آنکھ کھولی تو اسے کچھ بھی نہ دکھائی دیا اللہ اس کی آنکھوں میں شدید جلن ہونے لگی اور اس کا سانس کھٹنے لگا پھر اسے زوردار کھانسی آئی جو رکنے کا نام نہ لے رہی تھی کافی دیر گزرنے کے بعد وہ آنکھیں کھولنے کے قابل ہوئی تو ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا دھول مٹی اڑ رہی تھی کوشلیا نے گوتم کو آواز دی ممراس کی آواز باہر ہوئی گڑگڑاہٹ میں دب گئی کوشلیا کماری نے ہمت جمع کی اور ٹوٹتی ہوئی اٹھی اس نے آنکھیں مل کر چاروں اور دیکھا تو اسے نظر آیا کہ اس کے گھر کی ایک طرف کی دیوار گر گئی تھی پھر اسے اس دیوار کے بلے تلے گوتم کی دھوتی نظر آئی اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”گوتم!.....!“ وہ گرتی پڑتی وہاں پہنچی اور اسے پتھر مٹا کر نکالنے کی کوشش کرنے لگی۔

مگر پتھر اتنے بڑے تھے کہ اس بڑھیا سے مل بھی نہ پارے تھے وہ چیخ چیخ کر گوتم کو پکار رہی تھی پھر وہ باہر آئی اس کے گھر کے سامنے ایک بہت بڑی مشین کھڑی تھی، دیواریں گر رہی تھیں، کوشلیا نے چیخ کر اس مشین چلانے والے کو آواز دیں دیں گھنٹھام کے شور میں وہ سن ہی نہیں رہا تھا کوشلیا روتے ہوئے

سر پر کڑکھرتی پریشانی پھر اس نے نیچے پڑے پتھروں میں سے ایک بڑا پتھر اٹھا کر مشین کے شیشے پر مارا تو اس میں بیضا شخص چمک کر اس طرف دیکھنے لگا کوشلیا رورو کر ہاتھ ہلاتی تھی اسے دیکھ کر اس شخص نے مشین بند کیا اور اتر کر نیچے آ گیا اسے دیکھ کر کوشلیا پاگلوں کی طرح چیخی۔ ”ارے اوہ آنکھوں کے اندھے یہ اتنا بڑا مکان تجھے نظر نہیں آیا جو تو اسے توڑ رہا ہے؟“  
تو وہ شخص بولا۔ ”شما کرنا! ماتاجی! مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ مکان نہیں گراتا ہے۔“

کوشلیا روئے جاری تھی۔ ”ناس پیٹے مکان پر نہیں تو نے میرے کلیجے پر یہ مشین چلائی ہے میرے کلیجے کا کھرا اس بلے تلے دبا ہوا ہے نکال اسے چل جلدی۔“ کوشلیا پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔  
”ہے رام! یہ تو کھوپڑی ہو گیا مجھ سے! ماتاجی اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہے مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ خالی ہستی گرائی ہے کتو مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس مکان میں جیوت لوگ رستے ہیں، یہ تو اترتھ ہو گیا رام! رام!“  
اور پھر ہماگ کر اور لوگوں کو بلایا کر لے آیا اور پھر ان سب نے مل کر گوتم کو بلے سے نکالا گوتم بری طرح سے گھائل تھا اس کی سانسیں چل رہی تھیں اسے اسپتال لے جایا گیا مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی آتما نے اس کا جسم چھوڑ دیا۔

کوشلیا کماری کو جب یہ سنا جا رہا تھا کہ گوتم جیوت نہیں ہے تو وہ اپنا مانسک سنوٹن کھینچ کر اور سڑکوں پر دوڑ پڑی۔ اس کے پرانے بستی والوں نے اسے ”پاگل خانے“ میں بھرتی کر دیا۔

ہرش وردھن نے لوہا گرم دیکھ کر اس پر چوٹ ماری اور سرکار سے کوشلیا کا گھر دو گنی قیمت پر خرید کر روپے اس کے نام سے بینک میں کھانا کھول کر جمع کرادیئے اور خود اپنے ذمہ اس کے علاج کا خرچہ لے لیا اور سارے سانج کی نظروں میں ماہان بن گیا۔

کتو! ہرش وردھن کے منہ پر چڑھے مھوٹے کے پیچھے موجود ہمایا تک چہرے کو کوئی بھی نہیں دیکھ

پارہا تھا۔ ان زردھنوں سے نفرت رکھنے والے ہرش وردھن نے کیول اپنی انا اور غرور کے کارن جان بوجھ کر کوشلیا کا مکان تروایا تھا جس میں اس کے بیٹے کی مرتبہ ہو گئی تھی اور خود کوشلیا اپنا مانسک سنوٹن کھینچ کر ہرش کی یہ چال کسی کے علم میں نہ تھی اس نے جان بوجھ کر ریسکیو والوں کو اس بات سے انجان رکھا کہ یہ مکان اس کی زمین کا حصہ نہیں ہے اور یوں ہرش کی راہ کے سارے کاٹنے صاف ہو گئے اور زمین اس کے ہاتھ آ گئی۔

☆.....☆.....☆

ہرش آج سائٹ پر کام دیکھنے آیا تھا سارے مکان گرا کر زمین صاف کی جا چکی تھی تمام لمبا ٹھ چکا تھا اب وہاں پینٹیل میدان تھا سوائے پینٹیل کے درختوں کے ہرش کی نگاہ ان پر پڑی تو اس کا منہ بن گیا اس نے مزدوروں کو بلایا سارے مزدور شرامک، کچھ دھاراک و چاروں کے تھے انہوں نے جان کر درختوں کو نہیں کاٹا تھا۔

ہرش بولا۔ ”ان کو کیا میرے سوا گت کے لئے کھڑا چھوڑ رکھا ہے؟ گراؤ انہیں اسی وقت۔“ اس کی بات سن کر مزدور بولے۔

”صاحب جی! اور شول پرانے درخت ہیں ان کو یوں نہیں کاٹنے پوچھا کرنی پڑتی ہے پہلے۔“ ان کا کہنا تھا کہ ہرش زور سے دھاڑا۔

”واٹ نان سنس! سے نفٹ کرنے کے بجائے ترت انہیں گراؤ میرے سامنے ابھی اسی سے۔“

اس کا کہنا تھا کہ سارے مزدور مشین کی طرح حرکت میں آ گئے اور اپنے اوزار سنبھالنے لگے اتنے میں ہرش کی فون پر ایک کال آئی تو وہ آگے بڑھ کر اینڈ کرنے لگا اس کے آگے جاتے ہی ان مزدوروں نے اپنے گلے میں پڑی ملاؤں کو کھانا اور آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا پھر بولے۔

”اپنی سورت کھسا تو کر لی اس کا بھگوان جانے۔“ ان کا اشارہ ہرش کی اور تھا ہرش بات کر کے

واپس آ رہا تھا تمام مزدور نے مل کر دونوں درخت اکھاڑ دیئے۔

”تم سب ابھی اسی سے یہاں سے دفع ہو جاؤ اور جا کر کسی مندر میں پوجا پاٹ کرو۔“ ہرش نے ان سے کہا۔

”شما کرنا صاحب..... وہ.....“ انہوں نے کہنا چاہا مگر ہرش نے ان کی بات سچ میں کاٹ دی اور چلا کر کہا۔

”جسٹ گیٹ لوسٹ۔“ اور وہاں سے چلا گیا۔  
ہشمن نے اور مزدوروں کا انتظام کر دیا اور ہرش کو قصہ نہ کرنے کا کہا۔

کنسٹرکشن شروع ہوئی تو سب سے پہلے ہرش کے عارضی آفس کے لئے روم بنایا جانے لگا بعد میں وہ اپنا آفس ٹاپ فلور پر شفٹ کرنے والا تھا رات کام ختم کر کے مزدور گھر چلے گئے تھے۔

اگلی صبح جب وہ سب واپس سائٹ پر پہنچے تو حیران رہ گئے وہ سب اس انجینے میں تھے؟ باؤڈری وال کے باہر کچھ جیسا کالا سیال گھنٹوں تک کھڑا تھا جبکہ مین گیٹ پر تالا پڑا تھا کسی منش کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا ہشمن کو انعام کیا گیا تو اس نے تالا توڑ دینے کا کہا کچھ مزدور تالا توڑ کر اندر گئے تو وہ کر تک کچھ فرمایاں میں دھنس گئے۔

آخر یہ سب ایک رات میں آ کہاں سے گیا؟ کل تک تو کچھ بھی نہ تھا! یہ ایک ایسا سوال تھا جو سب ایک دوسرے سے کر رہے تھے۔ ہشمن بھی پہنچ گیا پر تو کارکنان کسی کے بھی سمجھ نہ آیا۔

پھر مشینری کے ذریعے سارا سیال صاف کر دیا گیا مشین چل رہی تھی کہ ایک دم انگ مٹی مزدور گلے اور مشین چیک کی جو چیز انگ رہی تھی اسے صاف کیا گیا تو سب کو سانس سگھ گیا وہ داؤچ مین کی لاش تھی۔

ہرش کے علم میں سارا ماجرا آیا تو اس نے بجائے ہشمت ہونے کے ہشمن کو زور دیا کہ ”معاملہ پیسے دے کر دفع کرو اور ہاں کام کسی بھی طرح رکنا نہیں

چاہئے۔“  
اند کے سارے کام آل موسٹ کمپلیٹ ہو چکے ہیں میں ابھی یہیں ہوں تو بھی دیکھ لے۔“ ہشمن نے ہرش سے کہا۔

”ٹھیک ہے میٹنگ ختم کرنے کے بعد آ جائیں گے۔“ ہرش نے ہشمن سے بروگرام ملے کیا تو ہشمن وہاں سے نکل گیا ہشمن اور ہرش کی میٹنگ ختم ہوئی تو بارہ بیٹے والے تھے وہ لوگ نئے آفس پہنچ گئے انہوں نے جیسے ہی آفس کا دروازہ کھولا تو وہ ٹھٹھک گئے کمرے کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا کمرے کے بچوں سچ جہاں ہرش کی چیئر اور ٹیبل رکھی تھی اس ٹیبل کے نیچے سے ایک موٹی درخت کی شاخ زمین پھاڑ کر ٹیبل کی رخ کے دو ٹکڑے کرتی ہوئی نکل کر کمرے میں پھینچی ہوئی تھی۔

دونوں ہونٹوں کی طرح منہ پھاڑے کھڑے تھے ہشمن کا تو یہ عالم تھا کہ کاتو تو بھونٹیں کیونکہ آج دوپہر کو تو اس نے اسی آفس میں کھڑے ہو کر ہرش سے بات کی تھی۔

”شٹ! ہرش نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا معاملہ ہے؟“ ہشمن نے اپنے آپ سے کہا ہرش نے چیخ کر چوکیدار کو بلوایا۔ اس کے لئے بھی یہ سب حیران کن تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ ہرش نے غصے سے کہا۔  
”سردہ.....“ چوکیدار حیرت اور خوف کی ملی جلی استعجلی میں تھا اس کے منہ سے لفظ نہیں نکل پا رہے تھے۔

”ہوسکتا ہے سرکہ جو درخت کاٹے گئے تھے ان کی جڑیں زمین کے اندر رہ گئی ہوں اور اب باہر نکل آئی ہوں۔“ اس نے کہا۔

”شٹ پوراؤ تھ یو ایڈیٹ!“

”درخت کی جڑ ہے یا آتش فشاں جو دھرتی چیر دے اور باہر نکل آئے تم سب ہو ہی نکلے بلاؤ مزدوروں کو اور اسے اکھاڑ پھینکو۔“ ہرش نے اسے جھاڑا



ہاں ہاں ایاد ہے، پہلے اس جھنجھٹ سے تو نکل  
اؤں پہلی منزل کرنے کے، یار جہین اس پر دیکھت میں  
تو نقصان پہ نقصان ہو رہا ہے اور اسی کارن میں دوسرے  
پر دیکھتیں پر بھی دھیان نہیں دے پارہا ہوں..... روز  
ایک ناگتا شہ ہوتا ہے۔  
جہین نے اس کی بات سن کر اسے تسلی دی اور  
کہا۔ ”اچھا چل چھوڑا فکر مند نہ ہو، ابھی تو میٹنگ  
پر دھیان دے۔“ پھر دونوں نے میٹنگ اینڈ کی اور  
پھر ایک کیفے میں بیٹھ کر کافی پی کر کپ شپ کرنے  
لگے۔

”اب تھوڑا ریلیکس فیمل کر رہا ہوں۔“ ہر ش نے  
کہا اور ساتھ ہی دونوں کے موبائل بجے۔  
دونوں نے کال اینڈ کی اور دونوں کو سانپ  
سنگھ گیا۔ پروجیکٹ میں کنسٹرکشن کے دوران ڈرل  
مشین چلاتے ہوئے شارٹ سرکٹ ہو گیا تھا در بھاگہ  
کہ وہاں پانی بھی پڑا ہوا تھا کرنٹ پھیلنے سے کئی  
مزدوروں کی مرتو ہو گئی دونوں فوراً وہاں پہنچے وہاں ان  
کی سوچ سے بھی کہیں زیادہ نقصان ہوا تھا دس مزدور  
مر گئے تھے اور انکی ڈیڈ باڈیز کی حالت بہت خراب  
ہو چکی تھی ان کے شریردیکھنے کے لائق بھی نہ رہے تھے۔  
ہر ش انہاں سر پکڑ کر بیٹھ گیا جہین تو کسی اور ہی سوچ  
میں ڈوبا ہوا تھا گاڑی میں دونوں چپ تھے پھر اس  
خاموشی کو جہین نے توڑا۔ ”ہر ش میری ایک بات مانے  
گا؟“

ہر ش نے جواب میں صرف ”ہوں.....“ کہا۔  
جہین بولا۔ ”یہاں ہودن کر والے، میں تو کام  
شروع کروانے سے پہلے کہتا مگر تیرا موڈ دیکھ کر میں نے  
کہا نہیں۔“  
اس کی بات سن کر ہر ش اور بھڑ گیا اور بولا۔ ”اس  
سے میرا نقصان پورا ہو جائے گا؟“  
تو جہین بولا۔ ”نہیں! یہ تو نہیں ہو سکتا پرنتو آگے  
کا نقصان شاید رک جائے؟“  
تو ہر ش نے لمبی سانس لی اور بولا۔ ”اچھا تو پھر

جو تجھے اچھا لگے وہ کر، میں تو پک گیا ہوں۔“  
جہین نے کہا۔ ”تیرا اس ہودن میں  
ہونا ضروری ہے۔“ تو ہر ش نے اسے گھورا۔  
”اوہ ایلیز جہین مجھے مت گھٹیا ناں سب میں،  
میرا دماغ تو پہلے ہی خراب ہو چکا ہے، میرا تو دم گھٹتا ہے  
ان سب چیزوں سے۔“ ہر ش نے جہین کے آگے ہاتھ  
جوڑ کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔  
”اچھا آخر میں تھوڑے سے کے لئے آ جانا۔“  
جہین نے پھر اسے فورس کیا۔  
”تیرے کہنے پر ہودن کر رہا ہوں یہ کافی  
نہیں ہے بس اس سے زیادہ کی آشا تو مجھ سے مت  
کرنا۔“ ہر ش نے بات ختم کر دی تو جہین بھی خاموش  
ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

پنڈت جی ہودن کرتے ہوئے بار بار چونک  
رہے تھے ہودن ختم ہوا تو وہ ترنت اٹھ گئے اور مالا جیتے  
ہوئے آگے بڑھنے لگے پھر وہ کافی آگے تک گئے  
اور رک کر واپس آ گئے جہین ان کی حرکت پر فکر مند  
ہو رہا تھا اس نے پنڈت جی سے پوچھ لیا۔  
”پنڈت جی! کس پریشانی میں ہیں آپ؟“  
پنڈت جی نے اس کی بات پر رک کر کہا۔ ”کچھ  
تو ہے جو بدھی میں نہیں سارہا ہے پرنتو ایسا کچھ ہوا ہے  
جو سامنے نہیں ہے کوئی شکتی، کوئی راز تو ضرور ہے۔“  
جہین نہ سمجھنے والے انداز میں پنڈت جی  
کو دیکھنے لگا پھر پھر بولا۔ ”کیسا راز؟“  
پنڈت جی بولے۔ ”پتا نہیں میں ابھی کچھ نہیں  
بتا سکتا کتو! کچھ تو ضرور ہے اور وہ بھی شکتی  
شالی! اور وہاں سے چلے گئے۔“

جہین نے پریشان کن انداز میں ہر ش کو جا کر  
سب بتایا تو وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”یہ سب گرہیں لوگوں  
کو بھانسنے کے ہیں؟ تجھے پتا نہیں ہے انہیں دکھنا چاہئے  
ہوئی ہے اس لئے لوگوں کو ایسی باتوں میں الجھاتے  
ہیں۔“

جہین بولا۔ ”ہر ش! میں پنڈت جی کو جانتا ہوں  
وہ ایسے نہیں.....“ مگر ہر ش نے اس کی ادھوری بات  
میں ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا  
تو وہ چپ ہو گیا۔  
ہر ش نے سارے معاملات رفع دفع کر کے  
دوبارہ سے کام شروع کر دیا ہر ش اس طرف سے کافی  
فکرمند تھا اس لئے تمام مزدوروں سے بار بار دھیان  
رکھنے کا کہہ رہا تھا چار دن شامی سے گزر گئے پر پانچویں  
روز ہر ش کا سکون پھر غارت ہو گیا۔

صبح جب مزدور سائٹ پر پہنچے تو ایک اور تماشا  
ان سب کے سواگت کے لئے موجود تھا کام کے لئے  
آئی ہوئی سینکڑوں اینٹیں چورے کا ڈھیر بنی ہوئی تھیں  
سینٹ کی تمام بوریاں بچی ہوئی تھیں اور ساری سینٹ  
ڈھین پر بکھری ہوئی تھی جو جگہ جگہ سے کالی ہو رہی تھی  
جیسے پھپھڑس کر دیا گیا ہو اور سریوں کے ڈھیر، چورے  
کے پھاڑے ہوئے تھے جیسے کسی کرشک مشین میں ڈالا  
گیا ہو کیونکہ لمبے لمبے سریوں کے ڈھیر کو چورے میں  
بدلنا کسی انسان کے بس کی بات نہ تھی وہ بھی رات  
بھر میں۔

سارے مزدوروں نے کام کرنے سے  
انکار کر دیا اور بھاگ گئے ہر ش نے یہ سا چار سن کر اپنا  
سر پیٹ لیا اس کی کنپٹیاں ایک دم سنگھٹ گئیں اور اس کا لبی  
پلی ہائی ہو گیا۔

جہین اس کے ساتھ تھا ڈاکٹر نے اسے ریلیکس  
کرنے کا کہا۔  
”کیسے ریلیکس کروں؟“ ہر ش نے دعاؤ کر  
کہا۔

”مسٹر ہر ش! ایلیز ریلیکس، اس وقت یہ آپ  
کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر نے  
دارن کیا۔

تو جہین نے ہر ش کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ”ہر ش  
میرے یار اچھے پتا ہے کہ تیری چتا بالکل درست ہے  
پرنتو اس سے چتا کو دماغ سے بالکل نکال دے یہ کوئی

بڑا حس حریف ہے جو کام میں رکاوٹ ڈال رہا ہے اسے  
ہم کھوج لیں گے ادا کے۔“ جہین نے تسلی دی تو ہر ش نے  
آنکھیں بند کر لیں۔

”کل تو بار بیشر جا رہا ہے! میں تیرے لئے سیٹ  
کنفرم کرادوں گا دو چار دن گزارو وہاں، پھر واپس  
آ کر سب دیکھیں گے۔“ جہین نے کہا تو ہر ش نے گردن  
ہلا کر اس کی بات مان لی، ہر ش ایک ہفتہ مارے شرمیں  
گزار کر آیا تو بالکل ریلیکس تھا اس سچ پر دیکھت کا کام  
بھی رکا رہا تھا۔

ہر ش شام کی فلائٹ سے واپس آیا تھا اور سفر کی  
تھکان دور کرنے کے لئے وہ ہاتھ شپ میں لیٹا ہوا تھا  
دھیما میوزک آن تھا ہر ش کے سر ہانے جہین کی بوتل  
رکھی ہوئی تھی اور پھر اہوا گلاس ہاتھ میں تھا ہر ش اپنی  
آنکھیں بند کئے گلاس میں موجود آکس کیو بڑگما رہا تھا  
یہ اس کے ریلیکس کرنے کے طریقوں میں سے ایک  
تھا۔ ہر ش نے آنکھیں بند کئے گلاس میں سے سب لیا  
ابھی وہ اس کے حلق سے نیچے اترا بھی نہیں تھا کہ ہر ش  
کو اپنے بائیں پیر میں سنساٹ محسوس ہوئی تو اس نے  
پیر ہلایا اور اسے اگنور کر دیا اور پھر دوبارہ سب لیا  
پھر تھوڑی دیر بعد وہ سنساٹ تکلیف میں بدل گئی، ہر ش  
نے پیر اوپر کیا اور اس پر سے جھماک ہٹائے تو وہ دھک  
سے رہ گیا ہر ش کے پیر پر موجود سوراخ تھوڑے بڑے  
ہو گئے تھے اور پیر پرسوں کا جال گھٹنے سے اوپر کھینچ گیا تھا  
اور ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا ہر ش کو ان سے بہت خوف  
آیا۔

پروجیکٹ میں ہونے والے نقصان کے  
چکر میں ہر ش نے اس طرف بالکل دھیان نہیں دیا تھا  
، ہر ش اچھے میں تھا کہ کیا کرے اور پھر اس کے دیکھتے  
ہی دیکھتے گھٹنے کے اوپر موجود سوں نے واپس نیچے کی  
طرف آنا شروع کر دیا اوپر سے غائب ہوتی جاری تھیں  
اور نیچے کی اور بڑھتی جاری تھیں اور پھیلنے پھیلنے پیر کے  
ناخنوں تک آ کر رک گئیں اور ناخن سیاہ ہو گئے ہر ش  
کو اپنے پیر کے ناخنوں میں گئی کی پٹیں اٹھتی محسوس

ہونے لگیں پھر ان کی شدت بڑھتی گئی اتنی کہ ہر ش کی برداشت کی سیما کو پار کر گئی ہر ش کی چیخ نکل گئی پھر ان ناخنوں سے سیاہ دھواں نکلنے لگا۔

پھر دھواں آہستہ آہستہ گاڑھا ہوا ہاتھ اور پھر اس دھواں نے جمع ہونا شروع کر دیا اور ایک وجود کی شکل اختیار کرنے لگا ہر ش اپنی جگہ سے ہورکھ گیا جب اس دھواں نے پوری شکل اختیار کر لی تو ہر ش کا خون اس کی رگوں میں بہنے لگا۔ وہ وہی درخت تھا جس کا چہرہ سیاہ عورت کا تھا اور سر پر سینگ نما ٹہنیاں نکلی ہوئی تھیں اس کی آنکھیں بند تھیں ہر ش نے دھواں نہ آنے پر اپنی آنکھیں ملیں کتھوہ درخت نما عورت یا عورت نما درخت وہیں موجود تھے پھر اس عورت نے اپنی بند آنکھیں کھولیں وہی خالی گڑھے جن میں پتلیوں کی جگہ انکی جل رہی تھی اور گاڑھا خون بہہ رہا تھا شعلے اگل رہے تھے۔

ایک دم اس عورت نے سیاہ دھواں میں لپٹے اپنے ہاتھ آگے کئے جنہوں نے سٹ کر درخت کی شاخوں کا روپ دھارن کر لیا اور آگے بڑھ کر ہر ش کے سر میں موجود سوراخوں میں گھسنا شروع کر دیا اس کا ایسا کرنا تھا کہ ہر ش کو لگا کہ اس نے ننگے تار کو چھو لیا ہوا ہے جھٹکے لگنا شروع ہو گئے اس کے سر میں کھال کے نیچے نگوں کی جگہ درخت کی پڑیں پھیلنے لگیں اور پھیلتے پھیلتے ہر ش کے سینے تک پہنچ گئیں ہر ش کے منہ سے فلک ڈکاف چھین نکلے لگیں اور وہ سینہ پکڑ کر تکلیف سے بے ہوش ہو گیا۔

ہر ش کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو اجنبی جگہ پایا اسے یاد آیا وہ تو ہاتھ ٹب میں تھا دروازہ کھلا اور ہتھین اندر آیا۔

”میں کہاں ہوں؟“ ہر ش نے پوچھا۔  
”شش شش.....“ ہتھین نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا کہا۔

”مت بول ہر ش تجھے سخت ہارٹ ایک ہوا ہے“ ہتھین کی بات پر ہر ش اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”ہارٹ ایک؟“ مجھے تو کبھی کوئی ہارٹ پر اہم نہیں رہی۔“ اس نے کہا۔

”یہی تو میں تجھ سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا؟ ہر ش جو تجھے ہارٹ ایک ہو گیا۔“ ہتھین کے بلونے پر ہر ش کی آنکھوں کے آگے وہی منظر محسوس گیا اور اس نے خوف سے جھرجھری لے کر آنکھیں بند کر لیں۔

”مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔“ ہر ش نے جھوٹ بولا۔

”اوکے! اوکے رلیکس! تو کچھ مت یاد کر، بس آرام کر.....“ ہتھین نے جلدی سے کہا۔

”ہتھین! میرے سر میں درد ہے اذرا میرا الٹا سر تو دیکھنا۔“ ہر ش نے کہا تو ہتھین نے اٹھ کر اس کا سر دیکھا۔

”یاروہ جو چوٹ لگی تھی تیرے اس کی نیس سرخ ہو رہی ہیں۔“ ہتھین نے بتایا تو ہر ش نے سکون کا سانس لیا اور دل ہی دل میں اطمینان سے سوچا۔  
”یہ بھی میرا خواب ہی تھا، میں بلا وجہ چننا کر رہا ہوں۔“

اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر مہتا اندر آ گئے وہ ہر ش کے کلوڈ فرینڈ ہونے کے ساتھ دیش کے جانے مانے ہارٹ سر جن بھی تھے۔

”ہیلو ہر ش! اب کیا حال ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”اوکے.....“ ہر ش نے مختصر جواب دیا۔

”یار مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہر ش دردمن اتنا کمزور دل کا مالک ہے کہ اتنی سی بات پر دل پکڑ لے گا۔“ ڈاکٹر مہتا نے ہر ش کو چھیڑا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔“ ہر ش نے کہا۔

”ہر ش! یہ تو تھی مذاق کی بات اور سیریس بات یہ ہے کہ تجھے سخت ہارٹ ایک ہوا ہے اور جہاں تک میرا میکسپریٹس ہے مسئلہ تیرے بائیں سر کی رگوں کا

ہے جو دل تک جاری ہیں اگر پر اہم زیادہ ہوئی تو سر جری کرنی پڑ سکتی ہے ابھی یہ صرف میرا خیال ہے ہو سکتا ہے یہ خیال غلط ہو ابھی کوئی بات تھی نہیں ہے ہم پہلے اس سے ریلیٹیو کچھ ٹیسٹ کر لیں پھر فائنل بات کر لیں گے ابھی تو سب بھولی کر تو صرف ریسٹ کر۔“ ڈاکٹر مہتا نے کہا اور دم سے چلے گئے۔

ہتھین ڈاکٹر کی بات سے چشت ہو گیا اور بولا۔  
”ہر ش یار! میں جانتا ہوں کہ تو میری باتوں کو نظر انداز کر دے گا کتھوہ میرے کہنے سے ایک بار کیول ایک بار مجھے اس معاملے میں کسی شکی شالی تاثر ترک سے بات کرنے دے؟“

ہر ش خاموش رہا دراصل وہ ہتھین کی بات سن ہی نہیں رہا تھا اس کے دماغ میں تو وہ خواب والا درخت چل رہا تھا جس کا چہرہ سیاہ عورت کا تھا جس نے پہلی بار ہر ش کا سر پکڑا تھا تکلیف ہر ش کو جی شروع ہوئی تھی ورنہ اس سے پہلے تو اس کا سر بالکل ٹھیک تھا۔

”بول ہر ش! پھر کیا کہتا ہے۔“ ہتھین کی آواز پر ہر ش سوچ سے باہر آ گیا۔

”کیا کہا.....؟“ تو ہتھین نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”رہنے دے تو، میں خود کر لوں گا۔“ اس نے ہر ش سے کہا تو ہر ش پھر سوچنے لگا۔

☆.....☆.....☆

”مجھے پنڈت جی نے بھیجا ہے آپ نے میری مدد کرنی ہے۔“ اس شخص نے ہتھین سے کہا۔ جس کے چہرے کو ہتھین غور سے دیکھ رہا تھا ادھنگا تھا گیروے رنگ کی دھوئی باندھی ہوئی تھی، ہاتھوں اور گلے میں دھاگے باندھے ہوئے تھے۔

”میرا نام ہتھین ہے؟ اور آپ کا شہ

نام؟“ ہتھین نے پوچھا۔

”شیوا!“ اس شخص نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بنا دیکھے آہستہ آہستہ گے بڑھنے لگا پھر وہ ہر ش کے آفس کی جگہ آ کر رک گیا۔ ہتھین نے کچھ گھٹایا پھر کچھ سوچ کر رک گیا وہ شخص وہیں رک رہا

اور پھر کافی سے گزرنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔

”ایک کالا بکرا منگواؤ۔“ اس نے کہا تو ہتھین اسے دیکھنے لگا پھر بولا۔  
”آج؟“

تو وہ شخص بولا۔ ”ابھی ترنت۔“ تو ہتھین نے

موبائل نکالا اور اپنے بندے کو بکرا لانے کو کہا۔ ہتھین کا بندہ ٹھوڑے ہی سے میں کالا بکرا لے آیا..... اس شخص نے اپنے کاندھے پر لنگی جھولی میں سے مٹی نکالی اور اسے بکرے کے سر پر لگا دیا پھر دوبارہ اپنے ہونٹوں کو حرکت دینے لگا اس کا ہاتھ جھولی میں گیا اور اس میں سے ایک کھوٹا نکالا پھر اس پر پھونک ماری اور چاروں طرف کمرے میں گھومنے لگا پھر ایک کونے میں رک کر اس کھوٹے کو گاڑ دیا اور اس سیاہ بکرے کو اس کھوٹے سے باندھ دیا پھر جھولی میں سے سیندر نکال کر اس کھوٹے اور بکرے کے سر پر لگا دیا اور ہتھین کو وہاں سے چلنے کا اشارہ کیا اور آفس سے نکل کے باہر آ کر بولا۔

”آج کی رات بیت جائے تو کل سورج کے نکلنے کے بعد یہاں آنا اور جو کینا وہ مجھے بتانا کہ یہاں کیا نظر آیا ہے؟“ اور پھر وہاں سے چلا گیا ہتھین بھی وہاں سے چلا گیا۔

اگلے روز سورج نکلنے ہی ہتھین جلدی سے گاڑی

لے کر پرجیکٹ سائٹ پر پہنچ گیا اور تیزی سے ہر ش کے آفس گیا دروازہ کھولتے ہی ہتھین کے ہوش اڑ گئے، زمین نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا اس کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرے کے کونے میں گڑے کھوٹے سے بندھے بکرے کا صرف سر تھا جو کہ کٹا ہوا تھا اور باقی دھڑ غائب تھا اور اس جگہ خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

ہتھین اٹے قدموں چلنے لگا اور پھر وہاں سے سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور شیواجی کے پاس جا کر رہی رکا۔ اس نے شیواجی کو سب کچھ بتا دیا اور اپنی دیکھنے لگا۔ شیواجی بولے۔ ”میں کل ہی معلوم ہو گیا تھا

کشت و شول نہ کرتے اسی کارن اس مسئلے کو دور کرنے کے لئے یہ عمل کیا تا کہ سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے اور تم اپنی آنکھوں سے حقیقت دیکھ لو۔“

ہتھن نے ہاتھ جوڑ کر شیواجی سے پوچھا۔ ”یہ کیسی سسپا ہے شیواجی؟“ تو شیواجی نے لمبی سانس لی اور بولے۔

”تمہارا دوست اپنے سروناش کا کارن سویم ہے اور یہ وہ جانتا ہے پرتو آستیر سے کام لے رہا ہے۔“ ان کی بات سن کر ہتھن بولا۔

”شا کیجیہ شیواجی میری بدمی میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا ہے میں اپنے متر کو آپ سے ملواتا ہوں پھر اس کے سامنے اس وشے میں بات کرتے ہیں۔“ شیواجی نے ہتھن کی بات سن کر کہا۔ ”جو بھی چاہے کر لو پرتو تمہارا متر جس دلدل کے بھیر جا چکا ہے اس میں سے نکلتا ممکن نظر نہیں آ رہا۔“ ہتھن نے ہنسنے والے انداز سے شیواجی کو دیکھنے لگا۔

ادھر ہرش نے کافی دنوں سے کوئی بزنس ڈیلنگ نہیں کی تھی بس ڈاکٹرز کی ہدایات پر آرام کر رہا تھا۔ سارا کام ہتھن دیکھ رہا تھا اور آج اس نے ہرش سے کسی کی ملاقات کروانے کا کہا وہ بھی کسی اہم کام کے لئے۔ پھر جب ہتھن شیواجی کو لے کر آیا تو شیواجی کو دیکھ کر ہرش کا منہ بن گیا اور وہ بولا۔

”ہتھن یارا یہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے تو؟ میں اچھی طرح سے جانتا ہوں ایسے پانڈیوں کو یہ عام لوگوں کو باتوں کے جال میں الجھا کر جانے کس لوک میں پہنچا دیتے ہیں یہ ساگری لاؤ اس کی دیکھا اب یہ چیز آڈیلنگ ہے اب یہ کر دو اب وہ کر دو آخر کار تنگ آ کر بندہ کہتا ہے یہ روئے لو اور سب کچھ خود ہی کر دو اور اس الجھاؤ کے لئے تو سارا بھیر ارجا جاتا ہے۔“

ہتھن کبھی ہرش کی شکل دیکھتا تو بھی شیواجی کی اس نے شیواجی سے کچھ کہنا چاہا تو شیواجی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا اور ہرش کی اور منہ کر کے بولے۔

”میں یہاں اپنی اچھا سے نہیں اس شخص کی خواہش پر آیا ہوں چرن نہیں چھوئے تھے کہ مجھے یہاں بلاؤ، سسپا تمہاری ہے میری نہیں اور مورکھ ہے جو ایک گیانی کا ایمان کرتا ہے اسے نرا در کرتا ہے تیری ایشیا ہی تیرے سروناش کا کارن ہے جس سنگٹ میں تو گھرا ہے وہ تیرے عمل کی کرنی ہے جسے تو اب بھو گے گا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جسے تو اپنا بھرم جان رہا ہے ناں وہ ستیر ہے۔“ اس بات پر ہرش چونک گیا اور جلدی سے بولا۔

”کس بھرم کی بات کر رہے ہو؟ مجھے کوئی بھرم نہیں ہے۔“

تو شیواجی بولے۔ ”من کے بھیر کا بھید جانتے ہیں ہم؟“ تو ہرش بولا۔

”انتا گیان ہے تو بتا کیا بھید ہے؟“

ہرش کی بات پر شیواجی ہنسنے ہوئے بولے۔ ”میرے پاس گیان کہاں ہے؟ میں تو پانڈی ہوں، میں کیسے بتاؤں؟“ شیواجی کی بات سن کر ہرش کھسیانہ ہو گیا۔

شا کیجیہ شیواجی! اس کی بات کا ارتھ آپ کو کہنا نہیں، دوسرے پانڈیوں کو کہنا ہے آپ کر پا کر کے ہماری سہایت کریں۔“ ہتھن نے معاملے کو سخت کر کے ہوئے کہا تو شیواجی خاموش ہو گئے۔

ہرش کا موبائل بجاتا تو اس نے اسکرین دیکھ کر ہتھن سے کہا ڈاکٹر مہتا ہیں۔

ہتھن نے کہا ”اپنیکر آن کر کیا کہتے ہیں ڈاکٹر مہتا؟“ تو ہرش نے اپنیکر آن کر دیا اور بولا۔

”کہو کیسے ہو مہتا؟“ تو اپنیکر سے آواز سنائی دی۔

”میں تو ٹھیک ہوں ہرش! پر تیرے دل کا معاملہ بہت گھمبیر ہے اسب کچھ الجھا ہوا ہے اور کوئی خاص ریزن بھی بتائیں چل پارہا ہے۔ پرسنلہ بڑھ رہا ہے آئی ٹھنک کہ ہارٹ سرجری کرنی پڑے گی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے تو کل آج پھر اس مسئلے پر بات کرتے

ہیں۔“ ہتھن شیواجی کی اور دیکھ کر بولا۔

”سہایت کریں شیواجی۔“ اور ہرش کو بھی اشارہ کیا کہ وہ شیواجی سے کہے، پرتو ہرش نے منہ دوسری اور کر لیا۔

شیواجی بولے۔ ”تمہیں کیول سسپا کے بارے میں سوچت کر سکتا ہوں، اس کا اپائے نہیں کر سکتا۔“

ہتھن نے ان کی بات سن کر ہاتھ جوڑ لئے اور بولا۔

”اپنے متر کی اور سے میں شا مانگتا ہوں اس وقت اس کی داغی سوچ ٹھیک نہیں ہے، کر پا کیجیہ اب تو کیول آپ کا ہی آسرا ہے۔“

شیواجی نے گہری سانس لی اور بولے۔ ”بات تمہارے متر کے سو بھاد کی نہیں ہے بالک اہم نے جو کہا کہ ہم اپائے نہیں کر سکتے تو اس کا ارتھ ہے کہ نہیں کر سکتے تمہارے متر کے لئے بالکل بھی اچھے سار چار ٹھن ہیں وہ جس سنگٹ میں پڑ چکا ہے اس سے نکلنے کا اہائے تو ہے پرتو اس کا سے اب بہت پیچھے رہ گیا ہے اب ہم تو کیا کوئی بھی تمہارے متر کی سہایت نہیں کر پائے گا اور تمہارے متر کا خاتمہ اٹل ہے۔“ یہ سن کر ہرش اور ہتھن سناٹے میں آ گئے۔

ہتھن نے آگے بڑھ کر ان کے چرن کھول لئے۔ ”یہ سب کیا ہے شیواجی؟“ اب تو ہرش بھی اس اور متوجہ ہو گیا تھا شیواجی نے اپنی آنکھیں بند کیں اور پھر کچھ دیر کر دو بارہ اپنی آنکھیں کھولیں اور سانس لے کر بولنا شروع ہو گئے۔

”یہ جو سنسا رہے ناں اس کے لئے البشور نے کچھ یم بنائے ہیں ہر شے اپنی سیما کے دھارے میں پہلی ہے اور البشور نے اس سنسا میں کیول انسان شکتی نہیں اور شکتیوں کو بھی جما ہے اور اگر ان تمام شکتیوں میں سے کوئی بھی شکتی اپنے دھارے کی سیما سے نکلے گا دوسرے دھارے میں پراوش کرتی ہے تو اس نکلناؤ سنٹون بگڑ جاتا ہے اور پھر یہی بگاڑ ارچنوں کو بلا دیتا ہے۔ اب چاہے انسان شکتی دوسری شکتی سے گھراؤ کرے یا وہ انسان شکتی سے اور یہی کچھ تمہارے

متر نے کیا، ہر کار کا ایک قاعدہ ہوتا ہے پرتو تمہارے متر نے اپنے آپ کو بھگوان جانا اور ایشیا و گھریٹا کی سیما کی لاگ کر گھور پاپ کیا ہے، کیول ایک زمین کے کھرے کے لئے ایک ماں کے کلیجے کے کھلے کو کاٹ دیا یہ کیا سمجھا کہ سنسا کی نظروں میں ماہاں ہے تو البشور کے ساتھ بھی چھل کرے گا اس مانا کا شراب لگا ہے اسے، جیسی تو اس نے اپنی شامت کو آپ ہی بنو دیا ہے دھرتی کے سینے پر کھڑے ان برہما برس کے پرانے پٹیل کے درخت کے اندر ہزاروں جیسے ہوئے تھے جسے اس نے اپنے اہنکار میں یوں ہی اکھاڑ پھینکا بنا کوئی اپائے کے۔“

ہتھن نے حیرانی سے پوچھا۔ ”پٹیل کے درخت تو جانے کتنے ہوتے ہیں اور ایسے کاموں میں تو اکثر کاٹنے پڑتے ہی ہیں تو اس میں ایسا کیا ہے۔“

تو شیواجی بولے۔ ”وہ کوئی عام پٹیل کے درخت نہیں تھے برسوں سے ایک بوڑھی عورت اس پٹیل کے درخت کے نیچے پڑی رہتی تھی جب وہ صرف ایک درخت تھا وہ عورت بس آسن بھائے تپا کرتی رہتی، نہ کھاتی، نہ پیتی سر جھکا کے آنکھیں بند کئے بیٹھی رہتی کبھی پٹیل کے درخت کے پھیرے لیتی رہتی تو کبھی اس کے تنے سے لپٹی پڑی رہتی اس کا اور پٹیل کے درخت کا ایک سبندہ تھا؟ کوئی بھی نہیں جانتا تھا اس کے جیون کا ایک ایک ش پٹیل کے درخت کے ساتھ چلتا تھا ایک پتہ بھی اس پٹیل کے درخت سے گرتا تو وہ دیوانوں کی طرح اسے جھپٹ لیتی۔“

لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ وہ بوڑھی عورت اور پٹیل کے درخت پتی پتی ہیں اور وہ بوڑھی عورت کوئی عام عورت نہیں تھی بلکہ عورت کے روپ میں کوئی نازیدہ شکتی تھی یا پھر پٹیل کے درخت کی چڑیل کتو اس نے بھی کسی کسی کو تنگ نہیں کیا بس وہ پٹیل کے نیچے رہتی تھی وہ کہاں سے آئی اس کی عمر کیا تھی اس کا نام کیا تھا؟ کسی کو بھی معلوم نہ تھا لوگ خوف سے اس کے قریب نہ جاتے تھے۔



پھر ایک روز وہ ہوا کہ سب حیران رہ گئے وہ عورت پتیل کے درخت کے نیچے سے غائب ہوگئی کہاں گئی یہ بھی آج تک راز ہی ہے پرتو وہ جانے کے بعد اپنے پیچھے لوگوں کے لئے ایک اور گھما چھوڑ گئی اس بوڑھی عورت کے غائب ہوتے ہی اسکے روز کیول ایک ہی رات ہی میں اس پتیل کے درخت کی جڑ سے ایک نیا تناور پودا پھوٹ پڑا پتیل کی جڑ سے جڑا ہوا درخت اور اوپر سے بھی پرانے پتیل کے درخت کے ساتھ جڑا ہوا لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دوسرا درخت وہی بوڑھی عورت ہے جو چنپاسے درخت میں پیوست ہوگئی۔ برسوں سے وہ دونوں پتیل کے درخت دھرتی پر کھڑے تھے مگر تھارے مرنے بنا جانے بنا معلوم کر کے انہیں سنگدلی سے اکھاڑ پھینکا ارے اتنی سی بات نہیں جانتا تیرا یہ مورکھ مترکہ اتنے پرانے درختوں کے تو نیچے سے گزرتے ہوئے بھی وہی سادو دھان رہتا ہے پرتو اس کی مورکھتا تو دیکھو! بنا کسی پوجا کے بنا کوئی سیما باندھے بنا کسی شور کھشا کا وج کے انہیں اکھاڑ پھینکا اب وہ شکتی اسے نشت کئے بنا نہیں چھوڑے گی۔

شیواجی خاموش ہو گئے اور وہاں سے پلٹ کر واپس جانے لگے تو ہمیں دوڑ کر ان کے سامنے آیا اور ہاتھ جوڑنے لگا شیواجی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

”تیرا بیار تیرے دوست کے لئے اپنی جگہ ہے لیکن ہم نے کہا ناں کہ سے کل گیا ہے۔“ اور وہاں سے چلے گئے۔

شیواجی کے جاتے ہی ہرش زور سے ہنسا اور بولا۔ ”اسے پتا چل گیا ناں کہ یہاں اس کی دال نہیں گٹکی اور یہاں سے اسے کچھ بھی مالی فائدہ نہیں ہوگا اس لئے اس کو کچھ بھی نظر نہیں آیا تو کہنے کو کچھ جڑا نہیں تو اس نے جھوٹی کہانی گھڑی اور ہمیں سادی پتیل کے درخت کی واہ واہ! میری بیماری کو جانے کیا روپ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسے لوگ فراڈی ہوتے ہیں۔ رہی بات پریشانی کی تو وہ تو ہر دور میں آتی رہی

ہیں کل میں مہتا سے مل کر سرجری کی ڈیٹ ڈیٹائیڈ کرتا ہوں پھر سدا کے لئے اس سسپاسے مکت ہو جاؤں گا۔“

ہتین خاموشی سے ہرش کو سکے جا رہا تھا پھر ہرش سے بولا۔ ”تیرا میرا ہتین کا ساتھ ہے اور ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا تو مجھ سے صاف صاف کہہ کہ شیواجی کیا کہہ رہے تھے کہ تو نے جانتے ہو جیسے سب کیا ہے۔“

ہرش دوبارہ ہنسا اور بولا۔ ”ہتین میرے پار! میں سچ سچ میں کچھ نہیں جانتا، اگر جانتا ہوتا تو تجھے بالکل بتاتا اور میرے تمام کاموں میں تو برابر کا پارنر ہے۔“

ہتین آگے بڑھا اور ہرش کو کانڈھے سے پکڑ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ سچ ہے کہ اس بوڑھی عورت کا گھر تو نے جان کر گروایا تھا جس میں دب کر اس کے پتر کی مرتی ہوگئی اور وہ ابھاگن اپنا دامنی توازن کھوٹ گئی اور پاگل خانے پہنچ گئی۔“

تو ہرش نے اپنا چہرہ ہتین کی اور سے موڑ لیا۔ ہتین نے اسے دوبارہ پکڑ کر وہاں اپنی اور کیا اور بولا۔ ”ہرش اتنا بڑا باپ کیا تو نے وہ بھی کیول ایک زمین کے لئے، وہ بھی اس زمین کے جو تیری محی ہی نہیں تیری زمین ختم ہونے کے بعد ان کا بیڑیوں پرانا مکان تھا جو تو نے اپنی انا اور غور کے تحت گرا دیا۔“

ہتین کی بات پر ہرش ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں نے کوئی پاپ نہیں کیا یہ تو ایک گھٹنا تھی جو گھٹ گئی۔“ ہتین جھلا کر بولا۔ ”سچ کہہ رہا ہے تو نے پاپ تھوڑی کیا ہے، تو نے کیول آئندہ پراپتی کی ہے۔“ تو ہرش بغیر کچھ کہے کمرے سے چلا گیا۔

ہتین اور ہرش نے ڈاکٹر مہتا سے مل کر ہارٹ سرجری کی ڈیٹ فاسٹ کر لی دونوں بعد ہرش کو ایڈمٹ ہونا تھا ہتین ہرش اس کے ساتھ ہی تھا ہرش اپنی تمام ضرورت کی ڈینگ کمپلیٹ کر رہا تھا کیونکہ اس نے

سرجری کے بعد بھی کافی سے ریٹ کرنا تھا۔ اس سے وہ اور ہتین اپنے اسی آفس آئے ہوئے تھے جس کا کام ہانے کب سے رکھا ہوا تھا پریشانی اور نگر نے ہرش رنگ کر دیا تھا، ابھی بھی دونوں اس مسئلے پر بات کر رہے تھے کہ ہتین کا موبائل بجا اس نے اسکرین دیکھی اور کال ریسپونڈ کی دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو ہتین نے گھڑی دیکھ کر ادا کے کہا اور فون بند کر کے ہرش سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں دس منٹ لگیں گے بس۔“

”جا کھا رہا ہے تو؟ کس کی کال تھی؟“ ہرش نے پوچھا۔

”یارا وہ ہے ناں اگر دال، اس کو ہمیں برسوں پہلے منٹ کرنی تھی پرتو اسے کل اچانک پونا جانا پڑ رہا ہے اور اس کی واپسی چار پانچ روز میں ہوگی تو وہ کہہ رہا ہے کہ میں ابھی چیک لے جاؤں ادھ نہیں آجائے گا کیونکہ وہ پریوار کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہے میں آتا ہوں چیک لے کر، کیول دس منٹ لگیں گے پھر ساتھ چلیں گے۔“

ہتین نے بتایا تو ہرش سوچ کر بولا۔ ”راجن اگر دال، تو ہتین نے ہاں میں گردن ہلائی اور پتیل سے چائی اٹھا کر آفس سے نکل گیا اور باہر چوکیدار سے ہرش کا دھیان رکھنے کا کہہ کر چلا گیا ہتین کے جانے کے بعد ہرش نے کرسی پر بیٹھ کر آرام سے پیر اٹھا کر پتیل کے اوپر رکھ لئے اور آنکھیں موند لیں۔

”ہمن.....!“ کی زور سے آواز نے ہرش کو چٹکا دیا اس نے دیکھا تو پتیل پر رکھی اس کی گاڑی کی چابی نیچے گر گئی تھی ہرش دوبارہ آنکھیں بند کر رہا تھا کہ اس کی نگاہ پانی کے گلاس پر پڑی جو دھیرے دھیرے لرز رہا تھا اور آگے سرک رہا تھا پھر وہ تیزی سے کنارے تک پہنچ گیا اور نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہرش نے ترنت پیر نیچے گئے اور پتیل کر بیٹھ گیا اس نے غور کیا تو آفس کا فرش لہر رہا تھا اور اس کی شدت تیز سے تیز ہوتی جا رہی تھی پھر کھل دھڑا دھڑا کر کے پلنے لگی ہرش کو لگا کہ زلزلہ آ گیا ہے وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اس کے قدموں کے

سامنے فرش میں دراڑ پڑنا شروع ہوگئی اور فرش دو ٹکڑے ہو گیا ہرش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ پھر اس ٹوٹے ہوئے فرش میں سے سیاہ دھواں نکلتا شروع ہو گیا اور پھیلنے پھیلنے چھت تک چلا گیا اور دھیرے دھیرے اس نے اسی سیاہ درخت کی شکل اختیار کر لی جس کا چہرہ عورت کا تھا۔ اس کے وجود سے سیاہ جڑیں نکل کر سارے کمرے میں پھیلنا شروع ہو گئیں۔

ہرش بت بنایہ سب دیکھ رہا تھا۔ ”لگتا ہے اس شیواجی کی باتیں میرے دماغ میں محسوس رہ گئی ہیں۔“ ہرش بوڑھیا اور اپنی آنکھیں ملیں مگر اس کی آنکھوں کے سامنے کا منظر تبدیل نہ ہوا پھر ان سیاہ جڑوں نے اپنا رخ ہرش کی اور کر لیا اور آگے بڑھ کر ہرش کی ٹانگوں کو پکڑ لیا اور اس کے بائیں پیر پر موجود دونوں سوراخوں میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔

درد سے ہرش کی چیخ نکل گئی وہ جڑیں تیزی سے ہرش کے پیر کے پھیرے جاری تھیں پھر ہرش کی کھال کے نیچے سے وہ جڑیں پھیلنے لگیں اس کے ہاتھوں، پیروں، چہرے پورے شریر میں سوں کی جگہ وہ جڑیں جال کی طرح پھیل گئیں۔

ہرش خوف زدہ انداز میں اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اس کے شریر میں انگارے سے دوڑنے لگے اور ہرش کی تکلیف نے انتہا کو اس سے چھو لیا جب اس کے شریر کی چڑی نے پھٹنا شروع کر دیا ہرش کی چیخیں آکاش ہلانے والی تھیں مگر شاید اس کی آواز کسی اور کو نہیں سنائی دے رہی تھی، جو کوئی بھی اس کی سہانیا کے لئے نہیں آ رہا تھا، چڑی پھینکنے کے ساتھ ساتھ ہرش کے شریر پر سے ماس نے پھٹنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ہڈیوں کے اوپر درخت کی چھال نکلتا شروع ہوگئی۔

ہرش کے سینے کی کھال پھٹ گئی اور ماس ہٹ گیا تو اس سینے میں دھڑکنے والی نظر آنے لگا جنہیں اب جڑیں پکڑ رہی تھیں۔



## نادیدہ مخلوق

نینا خان - کراچی

رات کے گھپ اندھیرے میں اچانک ہوائی مخلوق کی آواز گونجی اس جگہ سے جتنی جلدی ہوسکے چلے جاؤ یہ ہماری جگہ ہے اور اپنی جگہ کی حفاظت ہم ہر صورت کریں گے چاہے جان لینا پڑ جائے۔

خود کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھنے والا اکثر ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

1997ء میں جب ابا نے سیسنٹر کے مہمان آہد علاقے میں نیا گھر خریدا تو اس وقت اس علاقے میں اتنی آبادی نہ تھی۔ ابا ایک سخت مزاج اور انتہائی اصولی انسان تھے اور اپنی سمجھ بوجھ سے ہی چلتے تھے۔ ابا نے اپنی مرضی سے بغیر کسی کو کھائے کھر کا سودا طے کر لیا تھا۔ جب ابا گھر خرید چکے تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بلال بیٹا میں نے سیسنٹر میں ایک گھر خریدا“

ابے۔ اور اس کی فل منسٹ بھی کر دی ہے آج ہی مجھے گھر کی فائل ملی ہے تو تم کل اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سامان شفٹ کروا دینا۔ پرسوں پھر ہم سب اپنے نئے گھر میں مل ہو جائیں گے۔

ابا کی بات سن کر میں نے کہا۔ ”نھیک ہے ابا جیسا آپ کہیں۔ میں کل ہی تمام سامان شفٹ کرتا ہوں۔“

”ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تمہارے متر کے پاس سے نہیں ہے مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے متر کے پاؤں میں تم مجھے دار ہو یا نہیں، پرنتو تمہارے متر کے پاؤں کا گھڑا بھر چکا تھا پراہمو کے بنائے نردھنوں کو ہمیشہ کیڑے کورے جان کر انہیں بیروں تلے روندنا ہے اس نے اور اپنے آپ کو بھگوان سمجھا ہے کہ وہ جو چاہے کر لے گا اور جس کا چاہے بھاگ اپنی اچھا کے انوسار لکھ دے گا مگر اس بار شاید اس کی چھوٹ سماعت ہو گئی تھی جب ہی اس کا سامنا ایک عجیب شستی سے ہو گیا یہ اس کا ڈنڈ ہے کیونکہ وہ ڈنڈ پوترے میں نے پہلے ہی تمہیں سوچت کر دیا تھا کہ وہ اسے نہیں چھوڑے گی تمہارے متر کی کھاسمت ہو چکی ہے لے گئی وہ اسے سدا کے لئے اور تمہارے متر کے مرتبہ نے دوبارہ اس کی شستی کو چوون دان دیا ہے اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تم کیوں اپنا سے نشٹ کر رہے ہو اور کچھ نہیں پرنتو ایک بات کا ہمیشہ دھیان رکھنا یہ درخت بھی مت کاٹنا ورنہ تمہارا انتھ بھی تمہارے متر جیسا ہی ہوگا اور اگر تم بھی اپنے متر کی طرح پاپ کرتے رہے ہو تو تمہارے پاس وقت ہے کہ تم اپنے پاؤں کا پراکچٹ کر لو ورنہ ایسا نہ ہو کہ سے کل جائے۔“ ہمیں سر جھکائے شیواجی کی باتیں سن رہا تھا۔

”جیسا آپ کا آدیش شیواجی کتھو! اس درخت نے کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ کیا تو؟“ اس نے کہا تو شیواجی بولے۔

اس کا ابا نے یہ ہے کہ اس درخت کے ساتھ ہی شیواجی کی مورتی رخصی پڑے گی جو اس شستی کی سیما باندھ دے گی اور ہاں یہ بھی دھیان رہے کہ شیواجی کی مورتی یہاں سے نہ ہٹے کسی بھی طور سے اور نہ ہی کوئی اس درخت کو کاٹنے کی بھول کرے۔“ ان کی بات سن کر ہمیں نے گردن ہلا دی اور شیواجی ہمیں کو شیواجی کی مورتی کی حقیقت کے بارے میں بتانے لگے۔



پھر ایک دم سے ان سیاہ جڑوں نے سٹنا شروع کر دیا اور ہر ش جڑوں کے ساتھ کھینچتا ہوا اس عورت کے سامنے چلا گیا۔ اس عورت نے اپنا منہ کھول دیا اس کا منہ اتنا بڑا تھا جیسے کوئی غار ہو، ہر ش چیختا ہوا اس کے منہ کے اندر چلا گیا۔

اس درخت نما عورت نے اپنا منہ بند کر لیا اور دوبارہ چیخ کر بولی۔

”پرائی شوہ.....!“ پھر منہ بند کر لیا اور دوبارہ دھوئیں میں تبدیل ہو کر دھرتی میں سانا شروع کر دیا، تھوڑے ہی سے میں تمام دھواں زمین میں چلا گیا اور زمین واپس برابر ہو گئی اور سب کچھ اپنی جگہ واپس آ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

ہمیں واپس آیا تو ہر ش اپنے آفس سے غائب تھا، ہمیں سمجھا وہ انچ پاتھر دم میں ہے اس نے ویٹ کیا پر ہر ش باہر نہیں آیا اس نے دروازہ ٹاک کر کے کھولا وہ خالی تھا ہر ش کی گاڑی بھی باہر کھڑی تھی تو وہ واپس بھی نہیں گیا تھا ہر ش کا موبائل اس کی گاڑی کی چابیاں دونوں ٹیبل پر ہی رکھے ہوئے تھے تو پھر آخر ہر ش کہاں گیا؟ ہمیں نے گاڑی سے جا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ ”ہر ش سرتو باہر آئے ہی نہیں۔“

اب تو ہمیں کی چٹا اور بڑھ گئی آخر ہر ش گیا تو کہاں گیا؟ ہمیں نے ہر ش کو ہر جگہ تلاش کیا کتھو اس کا کچھ پتا نہ چلا پھر ایک روز ہمیں کوگا رڈ نے کال کر کے ترنت ہر ش کے سنے والے آفس آنے کا کہا ہمیں ترنت وہاں پہنچ گیا اور اپنی جگہ مل کر رہ گیا۔

”ہر ش کے سنے آفس کے بیچوں بیچ ایک تناور درخت اگا ہوا تھا جس کے دو تنے تھے یا پھر وہ دور درخت ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے جیسا کہ شیواجی نے بتایا تھا۔ ہمیں نے شیواجی سے دوبارہ رابطہ کیا اور ان سے انتہا کی کہ وہ اس کی سہانچا کریں وہ اپنے متر کو کھوجتے ہوئے تھک گیا ہے اور اب یہ دور درخت اس کی سمجھ کچھ بھی نہیں آ رہا ہے۔ شیواجی ہمیں کے کہنے پر ہر ش کے آفس آ گئے اور ہمیں سے بولے۔

ابا چونکہ بہت سخت مزاج آدمی تھے تو ان سے جرح کرنے کی ہمت کسی کی نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ میں پہلی اور بڑی اولاد تھا اس لئے ہر کام کی ذمہ داری شروع سے مجھے ہی سونپی جاتی ہے۔ اماں اور میری دونوں بہنیں ابا سے تھوڑا خائف تھیں کہ کم سے کم ہمیں ایک بار گھر تو دکھا دیتے لیکن سے پہلے گھر ابا سے کہنے کی ہمت کسی میں نہ تھی۔

کہتے ہیں کہ پہلی اولاد پر سختی کرو اور اس کی اچھی تربیت کرو تو بانی اپنے بچے بھی اسی طرح پروان چڑھتے ہیں بس ابا کی اسی سوچ نے جہاں مجھے بہت اچھا سکھایا تو وہیں انتہائی سختی کا سامنا بھی بس مجھے ہی کرنا پڑا۔

ابا ایک تہجد گزار پانچوں وقت نماز کے پابند انجوشن ڈپارٹمنٹ میں 17 گریڈ کے افسر بھی تھے ایک بچے اور کمرے انسان تھے۔ بس وہی اوصاف وہ مجھ میں بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے بھی تہجد میں ڈانٹ کر رکھتے۔ پھر فجر میں بھی تو اسی لئے بچپن سے میں بھی نہ صرف تہجد گزار بلکہ پانچوں وقت کا نماز گزار بھی تھا۔

بچپن سے مجھے تحقیق کا بہت شوق رہا ہے اسی شوق کی خاطر ایسے ایسے کام کروئے کہ عام بندہ تو بس صرف سوچ ہی سکتا ہے۔ میں انتہائی غرور انسان ہوں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں بس تحقیق کی جستجو میں رہتا ہوں۔

اگلے دن رمضان کی چاند رات تھی۔ خیر میں نے اپنے چار دوستوں کے ہمراہ نئے گھر میں سامان شفٹ کروانا شروع کر دیا۔ 120 گز کا گھر تھا جیسے ہی تالا کھولا تو ایک عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ گھر سالوں سے بند ہو۔ اس میں ایک بہت بڑا سالہاں تھا اس کے ساتھ یہی گھن گھن کے ساتھ ایک چھوٹا کمرہ۔ اوپر جانے کی سیڑھیاں اور سیڑھیوں کے ساتھ ہی اٹیچڈ ہاتھ اور پکچن تھا۔ گراؤنڈ فلور میں، میں نے تمام سامان دوستوں کی مدد سے سیٹ کروا دیا فرسٹ فلور پر کمرہ تھا جو کہ لاک تھا اور اس کی چابی ابا کے پاس تھی۔ فرسٹ فلور کے اوپر کشادہ سی چھت تھی جس پر ہم نے ٹل کر داشک مشین رکھ دی اور گراؤنڈ فلور میں تمام سامان اچھی طرح سجایا تھا تاکہ اماں اور بہنوں کو پریشانی نہ ہو۔

سامان سیٹ کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ دوستوں نے مجھ سے اجازت لی اور چلے گئے۔ اب رات میں مجھے اکیلے ہی رہنا تھا پھر صبح پہلی سحری بھی تھی اور میں بری طرح سے تھک چکا تھا۔

میں ہال میں ہی بڑے صوفے پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے محکم کی وجہ سے نیند آگئی۔ میں گہری نیند میں تھا کہ محکم میں بنے دائر ٹینک میں پانی گرنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے جا کر دیکھا تو دائر ٹینک میں پانی گر رہا تھا مجھے پیاس بھی لگ رہی تھی میں نے ہاتھوں سے ہی پانی پینے کی کوشش کی۔

اور جیسے ہی میں نے ٹینک سے پانی ہاتھ میں بھر اور منہ تک لے جانے ہی لگا تھا کہ مجھے کسی نے کہا۔ ”شش..... شش.....“ میں نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ پھر سے میں نے پانی پینے کی کوشش کی تو پھر مجھے آواز آئی۔

”شش..... شش.....“ میں نے پھر سے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نہ تھا پھر میں نے پانی پینے کے لئے ہاتھوں کو منہ سے لگا پھر کسی نے۔

”شش..... شش.....“ کم دیش چار مرتبہ ایسا ہوا اور میں پانی نہیں پی سکا۔ ایک عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی مجھے۔

میں نے اٹھ کر دائر ٹینک کا ڈھکن بند کر کے چاروں طرف دیکھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ پھر اوپر سے پہلے بلب کی روشنی مزید وحشت میں اضافہ کر رہی تھی۔ اس وقت سیوریج وائل ای ڈی لائٹس تو ہوتی نہیں تھیں اور پورے گھر میں ایک ہی بلب لگا تھا وہ بھی بس ہال میں چاروں طرف اندھیرا اور تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ میں صوفے پر آ کر پھر سے لیٹ گیا تو مجھے چھت پر سے برتن گرنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر لگا کہ سیڑھیوں سے کسی نے برتن زور سے پھینکے ہیں۔ میں نے جا کر دیکھا تو کچھ نہیں تھا۔

اب ان تمام واقعات کی وجہ سے میں مکمل طور پر چاک و چوبند ہو چکا تھا کہ چھت پر سے مجھے دوا دیوں کی

ہاتھیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں میں اٹھ کر چھت پر دیکھنے لگا ان دوا دیوں کی آواز اب بند ہو چکی تھی میں ٹانڈر ہل میں گیا تو پھر سے ان دوا دیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں میں پھر جا کر دیکھنے لگا تو آوازیں بند اسی طرح تین سے چار بار ہوئیں۔ میں جب آواز کے تعاقب میں باہر جا کر کھڑا ہوتا تو آواز آتا بند ہو جائے جب اندھا دس تو باتوں کی مستقل آوازیں آتیں۔

عجیب ماجرا تھا کچھ نہیں آ رہا تھا بہر حال میں پھر اٹھا۔ گھر کا مین دروازہ بند کر کے اپنی بایک پر سابقہ گھر میں آ گیا۔ جہاں پہلی سحری کی خوب ذوق و شوق سے تیاری کی جا رہی تھی میں نے غسل کر کے سحری کی اور پھر نماز پڑھ کر سو گیا۔

روزہ افطار کے بعد ہمیں سی سینٹر والے گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ ہم سب وہاں آ گئے اماں اور بہنیں اسام اور عظمیٰ بچن سمیت کرکھانا بنانے کا انتظام کرنے لگیں اور مجھ سے چھوٹا بھائی جہاں بھی میرے ساتھ مل کر چھت پر کچھ سامان رکھوانے لگا۔ ابا تو محکم کے ساتھ والا کمرہ لے چکے تھے کہ میں وہاں اکیلے رہوں گا اماں اور دونوں بہنیں ہال میں ہی رہنے کا کہہ چکی تھیں تو میں نے ان سے کہا۔

”ابا فرسٹ فلور اب تک لاک ہے اس کی چابی دیں تاکہ میں اور جہاں وہاں کی صفائی کر کے اپنے رہنے کا بندوبست کر سکیں۔“

میری بات سن کر ابا بولے۔ ”چلو لاک میں کھول دیتا ہوں۔“

ابا کی بات سن کر میں اور جہاں دونوں ابا کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے ابا نے فرسٹ فلور کے کمرے کا لاک کھولا تو وہاں خون کے نشان تھے اور خون جما ہوا تھا خون کی بو بھی بہت تھی کہ سانس لینا محال ہو گیا تھا میں اور جہاں بو کی وجہ سے ناک پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگے اور دم سے باہر نکل گئے ابا نے چابی میرے ہاتھ میں لپیٹے ہوئے کہا۔

”بس کر دیکھنا۔“ جا کر دونوں مل کر فرش دھولو اچھی طرح سے۔ یہاں ایک جانور مر گیا تھا یہ اسی کا

خون اور بد بو ہے بس اب صاف صفائی کر کے اپنے رہنے کا بندوبست کرو۔“

ابا کے سامنے کبھی کسی نے کچھ بولا ہے جو ہم آج بولتے۔ میں اور جہاں دونوں ہی فرش دھو کر اپنا روم سیٹ کرنے میں لگ گئے، اسی کام میں سحری کا وقت بھی ہو گیا تھا میں اور جہاں نیچے آ کر سحری کرنے میں معصوف ہو گئے، سحری اور نماز سے فارغ ہو کر قرآن کی تلاوت کی تھوڑا آرام کرنے کے بعد ہم سب اپنے اپنے مشاغل میں لگ گئے میں اس وقت یونیورسٹی کا طالب علم تھا اپنی پڑھائی میں مگن تھا ابا بھی اپنی جاب پر چلے گئے۔ دن بھر تو اماں اور بہنیں کام اور آرام میں معصوف رہیں، افطار کے بعد جب رات کا کھانا کھا کر ہم سب سو چکے تھے اپنے اپنے پورشن اور کمروں میں کہ اماں کو ایسا لگا کہ میں نے آغوا کا انگوٹھا پکڑ کر انہیں کھینچا ہے، وہ بری طرح چیخنے لگیں تو میں اور جہاں اوپر سے نیچے آ گئے ابا بھی اپنے کمرے سے آ گئے اسام اور عظمیٰ بھی بہت خوف زدہ سی تھیں اماں کے چیخنے پر۔ اماں نے مجھے ڈانٹ کر کہا۔

”میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر تم نے مجھے اتنی زور سے کھینچا کہ میں اپنی جگہ سے گر کر یہاں آ گئی۔ تم نے ایسا کیوں کیا ہلال۔“

اماں کی بات سن کر میں جہاں کو دیکھنے لگا اور جہاں مجھے، کیونکہ ہم دونوں ایک ساتھ ہی نیچے آئے تھے وہ بھی اماں کی آوازیں سن کر، میں نے کہا۔

”اماں میں تو ابھی اوپر اپنے کمرے سے آ رہا ہوں آپ کی آوازیں سن کر۔ میں بھلا ایسا کیوں کروں گا۔ لگتا ہے آپ نے کوئی خواب دیکھا ہے۔“

اماں میری بات پر غصہ سے کہنے لگیں۔

”میں نے خواب نہیں دیکھا جو کہہ رہی ہوں سچ ہے وہ۔“

ابا فوراً اپنی گرج دار آواز میں بولے۔

”آسیہ بیگم یہ تمہارا وہم ہے چلو سو جاؤ اب۔“

سحری کا وقت بھی ہونے والا ہے کچھ دیر آرام کرلو۔“



ابا کی بات سن کر ہم سب اپنے اپنے کمروں میں آگئے پھر سونہ سکے کچھ دیر بعد صبحری کا وقت ہو گیا تھا۔ روز کے معمول کے مطابق اپنے اپنے مشاغل میں مصروف ہو گئے۔

اظفار کے بھدر رات کا کھانا سوچا کہ کھلی فضاء میں کیوں نہ کھایا جائے یعنی چھت پر۔ تو ہم سب کھانے کا سامان چھت پر لے گئے۔ اماں پھر ٹینشن کی مریض ہیں تو کھلی فضاء میں رہنا انہیں اچھا لگتا ہے۔

کھانا وغیرہ کھا کر ہم سب کچھ نہ کچھ سامان لے کر نیچے آگئے باقی کے برتن اٹھانے کے لئے چھوٹی بہن اکیلی چھت پر گئی تو اس نے زور زور سے چیخا شروع کر دیا اس کی آواز پر ہم سب بھاگتے ہوئے چھت پر گئے تو کھلی خوف کے مارے بہت زور زور سے کانپ اور چیخ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر غلطی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا عظمیٰ اس طرح چیخ کیوں رہی ہو کیا ہوا.....؟“

مجھے زور سے پکڑ کر وہ روتے ہوئے کہنے لگی۔ ”بھائی یہاں کوئی خوف ناک سی چیز تھی دیکھ کر میں بہت ڈر گئی اور وہ دعائیں ہو گئی۔“

ابا اور میں نے اسے اس کا وہم بتا کر اسے نیچے لے گئے اگلے دن اسامہ بچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ پیچھے سے کسی نے اسے زور سے نوجا تو وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی مگر وہاں کوئی نہ تھا اس کے بازو میں درد ہو رہا تھا نوچنے کے باعث وہ ڈر گئی اس نے اماں اور عظمیٰ کو بتایا تو اماں اور عظمیٰ بھی گھبرا گئیں کیونکہ رات میں برتن گرنے کی آوازیں آنا اور چھت پر باتیں کرنے کی بہت آوازیں آتی تھیں۔

کوئی ٹھہر مار کر چلا جاتا۔ کوئی نوج کر چلا جاتا۔ دیکھنے پر کوئی نظر نہ آتا۔

ہمیں اس گھر میں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اماں اسامہ کی تینوں بری طرح خوف زدہ ہو چکی تھیں ابا تو ڈانٹ کر سب کا وہم بتا کر چپ کر دیا کرتے تھے ان سے بات کرنا ہی فضول ہوتا تھا۔ میں نے بھی ان

سب باتوں کو وہم کے طور پر ہی لیا تھا جہاں بھی ان تمام باتوں پر سنجیدہ نہ تھا جبکہ برتنوں کے گرنے اور چھت پر باتیں کرنے کی آوازیں ہم بھی سنتے تھے۔

برائیانی ہم سب بہت شوق سے کھاتے ہیں میں نے فرمائش کر دی کہ آج اظفار میں برائیانی بنا لو، میں گھوڑ کھا کر شربت پی کر نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور سوچا کہ آج برائیانی میر ہو کر کھاؤں گا۔ میں نے کہا۔

”اسامہ تم میرے لئے کھانا نکال کر میرے کمرے میں رکھ آؤ۔ میں بس ابھی اوپر آتا ہوں۔“

اسامہ نے ایک پلیٹ میں برائیانی نکال کر اوپر کمرے میں رکھ دی۔ میں پیسے ہی اپنے کمرے میں گیا تو برائیانی غائب ہو چکی تھی پلیٹ سے، میں خالی پلیٹ لے کر نیچے آیا اور اسامہ سے کہنے لگا۔

”اس خالی پلیٹ کا میں کیا کروں جب تم اوپر ہی کھا کر آ گئیں تو میرے لئے دوسری پلیٹ میں نکال کر رکھ دیتیں۔“

میری بات سن کر اسامہ کہنے لگی۔

”بھائی میں ابھی ابھی تو پلیٹ بھر کر برائیانی اوپر آپ کے کمرے میں رکھ کر آئی ہوں۔ بھلا میں ایسا کیوں کروں گی۔“

اس کی بات پر میں نے کہا۔ ”تو برائیانی کہاں غائب ہو گئی مجھے اب پھر سے نکال کر دو۔“

”اسا جیسے ہی بچن میں برائیانی لینے گئی تو برائیانی کا بھگونا ہی غائب تھا۔ ہم نے پورا گھر ڈھونڈ لیا مگر برائیانی کا بھگونا کہیں نہیں ملا۔ چھت پر برتن گرنے کی آوازیں آئی تو میں بھاگ کر وہاں گیا تو برائیانی کا خالی بھگونا پڑا تھا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

کیونکہ ہم سی سینٹر کے علاقے میں نئے سے محلے والوں سے اتنے تعلقات ابھی نہ تھے ہمارا گھر سینٹر کا تھا۔ دونوں طرف پڑوس میں گھر تھے۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ دن کے وقت تو وہ لوگ اپنی اپنی چھتوں پر آ جاتے تھے مگر رات کے وقت اس پوری گلی کے لوگوں کو میں نے

ان کے ہی گھروں کی چھتوں پر انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بس ہم لوگ ہی اپنے گھر کی چھت پر جایا کرتے تھے۔

ایک دن میں اپنے دوستوں سے مل کر واپس گھر آ رہا تھا کہ اپنے پڑوسی اکل کو باہر دیکھا تو انہیں سلام کر کے ہاتھ ملایا پھر اپنا تعارف کروایا۔

”میرا نام بلال ہے ہم آپ کے پڑوس میں ڈیڑھ ہفتے پہلے ہی شفٹ ہوئے ہیں ابھی تو ہم سب اپنی اپنی اسٹڈی میں مصروف رہتے ہیں پھر رمضان میں وقت کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ پھر شنگلک میں بھی مصروف رہے تو آس پڑوس میں ملنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ آپ یہاں کب سے ہیں۔“

میری بات سن کر اکل کہنے لگے۔

”چند روز سولہ سال سے ہم یہاں ہیں۔ بیٹا آپ لوگوں نے یہ گھر کیوں خرید لیا۔“

اکل کی بات سن کر میں چونکا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں اکل آپ کی بات۔“

اکل بولے۔ ”بیٹا بلال یہ گھر تقریباً سولہ سترہ سال سے بند ہے۔ اس گھر میں آج تک کوئی نہیں رہا۔ جب سے ہم یہاں اس علاقے میں آئے ہیں اس گھر کو بند ہی دیکھا ہے۔

یہ گھر آسب زدہ ہے یہاں تو آسب کا بھرا ہے۔ یہاں ایک لڑکی کا قتل ہوا تھا تو اس کے بعد اس گھر میں جو تالا لگا ہے نا اب آپ لوگوں کے آنے سے ہی کھلا ہے۔ رات اس گھر سے چیخنے چلانے اور قہقہوں کی آوازیں پورے محلے میں گونجتی ہیں۔ برتنوں کے گرنے کی آوازیں اور بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔“

رات مغرب کے بعد اس گلی میں کوئی بھی اپنے گھروں کی چھتوں پر نہیں جاتا۔ کیونکہ اس گھر کی چھت پر ناہیدہ مخلوق نظر آتی ہے جو سب کو ڈراتی ہے اور منہ کرتی ہے کہ رات میں چھت پر کوئی نہ آئے، بیٹا تو مغرب کے بعد اپنی چھتوں پر بھی نہیں جاتے۔ آپ کیسے رہے ہو۔ بیٹا میری بات مانو تو جلدی سے اس گھر کو خالی کر دو۔ اس گھر میں جن ناہیدہ چیزوں کا بھرا ہے نا وہ آپ لوگوں کو نقصان بھی

پہنچا سکتی ہیں بہت کچھ ہوا ہے رات مغرب کے بعد اس محلے کے لوگوں کے ساتھ چھتوں پر جانے سے۔“

اکل کی بات سن کر میں کچھ پریشان سا ہو گیا پھر میں نے وہاں کے آس پڑوس کے سب ہی لوگوں سے تحقیق کرنا شروع کر دی اس گھر کے بارے میں سب نے تقریباً وہی باتیں بتائیں تھیں جو کہ ہمارے پڑوس میں رہنے والے خورشید اکل نے بتائی تھیں۔ مزید معلومات کو نہ پوچھتا چلا کہ سترہ سال پہلے اس گھر میں کلثوم نامی لڑکی کا قتل ہوا تھا، کلثوم کے والدین کا اسلام آباد میں ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا۔ کلثوم اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی کافی جائیداد کی اکلوتی وارث تھی اس نے کسی لڑکے سے شادی کر لی اور وہ کراچی شاہ فیصل کے علاقے سی سینٹر میں مشیل ہو گئی تھی اس کے شوہر نے جائیداد کی لاچ میں فرسٹ فلور کے کمرے میں اس کا گلا کاٹ کر اسے قتل کر دیا تھا وہ چیختی رہی چلائی رہی مگر اس کے شوہر پر تو لاچ کا بھوت سوار تھا۔ وہ یہ گھر کسی طرح بچ کر کلثوم کی ساری جائیداد لے کر کراچی سے چلا گیا۔ جس نے یہ گھر خریدادہ خون دیکھ کر گھر کو تالا لگا کر چلے گئے۔ کوئی اس گھر میں نہیں رہا۔

سترہ سال سے یہ گھر بند ہے۔ اتنے سالوں بند رہنے اور قتل ہونے کی وجہ سے یہ گھر آسب کا بھرا بن گیا ہے آس پڑوس کے لوگ مغرب کے بعد اپنے گھروں کی چھتوں پر جانے سے بھی گریز کرتے ہیں کیونکہ جب بھی کوئی چھت پر جاتا ہے تو وہ مخلوق نظر آ کر بھینک روپ میں ڈراتی ہے۔“

یہ ساری افکار مشن جاننے کے بعد میں ابا کے کمرے میں ان سے بات کرنے گیا اور انہیں سب کچھ بتایا تو ابا کہنے لگے۔

”مجھے یہ سب کچھ پہلے سے پتا ہے تم پریشان نہ ہو اور اس بات کا ذکر اپنی ماں اور بہنوں سے مت کرنا ورنہ وہ ڈر جائیں گی۔“

ابا کی بات سن کر مجھے بہت غصہ آیا تو میں نے کہا۔ ”ابا جب آپ کو سب کچھ پتا تھا تو آپ نے یہ



## سایہ

طارق محمود - کامرہ انک

رات کے ایک بجتے ہی ایک سایہ کوٹھی کی بڑی دیوار سے برآمد ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ کمرے کی دیوار سے گزر گیا اور دیکھنے والے اچنبھے میں انگشت بدن دان رہ گئے۔

ایک روح کی چاہت خلوص اور والہانہ پیاری کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو دنگ کر دے گی

زندگی اچھی گزر رہی تھی لیکن کچھ خشک اور بے رنگ سی تھی والدین فوت ہو گئے تھے لیکن میرے لئے دو مکان اور چار دکانیں جو کہ کرایہ پر چم می تھیں، ان کا معقول کرایہ آرہا تھا اس کے علاوہ میرے لئے ایک تین کمروں کا پیارا سا گھر جس میں، میری رہائش ہے مکان اور دکانوں کا کرایہ اتنا آجاتا ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اپنی دکانوں کے سامنے بے تحشرے پردوں چڑھے اٹھ کر بیٹھتا ہوں وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں اور خوب صورت گاڑیوں کو محبت سے دیکھتا رہا، کبھی کبھی گھومنے کے لئے بھی نکل جاتا میں نے اپنی پڑھائی پر کچھ زیادہ ہی توجہ دی تھی۔ اسی لئے دوست پار بنانے کی ضرورت ہی نہ ملی۔ جب بھی گھومنے کا سن جاتا تو اکیلا ہی نکل کھڑا ہوتا ہوں اتنا کچھ ہونے کے باوجود ہی زندگی میں کسی چیز کی کمی ہی تھی۔

گھر خریدای کیوں۔ اگر اس مخلوق نے کسی کو نقصان پہنچا دیا تو۔“

میری بات سن کر بااخصہ کرتے ہوئے بولے۔  
”بس کرو بلال اس طرح کی باتیں۔ اللہ نے انسان کو زیادہ طاقتور بنایا ہے اچھا بس اب اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوگی یاد رہے اماں اور بہنوں سے مت کرتا یہ بات۔“

ابا کی بات سن کر میں غصے میں اپنے روم میں آ گیا اب تو یہ روز کا معمول تھا کہ کھانا بنا کر کھو پورا کا پورا کھانا برتن سمیت غائب، کوئی تھپڑ مار کر جاتا تو کوئی فوج کر چلا جاتا اور جب دیکھو کوئی نظر نہ آتا۔

خیر ایک رات میں چھت پر اکیلا ہی تکیہ چادر لے کر سونے چلا گیا۔ رات میں، میں نے چادر بچھائی تکیہ لگایا اور لیٹ گیا۔ کھلی فضا کھلا آسان اس پر سچے چاند ستارے اور چاند کی روشنی بہت دلکش لگ رہی تھی اوپر سے ٹھنڈی ہوا کے جھوکے، میں بہت لطف اندوز ہو رہا تھا کہ میری نظر بڑوں کے گھر کی چھت پر پڑی جو ہماری چھت سے ذرا اونچی ان کی چھت پر ایک ساڑھی پہنے ہوئے عورت مجھے مستقل دیکھ رہی تھی میری نظر جب اس پر پڑی تو میں نے مسکرا کر اسے دیکھا تو اس نے اپنی ہنسی میں اچکا کر اشارہ کیا کہ ”کیا ہے۔“

میں بس اس کوئی دیکھ رہا تھا کہ تین بار انہوں نے اپنی ہنسی میں اچکا کی تو میں نے پہچان لیا کہ یہ خورشید انکل کی والدہ ہیں اور وہ مستقل مجھے دیکھ رہی ہیں تو میں نے انہیں مسکرا کر سلام کیا۔

”السلام علیکم۔“ میرا سلام سنتے ہی ان کے بال ایک دم نکھرنے لگے چہرہ بھی بگڑنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھیا تک چڑیل کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔

پھر میرے ذہن نے کام کیا کہ یہ ساڑھی والی خاتون خورشید انکل کی والدہ کیسے ہو سکتی ہیں وہ تو مر چکی ہیں وہ مجھے مستقل گھور رہی تھیں ان کا چہرہ انتہائی بد صورت اور خوف ناک ہو چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے خوف محسوس ہوا تھا میں پسینے میں نہا چکا تھا میرے دل کی دھڑکنیں انتہائی



ایک دن چچا منظور جو کہ میرے کرایہ دار تھے نے مجھے کہا۔ ”علی بیٹا کب تک یوں اکیلے رہو گے..... شادی کرلو۔“ ان کی بات سن کر میرا دل زور سے دھڑکا اور میں اچھل پڑا بات سامنے کی تھی لیکن..... اس دن سے میں جب بھی کسی خوب صورت لڑکی کو دیکھتا تو من میں کھد بکھد ہونے لگتی۔ لیکن یہ کھد بکھد اس لڑکی کے سامنے سے ہٹنے ہی ختم ہو جاتی اور میں جو پینے پینے کی تیاری کر رہا ہوتا تھا کہ اچانک واپس اپنی پوزیشن پر آ جاتا۔ ”اور پھر سوچا شادی کے بارے میں۔“ چچا منظور نے پھر ایک دن پوچھا۔ ”چچا شادی کرو تو لوں لیکن کوئی لڑکی نظر میں نیچے تو صبح“ میں نے دل پر ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا۔ تو چچا مسکرانے لگے۔

”وہ ایک چھوٹی سی ڈنر پارٹی تھی جو کہ میرے ایک رشتہ کے ماموں کی شاندار کوٹی میں تھی۔ جس میں مجھے بھی انوائٹ کیا گیا تھا میں ایسی محفلوں میں کم ہی جاتا ہوں لیکن یہاں ایک تو بات رشتہ داری کی تھی اور دوسرا میرے تعلق دار اور اپنے مجھے مغرور سا سمجھتے تھے۔ اسی لئے میں نے یہ پارٹی انینڈ کی۔

پارٹی پوری تھی میں بھی لئے دیئے والا بندہ تھا اور میرے ماموں اور ان کی فیملی بھی رشتہ داروں سے زیادہ میل ملاپ رکھنے والے نہ تھے۔ اسی لئے میں ان کے گھر بنے چڑیا گھر اور پھر ایکوریم میں رنگ برنگی مچھلیوں سے دل بہلاتا رہا۔

کھانا بھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ میں دس بجے وہاں پہنچا تھا۔ اور بارہ بجنے والے تھے، ایک ویٹر سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس پارٹی کا کوئی مہمان خصوصی بھی ہے اور جب مہمان خصوصی محفل میں آیا تو سب کی نظریں اس طرف لگ گئیں میں بھی اس شخصیت کو دیکھتے ہی چڑیا گھر سے نکل کر کوٹی کے اندر جی محفل میں آ گیا جہاں ہر جوان اور بڑی عمر کا مرد اس شخصیت کے ارد گرد نظر آ رہے تھے، ہلکے مہرون کمر کے کپڑوں پر سفید پھولوں والی چادر اوڑھے چہرہ پر میک اپ کے نام پر رنگی سی لپ اسٹک اور ہاتھ میں بیج موبائل اس کے تھوڑا ہی

پچھے کالی چست پینٹ شرٹ میں لمبوس دونو جوان جو کہ اس شخصیت کے یقیناً باڈی گارڈ تھے۔

”او بھائی..... یہ لیڈی کون ہے۔“ ایک ویٹر سے پوچھا تو اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”کون سے شہر سے آئے ہو اس شاہینہ کو نہیں جانتے۔“

”او“ میرے منہ سے نکلا اور وہ ویٹر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

مس شاہینہ کے آتے ہی اس محفل میں جان سی پڑ گئی کہیں سے پیانو کی مدھم مدھن بجنے لگی جو کہ اس ماحول میں فسون سا جگانے لگی۔ میں مس شاہینہ کے نزدیک تو نہیں گیا لیکن ایک کونے پر بیٹھا، وہ جدھر جاتی میری نظریں اس کا تعاقب کرتیں، اس کی عمر تیس سے کچھ زیادہ تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو سنہال کر رکھا ہوا تھا اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی والد والدہ دونوں حیات تھے اور جاگیر دار تھے نجانبے کتنے ہی رشتے آئے لیکن مس شاہینہ نے کچھ نہ کچھ بہانہ کر کے ان سے شادی سے انکار کر دیتی۔ یہ سب معلومات مجھے اسی محفل میں گھومتے پھرتے مل گئی میری عمر پچیس سال تھی لیکن میں نے سامنے لگے ایک شیشہ میں اپنے آپ کو دیکھا اور ساتھ ہی تصور میں مس شاہینہ کو کھڑے دیکھا تو مجھے یہ جوڑی بہت ہی اچھی لگی۔

ادھر ادھر لوگوں کے درمیان گھومتے ہر کسی کو نہیں کر لیتے ہوئے مس شاہینہ نے دو تین بار مجھے دیکھا میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی لیکن اس کا چہرہ کسی تاثر سے عاری تھا۔ میرے رشتہ کے ماموں اس کے سامنے جیسے بجھے بجھے جاتے تھے اس پارٹی میں چند سیاسی لوگ بھی تھے جن سے مس شاہینہ کچھ زیادہ دیر تک باتیں کرتی رہی اور پھر ڈنر کا وقت ہوتے ہی ڈنر شروع ہو گیا۔

مس شاہینہ کو دیکھنے کے بعد کھد بکھد میرے دل میں ہوئی تھی وہ اس کے جانے کے بعد ختم نہ ہوئی بلکہ وہ اتنا بڑھی کہ مجھے کسی پل چین نہ تھا دو دن بہت ہی بے تابی میں گزرے آخر اس کا دیدار کرنے کی ہمت باندھی اور اس کے محل کے بڑے سے گیٹ کے سامنے ایک

درخت کے نیچے جا بیٹھا اور دن وہاں بیٹھا بے چینی سے محل اور اس کے گیٹ کی طرف دیکھتا رہا کہ شاید وہ نکلے اور اس کو دیکھ کر دل کی کھد بکھد کچھ سکون ملے نہ کھانے کا ہوش تھا نہ ہی کچھ پینے کا، آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور محل کا بڑا سا گیٹ کھلنے لگا پھر سفید رنگ کی بڑی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر آنکھوں پر سن گلاسز لگائے مس شاہینہ محنت سے براہمان نظر آئی۔ اسے دیکھ کر دل کی حرکت پہلے سے تیز چلنے لگی۔ گاڑی میرے سامنے سے گزر گئی اس نے ہلکا سا بھی ادھر ادھر نہ دیکھا میں نے اسے چند ساعت نظر بھر کر دیکھا لیکن اس سے سکون نہ ملا بلکہ دل کرنے لگا اور دیکھوں اور دیکھوں پر مجھے وہاں سے اٹھنا ہی پڑا کیونکہ وہ علاقہ امیر لوگوں کا تھا۔ صنعت کار، مل آئرز اور جاگیر دار اسی لئے وہاں سے خراشاں خراشاں چلتے ہوئے اپنے محلے کے ایک ہوٹل میں چائے پی اور پھر گھر کی راہ لی۔ بے سکونی، بے چینی اور میں، دوسرے دن صبح ہی صبح میں پھر اس محل کے سامنے کھڑا ہونے کے لئے چل پڑا۔ اپنے خیالوں میں مس شاہینہ کے خیالوں میں کھویا چپ چاپ سر نہوڑائے چلا جا رہا تھا کہ اچانک کسی نے پیچھے سے آکر کندھے پر ہاتھ رکھ دیا میں نے چونک کر سر گھم کر دیکھا سامنے چچا منظور حیرانگی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے تھے۔

”میاں علی..... کہاں گم مسم جا رہے ہو میں نے دو تین دفعہ آپ کو پکارا لیکن آپ تو سن کے ہی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“

”نہیں چچا کچھ نہیں کوئی گڑبڑ نہیں۔ ذرا ایک کام سے جا رہا تھا۔ اسی کام کے بارے میں تانے بانے بن رہا تھا۔“ میں نے بانیں ہاتھ سے گردن کھجاتے ہوئے جواب دیا تو چچا منظور مسکراتے لگے۔

”چلو میاں اچھی بات ہے تمہیں بھی کوئی کام تو سوچھا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ان سے اجازت لی اور پھر ایسے ہی چلتے چلتے بیٹل بینک کے سامنے سے ہوتا ہوا مس شاہینہ کے علاقہ کی طرف مڑا ہی تھا کہ میری نظر مس شاہینہ کے ایک باڈی گارڈ پر پڑی جو کہ بینک کے

باہر انٹینشن کھڑا تھا میں ٹھنک کر رک گیا میری نظریں پارکنگ میں پھرنے لگیں اور پھر میں نے مس شاہینہ کی گاڑی پارکنگ میں ایک طرف کھڑی دیکھ لی اب میں باہر ایک بیج پر بیٹھا اس کے بینک سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ چندرہ میں منٹ بعد وہ بلیو کٹر پڑوں میں سر پر سفید دوپٹہ کئے بینک سے نکلتی نظر آئی۔ اس کے پیچھے ہی ایک آدمی نکلا جو کہ مجھے کچھ مشکوک سا لگا۔ بینک کی سیڑھیاں اترتے ہی اس نے موبائل نکالا اور بیج ٹائپ کرنے لگا۔ شاید اس نے بیج سینڈ کیا اور پھر مسکراتے ہوئے مس شاہینہ کی طرف ایک نظر دیکھ کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔ مجھے کسی خطرے کا احساس ہوا لیکن مس شاہینہ اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ چلتے ہوئے میرے سامنے سے گزر کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ آج بھی اس نے ادھر ادھر نہ دیکھا بلکہ نیچے دیکھتے ہوئے ہی گزر گئی۔ اس کی گاڑی پارکنگ سے نکلی ہی تھی کہ ایک موٹر سائیکل سوار اسپید سے پارکنگ میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ وہ سیدھا گاڑی کے ساتھ جا کر آیا، موٹر سائیکل سوار ہوا میں اڑ کر پارکنگ کے ساتھ بنے پلاٹ میں لگے ایک فوارہ کے پانی میں جا کر۔ گاڑی ادھر ہی رک گئی تھی۔

مس شاہینہ اور اس کا باڈی گارڈ گاڑی سے نکل آئے۔ شاید وہ موٹر سائیکل سوار کو دیکھنا چاہتے تھے۔ میں بھی آہستہ سے بھاگ کر ادھر پہنچا۔ میں نے ان سے پہلے موٹر سائیکل سوار تک پہنچ کر اسے پانی میں سے نکالا زیادہ چوٹ لگنے سے اس کی بچت ہوئی میں اسے نکال کر پلاٹ کے گھاس پر لایا ہی تھا کہ میری نظر سڑک پر آتے ہوئے ایک بلیک ٹری موٹر سائیکل پر پڑی جس پر دو نقاب پوش بیٹھے تھے۔ چھپلے کے ہاتھ میں مجھے ہتھول کی جھلک نظر آئی۔ ان دونوں کی آنکھیں مس شاہینہ پر مرکوز تھیں۔ موٹر سائیکل کے ٹاپے پر لکھا تھا۔ ”چیف آف ڈیپٹھ۔“ میں نے اس زخمی موٹر سائیکل والے کو تیزی سے پلاٹ کے گھاس پر ڈالا تو میرے ذہن میں بازگشت ہونے لگی کہ ”مس شاہینہ کو بھانپا“ پھر میں نے ایک چپ لیا اور ہوا میں اڑتا ہوا اس کے



سامنے آ گیا اسی وقت تڑتا گویاں چلیں مجھے دائیں کندھے اور پیٹ میں گرم سلائیں محسوس ہوئیں میں زور سے زمین پر گراسر زمین سے ٹکراتے ہی ایک اور درد کی لہر اٹھی اور میرا دماغ جیسے سن ہو گیا۔

ہوش آیا تو ایک نرم سے بستر پر لیٹا تھا۔ دائیں بازو پر ڈرپ لگی تھی۔ بڑا سا کمرہ تھا پاس ہی ایک نرس کھڑی دیوار کی طرف کچھ دیکھ رہی تھی۔ یہ اتنا بڑا کمرہ یقیناً کسی اسپتال کا نہ تھا میں اٹھ کر بیٹھا تو سر چکرانے لگا۔ میں پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا کندھے اور پیٹ پر چھن کی تھی نرس نے محسوس کر لیا کہ میں ہوش میں آ گیا ہوں اس لئے وہ لیٹ کر میرے پاس آ گئی اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ بند آنکھوں سے بھی اس کا ہیولہ مجھے نظر آرہا تھا۔ اسے اپنے اوپر جھکے ہوئے محسوس کرتے ہی میں نے آنکھیں کھول دیں اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے میری طبیعت کے بارے میں دو تین باتیں پوچھیں میں کچھ سوچ کر سر ہلا کر اطمینان کا اظہار کیا وہ سر ہاں میں ہلاتے ہوئے باہر نکل گئی اس کے جانے کے چند منٹ بعد اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر اور باڈی بلڈر ٹائپ آ دی جو کہ بڑی عمر کا تھا۔ بینڈم سم بہترین تراش خراش والا سوٹ پہنے اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے آہستہ سے سلام کا جواب دیا۔

”اب کیسا محسوس کر رہے ہو۔“

”ٹھیک۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر میرے اوپر جھک گیا۔ اس نے پٹی اتار کر کندھے اور پیٹ کے زخم دیکھے۔ ”ابھی کچھ دن تک تم..... چل پھر نہیں سکتے۔“ ڈاکٹر نے نرس کو اشارہ کیا تو وہ پٹی لگانے لگی۔

”لیکن میں ہوں کہاں۔“

”تم انہوں میں ہو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس بینڈم آ دی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں اس کا باپ ہوں جس کی تم نے اپنی جان پر کھیل کر جان بچائی ہے۔“ اس کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی نرس زیادہ تر میرے کمرہ میں ہی رہتی

تھی اور ڈاکٹر دو چکر لگا تا تھا صبح اور شام لیکن مس شاہینہ مجھے نظر نہ آ رہی تھی میں خود حیران تھا کہ جس کی میں نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے جان بچائی وہ تو شکریہ ادا کرنے تک نہ آئی میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کمرے کے دروازہ کو تاک کرتی اندر آئی میں اسے دیکھ کر آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا لیکن اس نے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اٹھنے سے روک دیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئی پھر باتوں باتوں میں اس نے بہت ہی اچھے انداز سے میری طبیعت کا پوچھا۔ میرا شکریہ ادا کیا۔ میں خود میں پھولے نہ سارہا تھا۔

”آپ کو کیسے احساس ہوا کہ وہ موٹر سائیکل سوار مجھ پر فائر کرنے لگے ہیں۔“ اس نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں جب ڈی موٹر سائیکل والے کو پانی سے اٹھا کر باہر لایا تھا تو مجھے سامنے سے آتے ہوئے وہ مشکوک موٹر سائیکل والے نظر آئے..... مشکوک اس لئے کہ ان کے چہرہ خراب سے ڈھکے تھے اور پچھلے کے ہاتھ میں پستول تھا جو کہ تیار حالت میں تھا اور وہ دونوں آپ کی طرف دیکھ رہے تھے تو میں۔“

میں نے بات ختم کی۔ ”اچھا اب وہ لازمی اور بہت ہی امپورٹنٹ سوال۔“ مس شاہینہ کی بات سن کر میں چونک گیا میرے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی۔

”آپ نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے میری جان کیوں بچائی۔“ آخر اس نے وہ سوال کر دیا جس سے میں بچ رہا تھا۔

”اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا اور ہو سکتا ہے کہ بھی نہ بتا سکوں۔“ میں نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے کھورنے لگی لیکن کہا کچھ نہیں تقریباً ایک ماہ تک میں نے بھرپور ریسٹ کی آخر دنوں میں چہل قدمی کرتے ہوئے اس محل کے بڑے سے لان میں پھولوں کی معطر فضا میں خوب سانس لیتا، میں اس محل سے لگنا تو جیسے بھول ہی گیا۔ میرے ذہن میں ہی نہ رہا کہ یہ میرا گھر

نہیں اور جب میں ٹھیک ہو گیا زخم بھر سے گئے تو اچانک مجھے جیسے یاد آیا کہ میرا انا بھی ایک گھر ہے تب میں نے سوچا کہ اب ان لوگوں کے سر سے اترا جائے دل تو کہہ رہا تھا کہ ڈھیسٹ بن کر مس شاہینہ کا دیدار کرتا ہی رہوں لیکن مروت بھی کچھ چیز تھی۔

اسی شام میں بصیر صاحب کے آنے کا انتظار کر رہا تھا مس شاہینہ کے والد بصیر صاحب۔ وہ شام کو میرے کمرہ میں آئے اور پاس بیٹھ کر طبیعت کے بارے میں پوچھا کیونکہ اب میں ٹھیک تھا۔ اسی لئے میں نے اسے سب اچھا ہی کہنا تھا اس کے بعد میں وہاں سے جانے کے لئے ان سے بات کرنے کے لئے مناسب الفاظ سوچ ہی رہا تھا کہ انہوں نے خودی بات شروع کر دی۔

”علی..... تم اپنے آپ کو یہاں کھٹی فیل نہ کرو..... جنہیں شاید احساس نہیں کہ تم نے ہماری بیٹی کی جان بچا کر ہم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے..... اب میں چاہتا ہوں کہ تم شاہینہ کے۔“ انہوں نے اتنا کہہ کر کچھ سوچا میرے دل کی دھڑکن متزلزل ہونے لگی۔ شاید شاید انہیں میرے دل کی بات پتا چل گئی ہو۔

”اب میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری بیٹی شاہینہ کے سیکرٹری پھر ایڈوائزر بن جاؤ کیونکہ وہ اس انکیشن میں ایم پی اے کے لئے لڑ رہی ہے۔“

”اوہ“ میرے منہ سے ایک لمبے سانس کے ساتھ نکلا۔ بصیر صاحب نے مجھے کچھ حیرت سے دیکھا۔

”گلتا ہے جنہیں اس بات کو جان کر حیرت ہوئی ہے..... میں اب اس پر لبا لپکھ تو نہیں دے سکتا لیکن بس اتنا کہوں گا کہ یہ انکیشن بہت مجبوری میں لڑنا پڑ رہا ہے اور تم یہ بھی سوچ رہے ہو گے کہ ہم نے جنہیں جانے بغیر اتنا بڑا فیصلہ کر لیا..... لیکن بلکہ میں نے تمہارے زخمی ہونے کے بعد تمہارے بارے میں پوری معلومات کر لی ہیں تم پر ہر لمحے ہولناقی لڑ کے ہو۔“

ہاں ماہینہ نہ کرنا بس تو ہوا کام سے ہی چراتے ہو۔“

ان کی یہ بات سن کر میں کسمسا کر رہ گیا اور وہ مسکراتے گئے۔

”میں نے پہلی ہی کہا تھا کہ ماہینہ نہ کرنا۔“

”اُس اوکے سر۔“ میرے منہ سے اتنا ہی نکلا۔ ”تم اس بارے میں خوب سوچ لو اگر تمہیں یہ آفر اچھی لگے تو تنخواہ اور رہائش وغیرہ کے بارے میں بات کر لیں گے۔“

اس کے بعد وہ مجھے آرام کرنے کا کہہ کر وہاں سے چل دیئے۔

وہ رات مجھے نیند نہ آ رہی تھی نہیں کہ میں اس آخر کے بارے میں غور کر رہا تھا بلکہ یہ آفر تو میں نے بصیر صاحب کے جانے کے بعد ہی قبول کرنے کا سوچ لیا تھا۔ مجھے تو مس شاہینہ کے ساتھ ایک بہترین وقت گزارنے کا موقع مل رہا تھا۔ میرے ذہن میں یہ سوچ تھی کہ وہ کون سی ایسی مجبوری تھی جس کی وجہ سے مس شاہینہ کو انکیشن میں حصہ لینے کو ضروری تھا۔

رات آدھی گزر رہی تھی کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی، میری آنکھیں بوجھل ہو کر بند ہونے لگیں کہ اچانک مجھے لگا کہ کھڑکی کے سامنے سے کوئی سایہ لہرایا ہو جیسے آہستہ آہستہ میں نیند کی وادی میں جا رہا تھا اسی طرح آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا اور پھر کھڑکی پر جا کر باہر دیکھنے لگا میری نظریں لان میں گردش کر رہی تھیں۔

مس شاہینہ کے کمرہ کی دیوار کے باہر ہی مجھے وہ سایہ کھڑا نظر آیا۔ میں نے جلدی سے کھڑکی کھولی اور اس میں سے اتر کر باہر کود گیا۔ میرے قدم زمین پر نکتے ہی ہلکی سی تھپ کی آواز آئی۔ اس سایہ نے پھر بھی میری طرف پلٹ کر نہ دیکھا سیدھا ہوتے ہی میں اس کی طرف دوڑ پڑا گھاس تھا۔ اور میں جیسے پاؤں اسی لئے بھاگنے سے عجیب سی دھمک پیدا ہو رہی تھی لیکن وہ سایہ اسی طرح مس شاہینہ کی کھڑکی کے سامنے مجھ سے بے پرواہ کھڑا تھا۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر اس پہ چھلانگ لگادی لیکن مجھے ایک حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میں اس سایہ میں سے اڑتا ہوا گھاس پر جا گر۔ وہ حقیقت میں سایہ ہی تھا لیکن کس کا، میں نے ادھر ادھر دیکھا مجھے وہاں کوئی آدی نظر نہ آیا جس کا وہ سایہ ہو۔ پھر میں نے جلدی

سے اس سایہ کی طرف دیکھا جو مسلسل مس شاہینہ کی کھڑکی پر نظر پڑا۔ جھانپ کر اٹھا میرے جسم سے ٹھنڈا پسینہ نکلنے لگا۔ اس سایہ کی کسی آدمی کے بغیر یہاں موجودگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے کوئی یاد دلائی پھر لگ رہا تھا۔ میرے دل پر ایک ہیبت سی ڈیرہ ڈالنے لگی۔ مجھے ایسا لگا کہ بس ابھی سانس رک جائے گا۔ میں پیچھے کی طرف گرنے لگا۔ میرے منہ سے جیسے خود بخود نکلا۔ ”لا حول ولا قوہ“ اور اس کے فضا میں بلند ہوتے ہی اس سایہ نے میری طرف سر گھمایا، میری زبان پہ ورد جاری رہا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ غائب ہو گیا۔ میرے منہ سے کھٹی کھٹی چیخ نکلی، میں ہیبت سے پیچھے الٹ کر گر پڑا، جانے کتنی دیر میں بے سدھ سالان کے گھاس پہ پڑا تھا۔

ادھر صبح کی آذان ہوئی اور ادھر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں اس لان میں بے یقینی سے اپنے آپ کو دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو دیکھا وہ واقعی میں تھا یا کوئی خواب تھا یہ سوچتے ہوئے میں وہاں سے چلتے ہوئے کمرہ میں آ کر بیٹھ کر گر گیا۔ وہ سایہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے لہرا سا جاتا اور پھر میں نیند کی گہری وادی میں چلا گیا۔

اور جب میں اٹھا تو دوپہر گزر رہی تھی، ملازم ناشتہ کا پیہ کرنے آیا تو میں دوپہر کا کھانا اور ساتھ میں چائے منگوا لی۔ اس کے کھانا لانے تک میں فریض ہو گیا۔ کھانے کے برتن اٹھاتے وقت ملازم نے بتایا کہ بصیر صاحب صبح سے دو تین دفعہ یاد کر چکے ہیں، میرے ذہن میں فوراً رات والا واقعہ پھر نے لگا جانے وہ کیا تھا کیوں تھا کس لئے تھا ملازم جب چلا گیا تو میں بصیر صاحب اور مس شاہینہ کے بارے میں سوچنے لگا جو کہ یقیناً میرے جواب کے منتظر ہوں گے۔ مجھے تو اپنی خواہش پوری ہوتی نظر آ رہی تھی لیکن ان لوگوں کو مجھ سے بہت بہتر ایسے لوگ مل سکتے تھے جو کہ سیاست میں چلتے پھرتے پڑے تھے اور وہ ایک بہترین منیجنگ پرائن کے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے جبکہ مجھے

سیاست کی شہ بد ہی نہ تھی تو پھر یہ لوگ میرا ہی انتخاب کیوں کرنا چاہتے تھے کیا اس لئے کہ میں نے مس شاہینہ کو بچانے کے لئے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی یا پھر ان بڑے لوگوں کو قربانی کے لئے ایک بکرے کی ضرورت تھی میں تو بکرہ بھی ایسا تھا کہ جس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ میرے گمشدہ کسی قسم کی چوہن میں پھنسنے کے بعد ایسا کوئی نہ تھا جو کہ میرے بارے میں پوچھتا چھ کرنا نہیں پر مجھے ایک بات یاد آگئی جس کا احساس مجھے اتنی شدت سے ہوا کہ میں بصیر صاحب سے ملنے ہی اس بارے میں پوچھ گیا کہ جب مس شاہینہ پر سر عام گولیاں چلیں جو کہ میں نے اپنے جسم پر کھائی میں تو لازماً پولیس کیس بھی بنا ہوگا مجھ تک پوچھتا چھ کے لئے کوئی پولیس والا نہیں آیا اور وہ آدمی کون تھے جو کہ مس شاہینہ کو مارنا چاہتے تھے۔ میرے ان سب سوالوں کا بصیر صاحب کے پاس ایک جواب تھا وہ دونوں موٹر سائیکل سوار پولیس والوں کو موٹر سائیکل کے ساتھ ہی ایسی حالت میں ملے کہ کسی نے انہیں قتل کر کے ان کی شناخت منہ کر دی تھی اور موٹر سائیکل چوری کی تھی پولیس تفتیش کر رہی ہے جلد ہی کوئی نتیجہ سامنے آئے گا میں ان کے اس جواب پر مطمئن نہ تھا۔ لیکن کبھی کیا سکتا تھا۔

میں نے بصیر صاحب کو مس شاہینہ کے ایڈوائزر کے طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔ بصیر صاحب میرے اس فیصلے پر بڑے خوش لگ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے مس شاہینہ سے ملوایا اس نے بھی میرے اس فیصلے کو سراہا۔ بصیر صاحب ہم دونوں کو وہاں بیٹھا چھوڑ کر اٹھ گئے۔ میں مس شاہینہ کے بے داغ چہرے کو غور سے دیکھ کر رات کے واقعہ کے بارے میں سوچنے لگا تو وہ بالکل ہشاش بشاش تھی اس کا مطلب تھا کہ ابھی اس کا اس سایہ سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

”علی تمہارے ذہن میں اس بارے میں بہت سے سوالات ہوں گے کہ سیاست میں تو کتنے ہی ایڈوائزر ہوں گے کتنے ہی کل پڑے ہوں گے تو ہم نے تم کو ہی کیوں رکھا..... اس کا آسان سا ہی میرے

پاس جواب ہے کہ میں کسی پہلے سے سیاسی آدمی کو رکھنا ہی نہیں چاہتی۔ کیونکہ وہ لوگ اپنے فائدہ کے لئے مجھے ہر طرح کے داؤ بیچ سکتا میں گے اور چاہے میں جتنا بھی بچوں ان کے داؤ بیچ میں آخر آ جاؤں لی اس لئے میری خواہش تھی کہ میرے ایڈوائزر کے طور پر کوئی نیا لیکن بڑھا لکھا اور سمجھ دار بندہ ہونا چاہئے..... تمہارا تعلق سیاست سے نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ تم ہر آنے والے مشکل وقت میں مجھے بہترین گائیڈنس دے سکتے ہو۔“

مس شاہینہ کی باتیں سن کر میں خوشی سے پھول سا گیا۔ میرے ذہن سے خدشات کی گرد کچھ کم ہوئی۔ ہم سب نے رات کا کھانا ساتھ کھایا اس کے بعد میں اجازت لے کر اپنے کمرہ میں آ گیا۔ بیڈ پر لیٹ گیا لیکن دن بھر سونے کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میری آنکھیں کھڑکی کے شیشوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ مجھے اسی سایہ کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے میں نے اپنے لئے چائے منگوا لی۔ ملازم کو قہر ماس میں لانے کا کہا تاکہ رات جب بھی طلب ہو آسانی سے بی لوں۔ ایک بجنے والا تھا میری ٹاچ ہین منظر انداز میں کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں کہ اچانک کوئی کھڑکی کے سامنے سے گزر گیا۔ میں چونک کر اٹھا اور کھڑکی کے پٹ کھول کر ادھر سے ہی باہر جس طرف کوئی گیا تھا دیکھا وہ ہی سایہ درمیانی اسپید سے چلتا ہوا مس شاہینہ کے کمرہ کی کھڑکی طرف جا رہا تھا۔ میں پھولوں کے پودوں کے ساتھ چھپتا ہوا اس کے پیچھے جانے لگا۔ اب وہ سایہ کھڑکی کے عین نیچے کھڑا کھڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں پودوں کے ساتھ چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔

اسی وقت سایہ کھڑکی کی طرف بڑھا میں اس کے انداز سے چونک اٹھا کیونکہ اس نے بھاگنے والے انداز میں دو اسٹپ لئے اور جب لگا کھڑکی پر چڑھ گیا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندر آ گیا۔ میں پھولوں کے ساتھ حیرت سے کھڑا بیٹھا رہ گیا۔ قریباً پانچ منٹ سے زیادہ مجھے ادھر ہی حیرت زدہ گھڑے ہوئے تو میں ایک لمبا سانس لے کر شش و پنج

میں مبتلا اس کھڑکی کی طرف بڑھا۔ کھڑکی کے پٹ بند تھے جبکہ میں نے خود کھلی کھڑکی سے اس سایہ کو ادھر کودتے دیکھا تھا میں اس کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن اوپر لٹک کر اس میں سے جھانکنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی میں سوچ میں پڑ گیا کہ اندر دیکھوں یا چپ چاپ واپس اپنے کمرہ میں چلا جاؤں۔

اچانک میں نے اندر دیکھنے کا فیصلہ کر لیا اور لپک کر ایک جھپ لگایا اور کھڑکی کے اوپر بنے چھپنے کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر اندر جھانک کر شیشوں سے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرہ میں چھوٹا بلب جل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے پورے کمرہ میں جہاں تک ان شیشوں سے نظر آتا تھا دیکھا لیکن وہ سایہ مجھے نظر آیا اور پھر میری نظر سامنے دیوار کے ساتھ پڑے بیڈ پر پڑی میں چونک اٹھا بیڈ پر مس شاہینہ کے ساتھ کوئی تھا وہ دونوں آپس میں کھل کے اندر تھم گئے تھے۔ میں اس طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک ان میں سے ایک کے سر پہ سے کھل پٹا کہ مجھے دیکھا اس کے دیکھتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا اور میرے ہاتھ مجھے سے چھوٹ گئے میں بیٹھ کے بل زمین پر گر امیرا جسم جھنجھٹا اٹھا۔ میرا دماغ حیرت کے شکنجے میں تھا کیونکہ میری طرف دیکھنے والا سو فیصد وہ سایہ ہی تھا۔ میں نے جو کچھ اندر دیکھا تھا اس کے بعد تو میری وہاں سے اٹھنے کی ہمت ہی نہیں ہو پارہی تھی۔

میں آج بھی بے سدھ سا بڑا رہا جیسے کہ زمین نے مجھے اپنے ساتھ چپکایا ہو۔ صبح کی اذان ہوئی تو میں اٹھ کر اپنے کمرہ میں جا کر سو گیا لیکن صبح دس بجے مجھے اٹھا دیا گیا کیونکہ سیاسی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں میں نے مس شاہینہ کی طرف کئی بار غور سے دیکھا لیکن وہ بالکل ہشاش بشاش اور ہر گز سے جیسے آزاد تھی۔

میٹنگ اور پھر کچھ فنکشن اینڈ کرتے رات کے دس بج گئے واپس آ کر کھانا کھاتے ہی میں اپنے کمرہ میں چلا گیا آج پھر میں اسی سایہ کا انتظار کرنے جا رہا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ یہ پتھر کیا ہے۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا بیڈ

پر لیتے لیتے اٹھ آئے گی۔ جاسنے کی بہت کوشش کی لیکن آگھیں بند ہونے لگیں پولیس پوچھیں ہوئیں۔

مجھے ایسا لگا کہ کمرہ میں کوئی نہیں رہا ہو میں نے زور لگا کر آگھیں کھول دیں وہ سایہ مجھے اپنی طرف بڑھتا نظر آیا میری زبان پیاک دم سے آیا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ اچانک مڑ کر بھاگا کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن وہ رک نہیں اور بند دروازہ سے پار ہو گیا، میں اٹھ کر حیرت سے بیڑ پر بیٹھ گیا میں نے سوچ لیا کہ بصیر صاحب سے اس سایہ کے بارے میں بات کروں گا میرے خیم میں اس سایہ کو دیکھتے ہی سنسنی پھیل جاتی تھی اس کے جانے کے بعد بھی دماغ کسی بھی سوچ سے خالی رہتا تھا لیکن اس رات میں اس کے جانے کے بعد اس کا قلع قمع کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا اور اس کے لئے بصیر صاحب کو اعتماد میں لیاں بہت ہی ضروری تھا لیکن.....

جب میں نے بصیر صاحب سے اس بارے میں بات کی تو وہ مجھے یہ یقینی سے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری عقل پہ یقین نہ رہا ہو پھر بھی انہوں نے میری بات مکمل سنی اور پھر اگلی رات میرے ساتھ ہی اس سایہ کو دیکھنے کے لئے تیار بیٹھے تھے کہ وہ سایہ میری کھڑکی کے سامنے سے گزرتا نظر آیا میں نے بصیر صاحب کو مخاطب کر کے جو کہ میری طرف دیکھ رہے تھے اس سایہ کی طرف متوجہ کیا اور اٹھ کر کھڑکی سے کود کر باہر نکل آیا بصیر صاحب بھی میرے پیچھے آہستہ سے اترے، میرا رخ اس سایہ کی طرف تھا جو کہ آہستہ آہستہ مس شاہینہ کی کھڑکی طرف بڑھ رہا تھا، میں نے بصیر صاحب کو اس طرف اشارہ کر کے سایہ دکھانے کی کوشش کی انہوں نے میری انگلی کی سیدھ میں اس طرف غور غور سے دیکھا شروع کر دیا روشنی کم ہی لیکن اتنا اندھیرا بھی نہ تھا کہ وہ سایہ ان کو نظر نہ آتا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے آج پھر سایہ کھڑکی سے لٹک کر اندر چلا گیا میں نے بصیر صاحب کو اس کھڑکی تک لے جانا چاہا لیکن انہوں نے مجھے بازو سے

پکڑا اور گیلری سے چلتے ہوئے مس شاہینہ کے کمرے کے سامنے پہنچ کر دروازہ کھٹکنا ڈالا۔ مس شاہینہ تیسری دفعہ دروازہ کھینچ کر آواز دیتی آئی اور دروازہ کھول دیا۔ بصیر صاحب نے اس سے استفسار کیا لیکن اس نے ایسے جواب دیا جیسے کہ وہ حقیقت میں اس سایہ سے بے خبر ہے میں بھی اس کا مضبوط لہجہ سن کر حیران رہ گیا۔

اسی لئے میں نے چپ سادھ لی کیونکہ بصیر صاحب کو وہ سایہ نظر نہیں آیا تھا۔ اور مس شاہینہ سرے سے ہی کمرہ گئی تھی اس نے کسی سایہ کے بارے میں جاننے سے صاف انکار کر دیا تھا اس کے بعد دو دن تو ان باپ بیٹی نے مجھے بلایا تک نہیں اور تیسرے دن بصیر صاحب ایک محزون سے شخص کو لے کر میرے کمرہ میں آگئے انہوں نے اس آدمی کا تعارف ایک قریبی دوست کی حیثیت سے کرایا اور میرا بھی تعارف کرا کر چلے گئے۔ وہ آدمی مجھے پہلے تو سیاست کے داؤ بیچ کے بارے میں بریفنگ دینے لگا اس کی معلومات میرے لحاظ سے کمپیٹ معلومات تھیں میں بھی اس سے مکمل مل گیا اور ان چند دنوں میں مختلف فنکشن میں لوگوں میں گھوم پھر کر جو معلومات سیاست کی لی تھیں وہ بتانے لگا باتوں ہی باتوں میں اس نے اچانک کہا۔

”بصیر صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہیں اس کوئی میں کوئی سایہ نظر آتا ہے۔“

میں اس کی بات سن کر چونک اٹھا لیکن چونکہ یہ گپ شب ایک دوستانہ ماحول میں ہو رہی تھی اسی لئے میں نے پہلی رات سے جو سایہ مجھے نظر آیا تھا اس رات سے لے کر آج رات کے سایہ کے مس شاہینہ کے کمرہ میں کھڑکی سے داخل ہونے تک بتایا۔ وہ اسی طرح گپ شب لگاتے اٹھ گئے۔

اسی رات میں نے اس طرف کے سیکورٹی گارڈ کو اپنے ساتھ تیار کیا پہلے تو وہ ڈرتا رہا کہ بصیر صاحب کو پتہ چلا تو وہ نوکری سے فارغ کر دیں گے۔ آخر میرے اعتماد دلانے پر وہ تیار ہو گیا۔ کیونکہ وہ مجھے اس کوئی میں ایک خصوصی مہمان کے طور پر جانتا تھا۔

رات کے ایک بجتے ہی وہ سایہ کوئی کی بڑی دیوار سے برآمد ہوا۔ میں سیکورٹی گارڈ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ میں اسے دیکھتے ہی الرٹ ہو گیا اور سیکورٹی گارڈ کو الرٹ کیا وہ میرے ساتھ ہی اس کوئی سے نکلا اور ہم آگے پیچھے اس سایہ کے تعاقب میں چل دیئے۔ ”سردہ سایہ کدھر ہے۔“

سیکورٹی گارڈ کی بات سننے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا سایہ تو ہمارے سامنے ہی ناک کی سیدھ میں ایسے چارہ تھا جیسے کہ کوئی آدمی نیند میں چل رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر غور سے اس گارڈ کو دیکھا میرے اچانک یوں پلٹ کر دیکھنے سے وہ کنفیوز ہو گیا اور گڑبڑا کر بولا۔ ”وہ سرجی سایہ مجھے نظر نہیں آ رہا۔“

میں اس کی بات سن کر حیران رہ گیا میں نے اس سے ٹارچ لی اور احتیاط سے دو دفعہ جلا کر اس سایہ پر ڈالی اس سایہ نے پلٹ کر دیکھا میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”لا حول ولا قوۃ“ ان الفاظ کا فضا میں گونجنا ہی تھا کہ وہ سایہ غائب ہو گیا۔ سیکورٹی گارڈ بھی بصیر صاحب کی طرح اس سایہ کو دیکھ نہ پایا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بصیر صاحب ذرا بڑی عمر کے ہیں تو ان کی نظر کچھ کمزور ہو لیکن اس سیکورٹی گارڈ کو بھی وہ سایہ نظر نہ آیا تو میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اس گارڈ کو واپس اس کی ڈیوٹی پر جانے کا کہا اور خود اپنے کمرے میں جا کر اس سارے جکر کے بارے میں سوچتے ہوئے گہری نیند میں چلا گیا۔

دوسری شام ایک قریبی جیس سوٹ والا میری عمر سے کچھ بڑا آدمی بصیر صاحب کے ساتھ نظر آیا۔ بصیر صاحب نے پہلے اس کا تعارف کرایا وہ بھی سیاست کا ایک چلتا پھرتا پرزہ تھا۔ پھر انہوں نے میرا تعارف کرایا تو اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”اچھا اچھا تو یہ ہیں..... علی صاحب۔“ مجھے اس کا لہجہ بڑا ناگوار گزر گیا لیکن میں چپ رہا۔ بصیر صاحب نے بھی اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ نیچے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ نیا آنے والا آدمی مس شاہینہ

کے ساتھ نظر آنے لگا۔ بصیر صاحب اور مس شاہینہ مجھے انور کرنے لگے اب رات کو وہ سایہ میرے ارد گرد نظر آنے لگا۔ میرے اندر ڈر بیدہ کرنے لگا۔ میرا دماغ جھنجھٹنے لگا۔ اور وہ نیا پرزہ آتے جاتے مجھ پر طنز کے تیر برسائے لگا۔

ایک دن میرے ممبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے اس کے ساتھ ہاتھ پائی کی مجھے بڑی مشکل سے قابو کیا گیا۔ میرا دماغ بہت ہی گرم تھا۔ میں بصیر صاحب کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھ تو گیا لیکن میرا دماغ سلگ رہا تھا مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس نے آدمی کو میری جگہ رکھ لیا گیا ہے۔ شاید اس سایہ والے واقعہ پر میری ذہنی صحت پر شعبہ کیا جا رہا تھا۔ اچانک بیٹھے بیٹھے میں اٹھ کھڑا ہوا اور شور مچانے لگا۔ جو کچھ ہاتھ میں چڑھا اور دھر پھینکنے لگا۔ سیکورٹی گارڈ آگئے مجھے قابو کر کے باندھ دیا گیا جانے کہاں سے اب ڈاکٹر وارد ہوا اور مجھے داکٹر بازو پر انجکشن لگا دیا انجکشن لگنے کے بعد مجھے نیند آگئی شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا میری دھندلی آنکھوں کے سامنے وہ سایہ کھڑا جیسے مجھ پر ہنس رہا تھا۔

مجھے ہوش ایک سلاخوں والے کمرے کے اندر آیا میں فرش پر چبھی چادر پر لیٹا تھا اس کمرہ میں اکیلا تھا میرے حواس کام کرنے لگے تو مجھے سمجھ آئی کہ وہ پاگل خانے کا ایک کمرہ تھا میں اہنا سر پیٹ کر رہ گیا میں اٹھائی تھا کہ وہ سایہ سلاخوں کے ساتھ آ کھڑا ہوا اور مجھے گھورنے لگا۔ فضا میں عجیب سی سنسنیٹ ہو رہی تھی جیسے کہ وہ کچھ بول رہا ہو میں نے غور سے سننے کی کوشش کی تو مجھے سمجھ آیا کہ وہ کہہ رہا تھا۔

”وہ صرف میری ہے۔“ اب مجھے پتہ چلا کہ مس شاہینہ اتنی خوب صورت اور مالدار ہونے کے باوجود بھی ابھی تک کنواری کیوں تھی کیونکہ اس کا عاشق ایک سایہ تھا جو کس اس پر مکمل چھایا ہوا تھا۔





برس ہا برس سے پراسرار قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے سرگردان انسانوں کی پراسرار ہولناک داستان حیرت، قدم قدم پر سحر جادو اور عملیات کی حیرت انگیز مناظر پڑھنے والوں کو انگشت بدنہاں کر کے اچنبھے میں ڈال دیں گے، ایک بالکل نئے طرز کی حیرت ناک دلوں پر دھشت طاری کرتی کہانی۔

ایک ناپیدہ اور پراسرار سستی کی ہولناک رودادوں کی دھڑکنیں تیز کرنے والا سلسلہ

سے سردار کے بارے میں پوچھا تھا۔

میں نے سر ہلادیا، جلد ہی بوڑھے مارون کی واپسی ہوئی، اور وہ ہمیں اندر لے گیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس جھوٹے میں بھی کمرے بنے ہوئے تھے سامنے ہی دوسرے کمرے کا دروازہ تھا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔

اس کمرے میں ضروریات زندگی کا سامان موجود تھا۔ میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا، عین اسی وقت میری نگاہ دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی اور میں بری طرح چونک اٹھا۔

میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ دیان میری کیفیت سے واقف نہیں تھا، اس نے مجھے آواز دی۔

”اے گھیل..... دروازے پر کیوں کھڑے ہو.....؟ اندر آ جاؤ۔“

”اے..... ہاں.....!“ میں چونک کر بولا۔

اسی تصویر کو دیکھتا ہوا میں ان دونوں کے قریب آ گیا۔ دیان نے فوراً ہی ادھیڑ عمر شخص سے میرا تعارف کروایا۔

”یہ میرا دوست گھیل ہے..... یہ خانہ بدوشوں کی

میں ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا، البتہ دیان کے منہ سے نکلے ہوئے ان لفظوں کا اثر یہ ہوا کہ تھوڑی دیر بعد ہی جھوٹے کمرے کا پردہ ہٹا اور ایک بوڑھا سا آدمی دکھائی دیا۔

اس کے سر اور داڑھی کے بے تحاشہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور تقریباً سارے ہی سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر جھرمیاں تھیں اور آنکھیں قدرے اندر کو ہنسی ہوئی تھیں۔

”ملاگا.....؟“ دیان نے سوالیہ انداز میں پوچھا تھا۔ بوڑھے نے اشیات میں گردن ہلائی اور واپس اندر چلا گیا۔ اب دیان میری طرف مڑا۔

”یہ ہماری علاقائی زبان ہے..... اس بوڑھے کا نام مادون ہے..... اسے کوئی اور زبان نہیں آتی، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس نے کوئی اور زبان سیکھی ہی نہیں..... یہ میرے ماموں یعنی سردار کا خاص خادم ہے..... بے چارہ گونگا ہے۔“

”اوہ.....!“ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں.....“ دیان مسکرایا۔

”شاید اسی وجہ سے یہ کوئی اور زبان نہیں سیکھ سکا..... اسے اردو بالکل سمجھ نہیں آتی.....“ میں نے اس

زندگی پر مضمون لکھنا چاہتا ہے۔ اس لئے ہماری بستی میں آیا ہے۔ یہ ہم لوگوں کی طرز زندگی کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔

”بہت خوب۔۔۔۔۔“ سردار نے یہ کہہ کر میری طرف مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔  
اس کے چہرے پر ایک شفیق سی مسکراہٹ عود کر آئی تھی، میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔  
اب دیان نے کہا۔

”اور یہ میرے ماموں ہیں۔۔۔۔۔ اس بستی کے سردار بھی ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز رکھا ہوا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔! میں نے کہا۔  
”تم لوگ بیٹھو۔۔۔۔۔“ سردار کی آواز کافی بھاری تھی۔  
”میں مہمان کے لئے خاطر تواضع کا انتظام کرتا ہوں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے ماموں۔“ دیان نے کہا۔  
”میں اسے بستی کی سیر کروانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے آپ کی اجازت کی ضرورت ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ بالکل۔“ سردار فوراً بولا۔  
”کھلیں جب تک چاہے اس بستی میں رہ سکتا ہے اور جہاں چاہے گھوم سکتا ہے میری طرف سے اجازت ہے۔“

”شکریہ۔۔۔۔۔“ دیان کے منہ سے نکلا۔  
میں نے بھی سردار کا شکریہ ادا کیا، پھر دیان نے مجھے باہر نکلنے کا اشارہ کیا، میری نظریں بے اختیار دیوار پر لگی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔۔۔۔۔ پھر میں بھی دیان کے ساتھ جو نیپڑے سے باہر نکل آیا۔

میں بہت بے چین تھا، دیان نے اس بات کو محسوس کر لیا اور بولا۔

”کیا ہوا؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“  
”ہاں دیان۔۔۔۔۔ میں نے مثالا کو دیکھا ہے۔“  
وہ چلتے چلتے رک گیا اور میری طرف دیکھنے لگا۔  
”کہاں؟“

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔! میں بولتے بولتے رک گیا۔  
”ہاں۔۔۔۔۔ کہو۔۔۔۔۔ رک کیوں گئے۔۔۔۔۔؟“ دیان نے کہا۔

”اس کی تصویر۔۔۔۔۔ میں نے سردار کے گھر میں دیکھی ہے۔“ میرے منہ سے نکلا۔  
دیان غور سے مجھے دیکھ رہا تھا پھر یک بیک ہنس پڑا اور بولا۔

”کیا تم مجھ سے مذاق کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“  
”نہیں دیان۔“ میں نے حیرت سے کہا۔  
”میں بھلا مذاق کیوں کروں گا۔“  
”اچھا۔۔۔۔۔ تو پھر میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔“

”کیا؟“  
”جس کی تصویر تو تم مثالا کا نام دے رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ سردار کی بیٹی کی تصویر ہے۔“ دیان نے کہا۔

”جہیں یاد ہے جب تم مجھے مثالا کا حلیہ بتا رہے تھے تو میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یاد ہے۔“  
”دراصل میں اس وقت خود بھی یہی کہنا چاہ رہا تھا کہ تم عروا کا حلیہ بتا رہے ہو۔“

”عروا۔۔۔۔۔؟“  
”ہاں۔۔۔۔۔ وہ مثالا نہیں بلکہ عروا کی تصویر ہے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔!“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ میں بے تاب سے اس کی شکل دیکھ رہا تھا، اس وقت اس کا خاموش ہو جانا مجھے بری طرح کھلنے لگا۔

جب وہ چپ ہی رہا تو مجھے کہنا پڑا۔  
”بولو۔۔۔۔۔ تم رک کیوں گئے۔۔۔۔۔؟“  
”پہلے تم یہ بتاؤ کہ کیا واقعی وہ تصویر تمہاری مثالا کی طرح ہے۔۔۔۔۔؟“

”ہو۔۔۔۔۔ بلکہ سو فیصد۔۔۔۔۔“  
”ہوں۔۔۔۔۔!“ دیان نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا۔

”یہ تو۔۔۔۔۔ بہت ہی عجیب سی بات ہے۔“  
”تم مجھے پہیلیاں کیوں بھجوا رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ میں جھلا سا گیا۔

”صاف صاف بتاؤ۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ چندا نے اس کا نام غلط لیا ہو۔۔۔۔۔؟“  
”چندا تو عروا سے مل ہی نہیں سکتی۔۔۔۔۔ نام کیسے لے سکتی ہے۔“

”کیا سردار کی بیٹی یہاں نہیں رہتی۔۔۔۔۔؟“  
”ہاں۔۔۔۔۔“  
”تو پھر۔۔۔۔۔ وہ کہاں ہوتی ہے۔۔۔۔۔؟“

”دوسری دنیا میں۔۔۔۔۔“ دیان نے انکشاف کیا۔  
”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟“  
”مطلب یہ ہے کہ عروا کو مرے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں۔۔۔۔۔ اس کی تصویر تو یادگار کے طور پر سردار نے اپنے کمرے میں لگا رکھی ہے۔“

”یہ سن کر میں سائلے میں آ گیا۔  
کافی دیر تک میں گم سم رہا، پھر میرے منہ سے نکلا۔

”یہ۔۔۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“  
”میں کچھ کہہ رہا ہوں۔“ کھلیں بولا۔  
”عروا ایک حادثے کا شکار ہو گئی تھی، میرے ماموں یعنی سردار کو اس سے بہت محبت تھی، کیونکہ عروا کے پیدا ہونے کے دوسرے سال ہی عروا کی ماں چل بسی تھی۔۔۔۔۔ تب سے ہی میرے ماموں نے اسے باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا پیار بھی دیا تھا۔۔۔۔۔ لیکن پھر عروا بھی ان کا ساتھ نہ دے سکی اور میرے ماموں اب تنہا ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے دوسری شادی بھی کرنا گوارا نہیں کیا۔۔۔۔۔ اپنی بیوی اور بیٹی کی یاد میں اکثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔“ وہ بولے جا رہا تھا اور میری حالت عجیب سی تھی۔ اب تو خود میرا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ میں رونا شروع کر دوں۔

”یہ سب کیا تھا۔۔۔۔۔ مثالا تو مجھے چندا کے ساتھ دکھائی دی تھی اور میں پہلی نظر میں ہی اسے اپنا دل دے

بیٹھا تھا۔۔۔۔۔ پھر مثالا کا وجود سرے سے ہی غائب ہو گیا اور اس کی جگہ عروا نے لی، لیکن عروا تو بقول دیان کے اب اس دنیا میں ہی نہیں تھی۔ تو پھر۔۔۔۔۔ جس سے میری ملاقات ہوئی تھی وہ کون تھی۔۔۔۔۔؟

”اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا، میں نے دیان کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا اور بولا۔

”سنو دیان۔۔۔۔۔ میرے ذہن میں ایک بات آ رہی ہے۔“  
”کیا۔۔۔۔۔؟“  
”ہو سکتا ہے کہ مثالا تمہارے ماموں کی بیٹی کی ہم شکل ہو۔“

”یہ بات ممکن نہیں ہے۔“  
”کیوں۔۔۔۔۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔“  
”خود سوچو۔۔۔۔۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو کیا سردار کو یا مجھے اس کا علم نہ ہوتا۔۔۔۔۔؟ سردار تو اسے اس کے گھر والوں سے مانگ کر اپنے ساتھ ہی رکھ لیتا، تا کہ اسے عروا کے بدلے میں اپنی بیٹی بنا سکے۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ یہ بات تو ہے۔۔۔۔۔ میں نے سر ہلایا۔  
شاید میں بہت زیادہ الجھ گیا ہوں، اس لئے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں سوچو رہی۔۔۔۔۔ اور اب میرا خیال ہے کہ اس بستی میں مثالا کی تلاش بھی فضول ہے کیونکہ اگر وہ عروا کی ہم شکل ہے تو اس صورت میں تو وہ مشہور ہوتی۔۔۔۔۔ یہ کسی کو اس کے بارے میں پتا ہوتا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ تو ہے۔۔۔۔۔“ دیان نے کہا۔  
”عروا کو اس بستی کا بچہ بچہ جانتا ہے۔“  
”بس تو پھر میں مثالا کے خیال کو اس بستی میں دفن کر دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔  
”میرا خیال اب یہ ہے کہ میں نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔۔۔۔۔ میں جا رہا ہوں دیان تمہاری مدد اور خلوص کا بہت بہت شکریہ۔“  
”یہ کہہ کر میں نے اپنا رخ بدل لیا۔

”ارے..... کہاں جا رہے ہو.....؟“ دیان نے چونک کر پوچھا۔  
”میں واپس جا رہا ہوں.....“ میں نے دکھ بھرے انداز میں کہا۔  
”میرا اب یہاں رکنا فضول ہے کیونکہ مجھے مثالا نہیں ملے گی..... یہاں رک کر میرا دل مزید پریشان اور مایوس ہوگا اس لئے میں جا رہا ہوں۔“  
”چلو..... پھر میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔“  
”نہیں دیان..... میں چلا جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔  
”تم صبح سے میری وجہ سے خواہ خواہ پریشان ہو..... اب تم یہیں رہو اور آرام کرو..... میں چلا جاؤں گا۔“  
دیان نے کافی اصرار کیا تھا، لیکن میں نے اسے دوبارہ اپنے ساتھ لے جانا مناسب خیال نہیں کیا۔ کیونکہ وہ پہلے ہی میری وجہ سے دوپٹہ لگا چکا تھا۔ چنانچہ اسے میں نے سمجھا بھگا کر وہیں روکا اور ہستی سے باہر نکل آیا۔  
یہ حقیقت تھی کہ اس وقت میرا عجیب حال تھا..... دل چاہ رہا تھا کہ اسے گھر کی طرف جانے کے بجائے اسی جنگل میں کسی طرف نکل جاؤں۔  
کیا زندگی تھی.....؟ بچپن سے لے کر اب تک نہ جانے کس گرداب میں پھنسا ہوا تھا..... آقا قیلے کے زیر سایہ میں پروان چڑھا..... وہ قبیلہ..... جو جاوڑوٹھنے اور کالے لٹم کا ماہر تھا..... لیکن میرے باپ کے مرنے کے بعد اس قبیلے کا نہ تو کوئی نام بچا تھا اور نہ ہی کوئی اس علم کو آگے بڑھانے والا تھا۔ کیونکہ میں تیرہ کرچکا تھا کہ اس کالے دھندے کوگی اپنے آباؤ اجداد کے ساتھ ہی زمین میں دفن کر دوں گا۔  
وہ لوگ خون اور نسل کی بنا پر میرے لئے قابل احترام تھے..... لیکن ان ہی کی بدولت نہ جانے کتنے گھر اجڑے ہوں گے..... نہ جانے کتنے انسانوں کا سکون تباہ ہوا ہوگا..... کیا یہ غلط نہ تھا۔  
یہ سب باتیں مجھے رحیم بابا نے بتائی تھیں..... چنانچہ مجھے اسی وقت اپنے قبیلے سے نفرت ہو گئی تھی۔

لیکن یہ نفرت صرف ان لوگوں کے پیشے کی حد تک تھی..... مجھے پالنے پوسنے اور جوان کرنے میں جو میرے باپ کا احسان تھا وہ اب بھی میرے سر آنکھوں پر تھا۔  
لیکن جن حالات سے میں گزر رہا تھا میری نظر میں اس کا سبب میرے باپ کا پیشہ ہی تھا..... اور اب مجھے محبت ہوئی اور میرے دل کے نہاں خانے میں کوئی چپکے سے آ کر بیٹھا تو اس کا مسئلہ بھی عقدہ لا تخلیل بن گیا تھا۔  
آخر مثالا کا کیا اصرار تھا.....؟ وہ کون تھی.....؟ ایسا حسن تو میں نے نہ بھی دیکھا تھا اور نہ سنا تھا..... لیکن وہ تھی کہاں..... کیا وہ سردار کی بیٹی کی روح تھی.....؟ کیونکہ مثالا اور عروا، میں بال برابر بھی کوئی فرق نہیں تھا..... تو..... تو کیا..... واقعی مثالا، عروا ہی کا کوئی روپ تھی..... جو اپنی ایک جھلک دکھا کر کسی جھلاوے کی طرح اوجھل ہو چکی تھی۔  
میرے قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور ذہن الجھتا جا رہا تھا..... میں اب جنگل کے گڈنڈی والے راستے سے گزر رہا تھا..... جہاں تھوڑے ہی فاصلے پر قدرتی چشمہ موجود تھا۔  
اجانک ہی ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔  
”شش..... شش.....!“  
میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا..... لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔  
”شش.....!“ پھر کسی نے مجھے چھیڑا۔  
اس بار بھی مجھے کوئی نظر نہ آیا البتہ میرے اٹھتے قدم ضرور رک گئے تھے..... مجھے اس خیال نے ستایا کہ کہیں یہ وہی ہول تو نہیں ہے، جو اکثر مجھے دکھائی دیتا ہے۔  
چنانچہ میں نے دل کڑا کر کے بلند آواز میں پوچھا۔  
”کون ہو تم..... سامنے آؤ.....“  
”میں یہاں ہوں.....!“ ایک نسوانی سریلی سی آواز میرے کانوں سے نکل گئی۔  
ساتھ ہی ہنسی کی آواز گونجی، مجھے کافی حیرت ہوئی تھی..... میرا اندازہ تھا کہ یہ آوازیں سامنے والے درخت

کے عقب سے آرہی ہیں اور وہاں کوئی موجود ہے۔  
”سامنے تو آؤ..... کون ہو تم.....؟“ میں نے پھر کہا۔  
”مجھے شرم آرہی ہے..... سامنے کیسے آؤں.....؟“ اس کا لہجہ بے حد دلکش تھا۔  
میں سوچ میں پڑ گیا..... آخر یہ لڑکی کون تھی.....؟ اور اس جنگل میں کیا کر رہی تھی۔  
میں قدرے ڈر بھی رہا تھا، لیکن پھر تجسس میرے ذہن پر غالب آ گیا اور میں اس درخت کے قریب جا پہنچا۔  
اب میں نے دوسری طرف جھانکا اور مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا..... درخت کی آڑ میں مثالا کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی۔  
بالکل..... یہ مثالا ہی تھی۔  
میں حیرت کا بت بنا ہوا تھا اور پتھرائی ہوئی سی آنکھوں سے اس وجود کو دیکھ رہا تھا۔  
مثالا کے جسم پر معمولی سا لباس تھا، لیکن اس کے ہاؤدو اس کا حسن میری آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہا تھا۔  
لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ کئی طرح کے اندیشے بھی میرے ذہن میں گردش کرنے لگے تھے..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں.....؟  
وہ مسلسل مجھے مسکرائی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، پھر وہ خود ہی بولی۔  
”کیسی لگی یہ ملاقات.....؟“  
”اچھی ہے.....“ میرے منہ سے نکلا۔  
”لیکن..... لیکن تم کون ہو.....؟ ہستی میں تو تمہارا وجود ہی نہیں ہے۔“  
”اوہ.....!“ وہ ہنسی۔  
”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں سردار کی وہ بیٹی ہوں، جو مر چکی ہے..... ہے ناں.....!“  
”یہ لو.....“ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔  
”تمہارے خیال میں اگر میں کوئی روح ہوں، تو میرا جسم نہیں ہونا چاہئے۔ لو دیکھو..... میں گوشت

پوست کی مالک ہوں۔“  
اس کا ہاتھ آگے بڑھا ہوا تھا لیکن مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں وہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لوں..... حقیقت تو یہ تھی کہ میں اس وقت کافی ڈرا ہوا تھا مجھے ساکت دیکھ کر وہ خود ہی دو قدم آگے بڑھی اور پھر اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔  
اوہ..... نرم و ملائم سا وہ سبک ہاتھ..... جس میں خون اور جوانی کی گرماہٹ تھی..... سرشاری کی تھر تھراہٹ تھی..... وہ ہاتھ اب میرے ہاتھ میں تھا۔  
”اب بولو.....“ وہ پھر گویا ہوئی!  
”کیا کہتے ہو..... کیا میں سردار کی وہ بیٹی ہوں، جو مر چکی ہے۔“  
”میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا.....“ میں نے الجھ کر کہا۔  
”اور نہ ہی میں کوئی فیصلہ کر پارہا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔“  
یہ سن کر وہ پھر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔  
”میں تمہارے حال سے واقف ہوں..... جو کچھ ہوا اس میں نہ تو میرا کوئی قصور ہے اور نہ ہی تمہارا کوئی دوش ہے۔“  
”تو پھر..... یہ سب کیا ہے.....؟“ میری آواز قدرے بلند تھی۔  
”میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔“ اس کی آواز میں التجا تھی۔  
”آؤ..... ہم دونوں کہیں بیٹھتے ہیں..... اس کے بعد میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گی۔“ آؤ.....  
یہ کہہ کر وہ گھومی اور اس نے آگے قدم بڑھا دیئے۔  
میں بھی چپ چاپ اس کے عقب میں چلنے لگا۔  
اس کی خراماں چال بھی بے حد دلکش تھی..... اس کا داہنا پاؤں ایک ادا سے زمین پر پڑتا تھا اور اس وقت کمر پر آنے والا بل میرے دل میں گدگدی سی کرنے لگتا تھا..... وہ سراپا قیامت تھی..... کسی حسین خواب کی طرح۔



اس نے ایک بار مجھے مڑ کر دیکھا اور مسکرا کر دوبارہ آگے بڑھ گئی۔ جلد ہی ہم دونوں ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درختوں کے درمیان مٹی کی جگہ میں ایک نیمبرہ لٹا ہوا تھا۔ میں نے حیرت سے اس خیمے کو دیکھا۔ مثلاً میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گئی اور بولی۔

”میں یہاں رہتی ہوں اور میرا نام مثلاً ہی ہے۔“

آؤ۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ۔ پھر میں تمہیں اپنی کہانی سنائی ہوں۔ آؤ۔۔۔۔۔

میں اس کے ساتھ خیمے کے اندر داخل ہو گیا، یہاں باقاعدہ بستر بھی موجود تھا اور ایک طرف کھانے کے سامان اور کچھ برتن بھی موجود تھے۔ یہاں ایک آگ بھی رکھی ہوئی دکھائی دی۔

”ہٹو۔۔۔۔۔“ مثلاً نے بستر کی طرف اشارہ کیا اور پھر خود بھی چوڑی مار کر بیٹھ گئی۔

”خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کہ یہ سب کیا ہے۔“ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”ورنہ ممکن ہے کہ میں باگل ہو جاؤں گا۔“

یہ کہہ کر میں بھی پال پر بیٹھ گیا۔

”میں تمہیں باگل نہیں ہونے دوں گی۔“ اس نے عجیب سے انداز میں مجھے دیکھا۔

”کیونکہ تم نے نہ جانے اب تک کیا کیا سوچ لیا ہوگا۔ میں اب تمہیں حقیقت بتا رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے یہاں ایک مجبوری کے تحت رہنا پڑتا ہے۔“

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟ کسی مجبوری۔۔۔۔۔؟“

”میں سردار کی بیٹی کی ہم شکل ہوں۔“ مثلاً نے کہا۔

”اور ہم دونوں میں کوئی بھی رشتہ نہیں تھا۔ لیکن یہ صرف قدرت کا کرشمہ تھا کہ میں ہو یہو اسی کی طرح تھی۔ ہم دونوں کی دوستی بھی بہت گہری تھی۔ ساتھ رہنا، ساتھ کھانا پینا اور ساتھ ہی کھینا کودنا ہمارا شیوہ تھا۔ اس میں اور مجھ میں صرف رنگت کا قدرے فرق تھا۔ وہ زیادہ گوری تھی اور میرا رنگ سانولا ہے۔ اسی بنا پر بستی

کے لوگ ہمیں پہچانتے تھے لیکن پھر چاک ہی عروا بنار پڑی اور اسی بیماری میں ایک دن اس کا انتقال ہو گیا۔ سردار کو اس سے دیوانگی کی حد تک محبت تھی۔ کیونکہ سردار نے بن ماں کے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ چنانچہ عروا کے مرنے کے بعد سردار گویا اپنے حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ میں اس کے سامنے آتی تو وہ ہانگوں کی طرح چیختا تھا۔ اور اس کی طبیعت بگڑ جاتی تھی۔ چنانچہ سردار کے حامیوں اور اس کے وفاداروں نے سردار کی اس تکلیف دہ حالت کا یہ حل نکالا کہ ان لوگوں نے مجھے بستی سے باہر کر دیا۔

”ارے۔۔۔۔۔ یہ کیوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”کیونکہ جب بھی سردار سے میرا سامنا ہوتا تھا تو اسے عروا کی یاد آ جاتی تھی۔ اس لئے بستی والوں نے میرے لئے یہاں جگہ بنادی۔ یوں تو میرا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ مجھے یہاں کھانے پینے کو بھی ملتا ہے۔ اور جب رات کو سردار سو جاتا ہے تو بستی کے چند لوگ مجھے آ کر لے جاتے ہیں۔ اس طرح میں رات کے وقت بستی میں ہی سوتی ہوں۔“

”بڑی عجیب کہانی ہے۔“ میں بڑبڑایا۔

”تم تو بڑی مشکل قسم کی زندگی گزار رہی ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ لیکن میرا جانے سے تو اچھا ہے۔“ وہ غمگین لہجے میں بولی۔

”تم بستی کے لوگوں سے واقف نہیں ہو۔۔۔۔۔ وہ لوگ تو سردار کی حالت کے پیش نظر مجھے بھی مار دینے کے حق میں تھے۔ جب ہی میری ماں نے ان لوگوں کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے تو مجھے زندگی کا نذرانہ ملا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو۔۔۔۔۔ یہ تو سرا سرائے انسانی اور درندگی ہے۔“ میں کانپ اٹھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ بس کوئی نیکی ہی کام آ گئی۔۔۔۔۔ جو میری جان بخشی ہوگی۔ ورنہ میں بھی موت کی نیند سوچتی ہوتی۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور اس کے چہرے پر

ایسی کے بادل لہرانے لگے۔ دفعتاً ایک خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔

”یہ بتاؤ کہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ میں جنگل سے گزر رہا ہوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے فوراً سے اسے دیکھا۔

”تم کیا جانو کہ میں اس وقت یہاں ہوں۔“

یہ سن کر وہ مسکرائی اور بولی۔

”تم یہ بات کر رہے ہو؟ ارے۔۔۔۔۔ میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ تم صبح سویرے ہی بستی چلے گئے تھے۔ اور تم وہاں مجھے ڈھونڈنے کی غرض سے گئے تھے۔“

یہ سن کر میں اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا، پھر میرے منہ سے نکلا۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا۔۔۔۔۔ یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟“

”تم خود اندازہ لگاؤ۔“ وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور پہلے سے بھی زیادہ حسین دکھائی دینے لگی۔

میں اس کی خوب صورتی میں کھوسا گیا، پھر سنبھل کر بولا۔

”تم خود ہی بتاؤ۔۔۔۔۔ میں اس وقت بہت زیادہ الجھا ہوا ہوں۔“

”اچھا تو سنو۔۔۔۔۔ چننا مجھے تھوڑی دیر پہلے ہی ہماری تفصیل بتا کر گئی تھی کیونکہ وہ دیاں کی گہری دوست ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہیں۔“

میں حیرت کا بت بنا ہوا اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر بولی۔

”کیا تمہیں ان باتوں پر حیرت ہو رہی ہے؟“

”بہت زیادہ۔۔۔۔۔“ میں بول اٹھا۔

”وہ اس لئے کہ دیاں تو صبح سے میرے ساتھ تھا۔“

”یہاں کیسے تمہارے پاس آ گئی؟“

”تم شاید ایک بات بھول رہے ہو۔۔۔۔۔ وہ بچیدہ تھا۔“

”تم دیاں سے کل شام میں ملے تھے، اور میرے پاس اس نے کل رات ہی میں چند اکو بتا دیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”تو۔۔۔۔۔ یہ بات ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ بولی۔

”میں جانتی ہوں کہ تمہارا نام نکلیں ہے۔ اب خود سوچو کہ تمہارا نام مجھے کیسے معلوم ہوا؟“

”اگر یہ سب کچھ ہے تو پھر دیاں مجھے بستی میں لے کر کیوں گھوم رہا تھا۔“ میں نے کہا۔

”اس نے مجھے یہ سب کچھ کیوں نہیں بتایا۔۔۔۔۔؟“

یہ سن کر وہ اداس انداز میں مسکرائی اور بولی۔

”بات یہ ہے کہ وہ اپنے ماموں سے بہت ڈرتا ہے۔ اگر تمہاری وجہ سے میری کہانی ان کے سامنے چل گئی تو اس کی شامت آ جائے گی۔ وہ آنے والے وقت سے ڈر رہا ہے۔ شاید اسی لئے وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوگا کہ تمہیں میرے متعلق بتائے کہ نہ بتائے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ میں نے ایک طویل سانس لی۔

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کافی دیر تک ہم دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے، پھر مثلاً بولی۔

”تم پہلی نظر میں ہی میرے دل میں اتر گئے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں چننا کے ساتھ سیر کرنے نکلی تھی، ورنہ وہ اکثر یہاں آتی ہے، تو ہم دونوں اسی جگہ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اور وقت گزاردیتے ہیں۔“

”اس نے بھی تمہارے وجود سے انکار کیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے بتایا۔“

”میں اس سے مل چکا ہوں۔۔۔۔۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے معلوم ہے۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

”اسے بھی دیاں ہی کے کہنے پر جموٹ بولنا پڑا تھا۔“

میں کچھ کہے بغیر ہی اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مجھے بے حد حسین لگ رہی تھی، میرے دل میں کئی طرح کے خیالات لہرانے لگے۔ دل چاہا کہ اسے اپنی باتوں میں بھر لوں۔ لیکن یہ پہلی ملاقات تھی اور مجھے ابھی محبت

کی منزل تک پہنچنے کے لئے طویل راستہ طے کرنا باقی تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔  
 ”میں تمہیں کیسا لگا ہوں؟“  
 ”کیا مطلب؟“ اس نے مجھے دیکھا۔  
 ”مطلب یہ ہے کہ مجھے تم سے محبت ہو چکی ہے۔“ میں نے کہا۔  
 ”کیا تم میری محبت کو قبول کرتی ہو؟ کیا تم میری محبت کا جواب محبت سے دے سکتی ہو؟“  
 ”میں کل بتاؤں گی۔“ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔  
 ”ابھی تم چلے جاؤ۔ کیونکہ چندا کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ میں ابھی کسی سے بھی تمہارا ذکر نہیں کرنا چاہتی ابھی ہماری اس ملاقات کو پوشیدہ ہی رہنا چاہئے۔“  
 میں نے سر ہلا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا، وہ غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی، پھر اس نے آہستہ سے کہا۔  
 ”دل تو نہیں چاہ رہا کہ تم جاؤ۔ لیکن مجبوری ہے۔“  
 ”تم کل صبح ضرور آنا میں انتظار کروں گی۔“  
 پھر شمالا نے مجھے بڑی اپنائیت سے الوداع کہا اور میں وہاں سے نکل آیا۔  
 میں گم صدم سا تھا۔ قدرے پریشان اور عجیب طرح کی سوچوں میں گم۔ ایک طرف شمالا سے ملنے کی خوشی تھی، تو دوسری طرف شمالا کی بتائی ہوئی داستان نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔  
 بہر حال فی الوقت تو یہی کافی تھا کہ مجھے شمالا مل گئی تھی۔ ابھی کسی اور سمت میں ذہن کو دوڑنا فضول تھا۔  
 دوپہر کے وقت میں حویلی میں داخل ہوا تو جھوک کے مارے برا حال تھا۔ میں نے فوراً ہی اماں جی کو دیکھ کر کھانے کاغیر لگا دیا اور ہاتھ روم میں جا گھسا۔  
 نہا جھوک باہر نکلا تو خود کو کافی ہلکا محسوس کیا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو اماں جی کھانے کے میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔  
 میں کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ اماں جی خاموشی سے

مجھے دیکھ رہی تھیں جب میں پیٹ برکھ کھا چکا تو وہ بولیں۔  
 ”روجی آئی تھی۔“  
 ”یہ کون ہے ماں جی؟“ میں بے خیالی میں پوچھا۔  
 ”وہی۔ جس نے ہمارا گھر کرائے پر اٹھوایا تھا۔ تمہیں بتایا تو تھا۔“  
 ”اوہ۔ اچھا۔“  
 ”ہاں۔ اس نے کرائے داروں سے بات کی تھی۔ لیکن وہ لوگ اب کسی صورت بھی یہاں رہنے کو تیار نہیں ہیں۔ اور اسی مہینے وہ مکان خالی کر دیں گے۔ اماں جی نے بتایا۔“  
 ”اچھا۔ لیکن انہوں نے جبر تو بتائی ہوگی۔؟“  
 ”نہیں۔“ وہ بولیں۔  
 ”روجی نے فرصت ملی سے بھی بات کی تھی، لیکن وہ اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتے۔“  
 ”ارے تو جانے دیں ان لوگوں کو۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔  
 ”جب ان لوگوں کے خڑے نہیں مل رہے تو پھر منت سماجت کرنے کا کیا فائدہ۔“ چھوڑیں۔ کوئی اور آ جائے گا کرائے پر۔“  
 ”میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“ وہ سر ہلا کر بولیں۔  
 ”وہی میرا ارادہ تھا کہ میں خود ان لوگوں کی طرف جاؤں۔“  
 ”کوئی ضرورت نہیں ہے ماں جی۔“ میں نے کہا۔  
 ”ان کو گھر خالی کرنے دیں۔ میں اب سدو سے بات کروں گا وہ کوئی اچھا سا کرائے دار بتا دے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“  
 ”اچھا۔ ٹھیک ہے۔ جیسے تم کہو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے برتن اٹھانا شروع کر دیے۔  
 اس وقت میرے دل میں آئی کہ میں انہیں شمالا

میں متعلق بتا دوں۔ لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔  
 اتنی جلدی اماں جی کو بتا دینا مناسب نہیں تھا، ابھی تو صحت کی ابتداء تھی۔ ابھی مجھے شمالا سے ایک تفصیلی گفتگو کرنی تھی۔  
 میں تو اسے اپنی زندگی کا ہمسفر بنانے کے لئے نکل رہا تھا، لیکن مجھے اس کے دل کا حال بھی تو جانا تھا۔ کیا اسے بھی مجھ سے محبت ہو گئی تھی؟  
 یہ بات معلوم کرنے کے لئے مجھے صبح کا انتظار کرنا تھا۔ کیونکہ شمالا نے مجھے دوسرے دن بلایا تھا۔  
 ☆.....☆.....☆  
 شام کے وقت ایک بار پھر دیان سے میری ملاقات ہو گئی۔ وہ کیرم کھیل رہا تھا۔  
 اس وقت سدو میرے ساتھ نہیں تھا، دیان نے مجھے دیکھا اور فوراً ہی اشارہ کیا۔  
 میں رک گیا تھا، دیان جلد ہی کھیل ختم کر کے میرے پاس آ گیا۔ اس نے کافی گرم جوش سے مجھ سے بات چلی۔  
 ”کیا حال ہیں میرے دوست۔؟“ اس نے ہلکے غلوں سے پوچھا تھا۔  
 میں نے تڑپتی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔  
 ”دوست بھی بولتے ہو اور غیروں والا سلوک بھی دلا رکھتے ہو۔ بہت خوب۔“  
 ”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔  
 ”میں سمجھا نہیں۔“  
 ”چھوڑو۔ کیا کرو گے سمجھ کر۔“ میں مسکرایا۔  
 ”آؤ ہوٹل میں چلتے ہیں۔“  
 ”ضرور۔؟“ اس نے قدم آگے بڑھائے۔  
 ”لیکن اگر تمہاری مراد شمالا سے ہے تو میں اس حقیقت کو نہیں بتا چکا ہوں۔ تم نے اسے جس ہستی کے مشابہ کیا ہے، وہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔“  
 یہ سن کر میں معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔

”اور اگر میں یہ کہوں کہ میں شمالا سے مل چکا ہوں۔“  
 ”کیا مطلب۔؟“ اس نے حیرت سے میری شکل دیکھی۔  
 ”وہی شمالا۔ جسے میں نے چندا کے ساتھ دیکھا تھا۔“  
 ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟“ دیان نے کہا تھا۔  
 میں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس دوران ہم ہوٹل پر پہنچ گئے، ایک میز کے گرد کرسیوں پر بیٹھنے کے بعد دیان نے میری طرف تحس انداز میں دیکھ کر کہا۔  
 ”مجھے بتاؤ۔ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟“  
 ”میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ اسے تم اچھی طرح جانتے ہو۔“ میں نے کہا۔  
 ”اب اتنے انجان مت بنو۔“  
 اس سے پہلے کہ دیان کچھ کہتا، سدو ہوٹل میں داخل ہوا، وہ شاید ہماری ہی تلاش میں تھا، وہ فوراً ہماری میز کی طرف لپکا اور پھر دوسرے ہی پکارا تھا۔  
 ”اچھا۔ اکیلے اکیلے پارٹی ہو رہی ہے۔“  
 ”بھائی کو پوچھا بھی نہیں۔“  
 ”پھر وہ بھی ایک کرسی سمجھ کر بیٹھ گیا۔“  
 ”ابھی آئے ہیں ہم دونوں۔“ میں نے سدو سے کہا۔  
 ”میں بھی اتفاق سے ابھی گھر سے نکلا تھا۔“  
 سدو نے جواب دیا۔  
 ”یار۔ بچوں کو پڑھا پڑھا کر دماغ خشک سا ہو جاتا ہے۔ جانو بھائی کے کیرم پر آیا تو ارشد سے تمہارے بارے میں معلوم ہوا میں نے فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ تم دونوں ہوٹل پر ہی آئے ہو گے اور پھر میں یہاں چلا آیا۔“  
 ”تمہیں تو جاسوس ہونا چاہئے۔“ دیان مسکرایا۔  
 ”کوئی خاص بات ہو رہی تھی؟“ اس نے غور سے ہمیں دیکھا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ بہت ہی خاص تھی۔“ دیان

نے میری طرف دیکھ کر کہا۔  
 ”زیادہ بہتر تو کھیل ہی بتا سکتا ہے۔“  
 اتنی دیر میں چائے آ گئی، آج حیرا کچھ پوچھے بغیر ہی تین کپ لے آیا تھا، پھر اس نے انہیں میز پر سجایا اور فخریہ انداز میں ہم لوگوں کی طرف دیکھتا ہوا واپس پلٹ گیا۔  
 ”بھئی واہ.....“ سدو نے فوراً ایک کپ اپنی طرف کھسکایا۔  
 ”حیرا کافی عقل مند ہے۔“  
 ”ہاں تو کھیل میاں..... اگر مناسب سمجھو تو ہمیں بھی بتاؤ۔“  
 ”ضرور.....“ یہ کہہ کر میں نے شالا سے ملاقات کی مختصر تفصیل بتادی۔ بہت سی باتیں میں گول بھی کر گیا تھا خاص طور پر وہ باتیں کہ جن کا تعلق ہستی کے سردار اور دیان سے تھا۔  
 یہ سن کر سدو نے کہا۔  
 ”بھئی بہت خوب..... عشق نے حسن کو آخر کار پائی لیا..... اسے کہتے ہیں محبت۔“  
 ”لیکن اس بات پر مجھے حیرت ہے۔“ دیان نے ڈھل دیا۔  
 ”کیسی حیرت.....؟“ سدو نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔  
 ”شالا نامی کسی لڑکی کا وجود ہی نہیں ہے۔“  
 دیان بولا۔  
 ”ارے.....“ سدو کے ہاتھ سے چائے کا کپ چھوٹے چھوٹے رہ گیا۔  
 ”یہ کیا بات ہوئی.....؟“  
 ”میں کھیل کو یہی بات سمجھا رہا ہوں۔“  
 دیان بولا۔  
 ”اور میں ثابت کر سکتا ہوں کہ شالا سے ملا ہوں.....“ میں تیز لہجے میں بولا۔  
 ”کیونکہ میں یہ بات بھی جانتا ہوں کہ دیان شالا سے انکاری کیوں ہے؟“

”ارے بھئی..... آپس میں بے وجہ کیوں بحث کر رہے ہو.....“ سدو نے موقع کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے کہا۔  
 ”ہو سکتا ہے کہ دیان اس لڑکی کو سرے سے جانتا ہی نہ ہو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم شالا سے کہاں ملے تھے؟“  
 ”جنگل میں.....“ میں نے جواب دیا۔  
 ”جنگل میں کہاں.....؟“ دیان نے پوچھا۔  
 ”میں نے ایک انداز سے اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔  
 ”وہ وہاں ایک خیمے میں رہتی ہے..... میں نے کافی دیر اس سے بات چیت کی ہے۔“  
 ”حیرت ہے.....“ دیان بڑبڑایا۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہے کہ ہستی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے..... شاید اسی لئے میں اس سے ناواقف ہوں۔“  
 ”شاید یہی بات ہو.....“ میں طنزیہ انداز میں ہنسا۔  
 ”اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہاری ہستی سے اس کا بہت خاص تعلق ہو۔“  
 ”تم انجھی ہوئی باتیں کیوں کر رہے ہو.....؟“  
 دیان نے غور سے مجھ کو دیکھا۔  
 ”صاف صاف کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“  
 ”میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔“ میں نے طویل سانس لی۔  
 ”میں صرف یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ میں شالا سے ملاقات کر چکا ہوں..... وہی شالا..... جس سے چندا بھی انکاری ہے۔“  
 دیان نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ سدو ہاتھ اٹھا کر بولا۔  
 ”آپس میں بحث بازی سے کوئی فائدہ نہیں..... اگر کھیل اس لڑکی سے مل چکا ہے تو یہ خوشی کی بات ہے..... اس میں کوئی عیب تو نہیں ہے۔“  
 ”واقعی کوئی عیب نہیں ہے۔“ دیان بولا۔

”لیکن میں کھیل کی اس شالا سے ملنا چاہتا ہوں۔“  
 یہ سن کر میں نے کہا۔  
 ”میں تمہیں شالا سے ضرور ملواؤں گا..... تمہوڑا سا ابا بزرگ..... بس..... تمہوڑا سا انتظار۔“  
 ☆.....☆.....☆  
 وہ رات میں نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری تھی۔ دوسرے دن میں صبح ہی صبح گھر سے نکل گیا تھا۔  
 ”آج کہاں چل دیئے۔“ اماں جی نے پوچھا تھا۔  
 ”کالج جا رہا ہوں ماں جی۔“ میں نے جھٹ کہا۔  
 ”اچھا.....“ اماں جی نے سر ہلادیا۔  
 میں کان دبا کر وہاں سے نکل آیا، میں پھر کہیں ابا کا نہیں تھا۔ میرے قدم تیزی سے جنگل کے اس کی طرف اٹھ رہے تھے، جہاں شالا میری منتظر تھی۔  
 وہ واقعی خیمے سے باہر نہیں رہی تھی..... آج اس نے ایک رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور وہ گزشتہ دن کی زیادہ دلکش دکھائی دے رہی تھی۔  
 وہ تیزی سے میری طرف لپکی اور میرے نزدیک آ کر بولی۔  
 ”ت..... تم آ گئے.....؟“  
 ”ہاں شالا.....“ میں نے محبت بھرے انداز میں اسے دیکھا۔  
 ”مجھے تو آنا ہی تھا۔“  
 ”میں رات بھر جاگتی ہوں.....“ اس نے گہری سانس لے کر مجھ کو دیکھا۔  
 ”آؤ..... اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔“  
 میں اس کے ساتھ چلتا ہوا خیمے کے اندر گیا..... پھر ہم دونوں آئے سانسے بیٹھ گئے تھے، نہ کسی دیر تک ایک دوسرے کو دیکھنے کے بعد شالا کے پاس پہنچے۔  
 ”کیا دیکھ رہے ہو.....؟“  
 ”میں سوچ رہا ہوں کہ تم مجھے پہلے کیوں نہ

ملیں.....“ میں نے کہا۔  
 ”نہ جانے زندگی کے کتنے دن بے کیف ہی گزر گئے۔“  
 ”میں بھی رات میں یہی سوچتی رہی۔“ شالا نے کہا۔  
 ”اور تمہاری محبت میرے دل میں اور میری بڑھتی چلی گئی۔“  
 ”شالا..... ایک بات کہوں.....؟“  
 ”ہاں..... کہو.....“ وہ پیار سے بولی۔  
 ”میں تمہیں اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں.....“  
 میں نے کہا۔  
 ”میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد تمہیں اپنی ماں جی سے ملوا دوں۔“  
 ”اچھا.....“ اس نے سر ہلادیا۔  
 ”تمہارے گھر میں اور کون کون رہتا ہے؟“  
 ”ماں جی کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں ہے۔“  
 میں نے بتایا۔  
 ”اور بھی لوگ تھے، لیکن وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“  
 ”کیوں..... کیسے.....؟“ شالا حیران ہو کر بولی۔  
 ”کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟“  
 ”کوئی ایک حادثہ نہیں تھا.....“ میں نے بات سمجھائی۔  
 ”بس یہ اتفاق ہی تھا کہ مختلف حادثے ہوئے اور پہلے میری دو بیٹیاں انتقال کر گئیں اس کے بعد ایک اور حادثے نے میرے باپ کی جان لے لی۔“  
 ”اوہ..... مجھے بہت افسوس ہوا سن کر۔“ شالا نے کہا۔  
 ”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت دکھی ہو۔“  
 ”ہاں شالا.....“ میرا لہجہ دکھ بھرا تھا۔  
 ”میرے سینے میں بہت سے دُغم ہیں۔“  
 ”تم پریشان نہ ہو.....“ شالا نے مجھے دلا سہ دیا۔  
 ”میں اب تمہاری زندگی میں آ چکی ہوں.....“



میں سارے زخم بھردوں گی۔ میں تمہیں اتنی محبت دوں گی کہ گزرے ہوئے وقت کے غموں کو تم بھول جاؤ گے۔“  
 ”جی.....؟“ میں نے بے ساختہ پوچھا۔  
 ”ہاں ٹھیک.....“ مثالا نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیئے میرے وجود میں ٹھنڈی ٹھنڈی سی لہریں گردش کرنے لگیں۔  
 میں اس کے قریب ہو گیا۔ اور میں نے اپنا سر اس کے چہرے پر ٹکا دیا، اس کے وجود سے اٹھنے والی خوشبو نے میری روح کو محسوس کر دیا۔  
 ”ٹھیک.....“ اس نے دھیرے سے مجھے آواز دی۔  
 ”ہاں..... مثالا..... کہو.....“ میں نے مخمور لہجے میں کہا۔  
 ”کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ..... زندگی بھر میرے ساتھ رہو گے.....؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔  
 ”ہاں.....“ میرا وعدہ ہے.....“ میں نے اس کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھائی بھری۔  
 ”دیکھو..... سوچ لو.....“ اس نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا۔  
 ”اس میں سوچنے والی کیا بات ہے.....؟“ میں نے فوراً کہا۔  
 ”میں یہ بات ایک وجہ سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔  
 ”کیا وجہ ہے.....؟ بتاؤ میری جان۔“  
 ”چھوڑو..... تمہیں مجھ سے نفرت ہو جائے گی۔“ اس نے کہا۔  
 ”کیوں.....؟ ایسی کیا بات ہے.....؟“ میں نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔  
 نہ جانے کیوں مثالا اداس ہو گئی۔ یہ بات میں نے صاف طور پر محسوس کی تھی۔  
 ”بس.....! مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گے۔“

”تم بتاؤ..... میں وعدہ کرتا ہوں کہ میری محبت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“  
 ”میں تمہیں اب بھی چاہتا ہوں..... اور تمہاری بات معلوم ہو جانے کے بعد بھی یہ محبت اپنی جگہ قائم رہے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ مثالا نے کہا۔  
 ”میں تمہیں بتا دوں گی..... سب کچھ بتا دوں گی۔“  
 ”بس..... مجھے تھوڑی سی مہلت دو..... میں جلد ہی اپنی کہانی تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں گی۔“  
 ”ابھی بتا دو.....“ میں نے تابی سے بولا۔  
 ”میں سننے کے لئے بے چین ہوں۔“  
 ”ابھی نہیں..... اس نے نفی میں سر ہلایا۔  
 ”میں موقع دیکھ کر تمہیں رات میں بلاؤں گی..... پھر ہم بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے۔“  
 ”رات میں.....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”تم..... رات میں مجھ سے کس طرح ملو گی.....؟ کیسے ملو گی؟“  
 ”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو.....“ اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔  
 ”میں کل رات میں یہاں پہنچ جاؤں گی۔ تم آ جانا۔“  
 یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر آہستہ سے بولی۔  
 ”اب تم جاؤ.....! چننا آنے والی ہے۔“  
 ”لیکن یاد ہے..... کل رات میں ضرور آنا۔“  
 پھر مثالا میرے ساتھ کچھ دور تک آئی تھی، پھر اس نے ہاتھ ہلا کر مجھے رخصت کیا اور درختوں کے عقب میں چلی گئی۔  
 میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر جب میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تو میں ایک طویل سانس لے کر مڑ گیا۔  
 لیکن ابھی میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک

”میرے کانوں سے ٹکرائی۔“  
 ”ٹھیک.....!“  
 جانی پہچانی آواز تھی، میں نے محسوس کر دیکھا کہ وہاں سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔  
 ”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟“  
 ”میں.....“ میں بولتے بولتے رک گیا۔  
 ”میں یہاں مثالا سے ملنے آیا تھا۔“  
 ”تو پھر..... ملاقات ہو گئی؟“ اس نے عجیب انداز میں پوچھا۔  
 ”مجھے غصہ آ گیا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میرا مذاق اڑا رہا ہو۔“  
 ”دیکھو دیان..... تم چاہے کتنی ہی حقیقت مجھ سے چھپاؤ..... لیکن مجھے ساری باتوں کا علم ہے..... میرا خیال ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے۔“  
 ”میں تم کھانا ہوں کہ اس قدر عقل مند ہرگز نہیں ہوں۔“ دیان نے جیسے پر غلوں لہجے میں کہا۔  
 ”تم ساری بات مکمل کر مجھے بتا دو۔“  
 ”مثالا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے.....“ میں نے کہا۔  
 ”اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم ساری باتوں سے واقف ہو۔“  
 ”چلو میں نے مان لیا۔“ دیان نے طویل سانس لی۔  
 ”لیکن میں تمہاری مثالا سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ یہاں ہے؟“  
 ”اسی خیمے میں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔  
 ”جہاں تم لوگوں نے اسے رکھ چھوڑا ہے۔“  
 ”یار..... تم مجھے ابھی اس سے ملاؤ۔“ دیان صحت کے عالم میں بولا۔  
 ”میں اس سے خود ہی بات کر لوں گا۔“  
 ”میں تمہیں اس سے ملاؤں؟“  
 ”ہاں.....“

”چلو پھر.....“ میں کچھ سوچ کر بولا۔  
 دیان کو ساتھ لے کر میں خیمے والی جگہ کی طرف چل پڑا۔ دیان میرے ہم قدم چل رہا تھا۔  
 لیکن پھر ہم دونوں ہی ٹھٹھک کر رک گئے۔ اچانک ہی ایک درخت کی آڑ سے کالے رنگ کا ایک خوف ناک اور بھاری بھر کم کتابرا آدھ ہوا تھا۔  
 اس کا رخ ہماری طرف ہی تھا، وہ آگے نہیں بڑھتا تھا..... لیکن خون خوار انداز میں ہمیں دیکھ رہا تھا۔  
 ”یہ کس کا کہاں سے آ گیا.....؟“ دیان بڑبڑایا۔  
 ”یہ تو ہے بھی بہت خطرناک۔“  
 دفعتاً کتے نے زوردار آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ انداز ایسا تھا جیسے وہ ہمیں آگے بڑھنے سے روکنا چاہتا ہو۔  
 ”یہ کیا مصیبت ہے؟“ میں پریشان ہو گیا۔  
 ”واقعی.....“ دیان نے کہا۔  
 ”جے تو یہ مصیبت ہی۔“  
 ”میں نے بھی اس جنگل میں اسے دیکھا نہیں ہے۔“  
 ”چلو پھر.....“ مجھے اب گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔  
 ”میں تمہیں کسی اور دن مثالا سے ملوا دوں گا۔“  
 دیان خاموش تھا، پھر ہم دونوں ہی واپس پلٹ گئے تھے۔  
 ☆.....☆.....☆  
 گھر پہنچا تو رجم بابا میرے منتظر تھے، اماں جی نے انہیں ایک کمرے میں بیٹھا دیا تھا۔  
 مجھے دیکھتے ہی وہ بول اٹھے۔  
 ”ارے بھئی ٹھیک میاں..... تم کہاں..... ہو؟“  
 ”جی.....! میں ذرا کام سے گیا تھا.....“ میں نے گول مول جواب دیا۔  
 ”ہوں.....! اور سناؤ کیا حال ہیں.....؟ کافی دنوں بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔“  
 ”بس میں ٹھیک ہوں.....“ میں نے جواب دیا۔  
 ”گزر رہی ہے زندگی۔“

دہشت سے بھرپور پراسرار کہانیوں کا انتخاب

# خوفناک کہانیاں

کراچی

نیا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔

قیمت - 70/- روپے

جس میں شامل ہے۔

ملک کے مشہور و معروف رائٹراؤیم۔ الیاس کی قسط وار کہانی  
**”پراسرار ہمزاد“** اور ایم اے راحت کی قسط وار کہانی **”کنارہ“** اس  
 کے علاوہ سچ پر مبنی خوفناک، دہشت ناک، لمحہ دل کی دھڑکنیں تیز کرتی کہانیاں۔  
 آپ کے مسائل اور ان کا حل۔ رنگ دھنک۔ پراسرار دنیا۔ کھٹی میٹھی باتیں۔ اور بھی  
 بہت کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

ابھی اپنے کسی بھی قریبی بک اسٹال یا کرسے نام لے کر طلب فرمائیں۔

اپنی قیمتی رائے ہمیں ضرور ارسال کریں۔

## ماہنامہ خوفناک کہانیاں

نورانی آرکیڈ۔ رتن تلاؤ نمبر ۳، کراچی

Email: Khofnakahaniya@gmail.com

”چلو..... اچھی بات ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔  
 ”ویسے میں بھی آپ کو یاد کر رہا تھا۔ میں نے  
 دو دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا..... لیکن مجھے شک ہے کہ  
 وہ خواب ہی تھا۔“  
 ”کیا مطلب؟“  
 ”میں نے انہیں اس دن کی کہانی سنا دی، جب  
 دوپہر کے وقت جان لیوا سے میری ملاقات ہوئی تھی  
 اور پھر اس کے ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھے تھے۔  
 لیکن پھر وہ سب کچھ ایک خواب کی مانند رہ گیا تھا اور مجھے  
 امان جی نے بے ہوشی کے سے عالم میں چلاتے ہوئے  
 دیکھا تھا۔“  
 یہ سن کر کریم بابا کے چہرے پر فکر کے بادل  
 چھا گئے..... پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولے۔  
 ”ڈراوا..... صرف ڈراوا۔“  
 ”کیا مطلب کریم بابا.....؟“  
 ”مطلب یہ ہے کہ وہ شے تمہیں صرف ڈرا رہی  
 ہے..... اور..... اگر تم اس سے ڈر گئے تو اس کی جیت  
 ہو جائے گی۔“  
 ”میں اب بھی نہیں سمجھا۔“  
 ”میں نے حساب کتاب لگا دیا ہے۔“ کریم بابا نے  
 کہا۔  
 ”اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ شے تمہیں  
 کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ تم اپنے باپ دادا  
 کی طرح کالے اور گندے علم سے پاک ہو۔“  
 ”اگر یہ بات ہے، تو میری بہنوں نے کیا قصور  
 کیا تھا.....؟“ میں نے جرح کی  
 ”وہ بے چارے کون سا علم جانتی تھیں.....؟“  
 ”اس وقت تمہارا باپ زندہ تھا۔“ وہ بولے۔  
 ”اور گندے علم کے اثرات تمہارے پورے  
 گھر پر موجود تھے۔ تمہارے باپ کے مرنے کے بعد ہی  
 وہ اثرات ختم ہو گئے تھے۔ اسی لئے اب وہ شے تمہیں جانی  
 نقصان نہیں پہنچا سکتی۔“  
 ”لیکن وہ مجھے کسی وقت بھی دھمکا سکتی ہے.....“  
 ”ڈرا سکتی ہے۔“ میں نے تڑپ کر کہا۔  
 ”اور میں نے کسی سے اس کا تماشہ بنا ہوں گا۔“  
 ”ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“ کریم بابا نے اعتماد سے کہا۔  
 ”میرا ہاتھ تمہارے سر پر ہے۔ اور میں تمہیں اس  
 کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑوں گا۔“  
 یہ سن کر میری اول بھڑکی..... ضبط کا بندھن ٹوٹا اور  
 میری آنکھیں بھرا گئیں یہ دیکھ کر کریم بابا اٹھے اور مجھے  
 اپنے سینے سے لگا کر بولے۔  
 ”میرے بچے رو کیوں رہے ہو.....؟ یہ بات  
 غلط ہے۔“  
 ”کیا کروں کریم بابا..... میں تو اب ایک نئی اور  
 اچھی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ لیکن اپنے مقدر سے مجھے  
 ڈر لگتا ہے۔“  
 ”تم فکر مت کرو..... خدا نے چاہا تو سب کچھ  
 ٹھیک ہو جائے گا۔“  
 اس وقت میرے دل نے چاہا کہ میں انہیں شالا  
 کے متعلق بھی بتا دوں۔ کیونکہ اب وہ میری زندگی کی نوبت  
 بن چکی تھی۔  
 مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔  
 ”کیا ہوا.....؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟“  
 ”جی ہاں.....“ میں نے قدرے ہچکچاتے  
 ہوئے کہا۔  
 ”دراصل مجھے ایک لڑکی پسند آ گئی ہے۔“  
 ”یہ تو اچھی بات ہے.....“ وہ مسکرائے۔  
 ”کون ہے وہ.....؟ کہاں رہتی ہے۔“  
 ”یہ ڈرائیو حابہ مسئلہ.....“ میں نے سر کھچایا۔  
 ”میری محبت کی داستان بھی میری زندگی کی طرح  
 عجیب و غریب ہے۔“  
 ”اچھا.....“ انہوں نے کہا۔  
 ”تم مجھے ضرور بتاؤ..... میں سمجھ جاؤں گا۔“  
 اب میں نے انہیں شالا کے متعلق بتا دیا، وہ  
 غور سے سن رہے تھے، کئی جگہ انہوں نے مجھے روکا بھی  
 تھا، اور کچھ سوالات بھی کئے تھے۔

جب میں خاموش ہوا تو وہ کسی سوچ میں ڈوب گئے، میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا پھر انہوں نے ایک طویل سانس لی اور بولے۔

”تم اس سے ملنے کب جاؤ گے؟“

”اس نے مجھے کل رات میں بلایا ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ انہوں نے سر ہلایا۔

”تو پھر ایک کام کرو۔“

”جی پولیس۔“

”تم وہاں اکیس نہیں جاؤ گے۔“ انہوں نے کہا۔

”میں بھی وہاں تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”آپ۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔! میں بولتے بولتے

رک گیا۔

”تم فکر مت کرو۔۔۔۔۔ میں تم سے فاصلے پر موجود

رہوں گا۔ دراصل رات میں جنگل کا تنہا سفر کرنا ٹھیک نہیں

ہے اور میرا خیال ہے کہ میری موجودگی تمہارے لئے

مناسب رہے گی۔۔۔۔۔ میں دور کھڑا رہوں گا، جب تم اس

سے ملاقات کرلو گے تو میرے ساتھ واپس چلے آنا۔ کیا

خیال ہے؟“

”لیکن آپ کو میری وجہ سے زحمت ہوگی۔۔۔۔۔“

”اس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ انہوں نے

مسکرا کر جواب دیا۔

”دراصل میں تمہیں اکیلا نہیں بھیجنا چاہتا۔“

یہ کہہ کر وہ پھر کسی سوچ میں گم ہو گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

یہ اتفاق ہی تھا کہ وہ چودھویں کی رات تھی۔

چاند اپنی آب و تاب پر تھا اور میں صحن میں کھڑا ہوا رحیم بابا

کا انتظار کر رہا تھا۔ آج انہوں نے میرے ساتھ جنگل میں

چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور مجھے شالا نے رات میں ہی وہاں

بلایا تھا۔

اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ رحیم بابا نے بالکل

درست فیصلہ کیا تھا، میں نے جذبات میں آ کر شالا سے

وعدہ تو کر لیا تھا، لیکن رات کے وقت جنگل میں جانا کافی

دل گروے کا کام تھا۔۔۔۔۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی

ہو رہی تھی کہ اس وقت شالا وہاں کیسے پہنچ سکے گی۔ بہر حال وہاں جانا ضروری تھا۔ اور میں رحیم بابا کا منتظر تھا۔۔۔۔۔ وعدے کے مطابق تو انہیں آنے میں دیر ہو چکی تھی۔

یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نہ آ سکیں۔۔۔۔۔ اس صورت میں مجھے تنہا جانا پڑتا۔۔۔۔۔ اور شالا کی خاطر شاید میں یہ ہمت کر ہی بیٹھتا۔

آخر کار دروازے پر دھتک ہوئی اور میں جلدی سے آگے بڑھا۔ اماں جی سوچتی تھیں۔۔۔۔۔ اور ان کی اسی غفلت میں ہمیں اپنا کام پورا کرنا تھا۔

دروازہ کھولتے ہی رحیم بابا کی شکل دکھائی دی۔

”کیا تم تیار ہو۔۔۔۔۔؟“ انہوں نے فوراً ہی پوچھا۔

”جی۔۔۔۔۔!“

”چلو پھر۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔

”تمہاری والدہ سو رہی ہیں؟“

”جی ہاں۔۔۔۔۔“

”یہ بہتر ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”مجھے امید ہے کہ جلد ہماری واپسی ہو جائے

گی۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔“

”اور میں بھی۔“ رحیم بابا عجیب سے انداز میں

مسکرائے جسے میں کوئی معنی پہنانے سے قاصر رہا۔

”آپ کو دیر ہوگئی۔۔۔۔۔ میں نے قدم بڑھاتے

ہوئے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔! مجھے تمہارے قاسم ماموں نے ایک

کام کے سلسلے میں روک لیا تھا، اسی لئے میں دیر سے

پہنچا۔“

”جی اچھا۔۔۔۔۔ ویسے ان کا کیا حال ہے؟“

”کیا ہوگا۔۔۔۔۔ اداس اداس رہتے ہیں بے

چارے۔“ انہوں نے بتایا۔

”یوں بھی وہ گھر میں کتے ہی کب ہیں۔“

”اداس تو ہوں گے ہی۔۔۔۔۔“ میں نے طویل

سانس لی۔

”ان کے ساتھ بہت ہی غلط ہوا ہے۔“

”لیکن زندگی بہت طویل ہے۔۔۔۔۔ اب ان

گناہانہا ہم سفر چن لینا چاہئے۔۔۔۔۔ آخر کب تک تنہا

ہونا پڑے۔“

”ماں جی نے انہیں سمجھا تھا۔“ میں نے بتایا۔

”لیکن انہوں نے شاید کان نہیں دھرے۔ اب

میں کسی دن انہیں ساتھ لے کر ماموں کے پاس آؤں گا،

پھر وہ خود ہی ان کی خبر لیگی۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ رحیم بابا نے ہنس کر کہا۔

☆.....☆.....☆

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ رات کا اندھیرا سناٹا

لگ رہا تھا۔ ایسے میں حشرات الارض کی

آوازیں گونج رہی تھیں، خاص طور پر چھتیکروں کی جھانپیں

جھانپیں عجیب سا سماں پیدا کر رہی تھیں۔

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

میرے ہاتھ میں نارنجی اور اس کی روشنی میں

”آپ یہ نارنجی رکھ لیں۔“

”نہیں اسے ساتھ لے جاؤ۔۔۔۔۔“ وہ بولے۔

”میں اندھیرے میں بھی آسانی سے دیکھ

سکتا ہوں۔۔۔۔۔ اب جاؤ۔“

میں نے ہاتھ ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ سامنے

شالا کا خیمہ اپنی جگہ پر موجود تھا، اور اس سے روشنی

پھوٹ رہی تھی۔

میں خیمے کے قریب آ گیا، دروازے کی صورت

میں ملنے ہوئے پردے سے ہی شالا کا وجود کسی سائے کی

مانند دکھائی دے رہا تھا۔

شاید اندر کیروسین لیمپ روشن تھا۔ میں نے آواز

لگائی۔

”شالا۔۔۔۔۔ میں آ گیا ہوں۔۔۔۔۔“

فورا ہی شالا کا وجود متحرک ہوا اور اس کی آواز

میرے کانوں سے نکل گئی۔

”اندرا آ جاؤ کھیل۔“

میں پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ ایک طرف

واقعی کیروسین لیمپ روشن تھا اور پیال پر شالا سگری ہوئی

بیٹھی تھی۔

میری طرف دیکھ کر وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”مجھے ڈر لگ رہا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے اٹھ کر تمہارا

استقبال نہیں کر سکی۔۔۔۔۔ میں معافی چاہتی ہوں۔“

”یہ تو حقیقت ہے۔“ میں نے سر ہلایا۔

”رات کے اس پہر تمہاری یہاں موجودگی واقعی

بہت دل گردے کا کام ہے۔“

”میں دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔“ وہ دوزانوں

ہو کر بیٹھ گئی۔

”آؤ۔۔۔۔۔ میرے قریب آ جاؤ۔“ میں تم سے مل

کر سارے غم بھلا دینا چاہتی ہوں۔“

میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ لیمپ کی روشنی

میں اس کا چہرہ اور بھی حسین دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔۔ ماتھے



ہر رکھ دیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبنے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ منور سے لہجے میں بولی۔

”میں..... میں اپنی محبت کا اقرار کرتی ہوں۔“

میں ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“

”سچ..... میں محبت بھرے لہجے میں بولا۔

”ہاں..... بالکل سچ.....“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تو پھر..... میں تمہیں اپنی ماں سے کب ملواؤں؟“

یہ سن کر وہ سوچ میں ڈوب گئی، پھر آہستہ سے بولی۔

”میں جھوٹ بولوں یا سچ؟“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”کیسا جھوٹ اور کیسا سچ.....؟“

”جھوٹ یہ ہے کہ تم مجھے اپنی ماں سے ملوا دو۔“ وہ پھر مسکرائی۔

”اور سچ..... اس سے ذرا مختلف ہے۔“

”سچ کیا ہے؟“ میں نے غور سے اسے دیکھا۔

”کیا تم میری ماں سے ملنا نہیں چاہتیں؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”تم غلط سوچ رہے ہو۔“

”تو پھر..... سچ کیا ہے؟“

”سچ..... اس نے ایک طویل سانس لی۔

”سچ یہ ہے کہ..... میں تمہاری ماں سے مل چکی ہوں۔“

”مل چکی ہوں..... کب.....؟“ میں حیرت کا

بت بن گیا۔

یہ بات تو اس نے بے حد عجیب کہی تھی..... میں

تو ابھی تک اسے اپنے گھر بھی لے کر نہیں گیا تھا، اور نہ ہی

اسے معلوم تھا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔

”ہاں..... مل چکی ہوں..... بلکہ کئی بار مل چکی ہوں.....“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں۔“

”آخر کیسے.....؟“ میں سچ اٹھا۔

”ت..... تم انہیں کیسے جانتی ہو.....؟“

میری جھلٹ سے گویا وہ محفوظ ہو رہی تھی، کیونکہ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی تھی۔

پھر اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات

ابھرنے لگے۔ میں انہیں کوئی معنی پہنانے سے

قاصر تھا۔ دل نہ جانے کیوں گھبرانے لگا تھا۔

ایک بار پھر شالا کے ہونٹ ہلے، لیکن یہ آواز شالا

کی تو نہیں تھی..... یہ تو..... بھاری اور مردانہ آواز تھی۔

”میں تمہاری ماں سے بھی واقف ہوں.....

اور تمہارے مرے ہوئے باپ سے بھی۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تھا، میں اچھل کر کھڑا ہو گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے شالا کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت خیمے کا پردہ ہٹا اور رحیم بابا کی آواز خیمے میں گونجی۔

”بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی جان لیوا..... یہ بھی

بتاؤ کہ تم اس کے باپ کے باپ کو بھی جانتے ہو.....

کیونکہ تم شالا کا قہقہہ کیلے دشمن ہو، اور تم نے ہی ان لوگوں

کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

میری توجہ شالا سے ہٹ کر رحیم بابا پر مرکوز

ہوئی..... میں جلدی سے پلٹا اور ان کے قریب جا کھڑا

ہوا۔

یہ حقیقت تھی کہ میں شالا سے خوف محسوس

کر رہا تھا..... رحیم بابا اب خاموش ہو چکے تھے۔

میں دوبارہ پلٹا تو شالا اپنی جگہ سے غائب تھی۔

خالی پیال میرے سامنے تھا، شالا کا وجود اس

طرح غائب تھا، جیسے میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی

خواب دیکھا ہو۔

میں سنائے میں آ گیا، اسی وقت رحیم بابا بولے۔

”چلو کھیل بیٹا..... کھیل ختم ہو گیا..... آؤ..... گھر چلیں۔“

”یہ..... یہ سب کیا تھا.....“ میرے منہ سے نکلا۔

”یہ سب اسی جان لیوا کا کیا دھرا تھا.....“ رحیم بابا

لے کہا۔

”اس نے تمہیں شالا کا روپ دھار کر بے وقوف

بنا دیا تھا۔“

”یعنی..... یعنی..... شالا کا کوئی وجود ہی نہیں

تھا؟“ میری حالت قابل دید تھی۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم میں جان ہی باقی نہ

ہو..... میں تو شالا کے خواب دیکھنے لگا تھا..... اپنے

دل میں اس کے لئے ارمانوں کا تاج محل بنالیا تھا.....

مگر یہ تاج محل چند لمحوں میں ہی مٹی کے تودے کی طرح

تکٹن ہوں ہو گیا تھا۔

اسی وقت کیر وین لیب خود بخود بجھ گیا اور خیمے

کا اندر اندر جیر اچھا گیا۔

”تاج نکالو قہیل.....“

”آں..... ہاں.....“ میں خیالوں سے چونک

کر رہا تھا۔

پھر میں نے تاج نکال کر روشن کر لی..... رحیم بابا

”اب نکلو یہاں سے گھر چلو.....“

میں ان کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آیا تو تھوڑی

دیر چلنے کے بعد رحیم بابا نے آہستہ سے کہا۔

”پرسوں دو پھر میں جس کتے نے تمہارا راستہ

بلا دیا..... وہ بھی جان لیوا کا ہی روپ تھا..... تاکہ تم دیان

دھیر نہ دکھا سکو۔“

”اوہ.....“ میرے منہ سے نکلا۔

دس منٹ بعد میں اور رحیم بابا گھر میں خاموشی

پھیلے ہوئے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔

میرے ذہن میں بہت سے سوالات تھے، لیکن

میں اب کوئی گہری سوچ میں گم نہ کر رہا تھا، خاموش ہی رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

”کھیل بیٹا..... جب تم نے اس لڑکی کی کہانی

سنائی تھی تو میں اسی وقت جان لیوا کی اس چال کو سمجھ

چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے تمہارے ساتھ جنگل میں چلنے کا ارادہ کیا۔“

”اگر آپ نہ ہوتے تو شاید آج میری زندگی کا

آخری دن ثابت ہوتا.....“ میں کانپ اٹھا۔

”نہیں.....! رحیم بابا بولے۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔“

”جی..... کیا مطلب.....؟“

”ہاں..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔“ انہوں نے

کہا۔

”اگر تمہیں کچھ ہوتا تو خود اپنی ہی وجہ سے ہوتا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں سمجھا ہوں.....“ انہوں نے سر ہلایا۔

”دراصل جان لیوا کسی وہم کی طرح ہے۔ اس

نے تمہیں اس دیرانے میں آنے پر آمادہ کرنے کے لئے

اتنا لمبا چوڑا پتھر چلایا تھا کیونکہ جب اس ماحول میں وہ شالا

سے تبدیل ہو کر اپنے اصل روپ میں آتا تو پھر تمہارے

ساتھ جو کچھ بھی ہوتا اس کے ذمہ دار تم خود ہوتے..... اگر تم

ڈر جاتے تو تمہارے دل کی دھڑکن خوف کے مارے بند

ہو سکتی تھی..... اور اگر تم دیر ہی سے اس کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال دیتے، تو وہ اسی طرح غائب ہو جاتا، جس

طرح میرے خیمے کے اندر آنے کے بعد غائب ہوا تھا۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے.....“ میں نے طویل

سانس لے کر کہا۔

”اب میں کچھ سمجھ رہا ہوں۔“

”وہ تمہارا بھی دشمن ضرور ہوگا..... وہ تمہیں بھی ختم

کرنا چاہتا ہوگا..... کیونکہ اب تم ہی اپنے خاندان کے

واحد ایسے فرد بنے ہو جو شالا کا قہقہہ کی نسل کو آگے

بڑھا سکتا ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو تمہارے خاندان

کا نام و نشان مٹ جائے گا..... اور شالا کا قہقہہ ہمیشہ کے

لئے ختم ہو جائے گا لیکن جان لیوا تم پر براہ راست حملہ نہیں

کر سکتا۔“

”اس کی وجہ.....؟“ میں پوچھ بیٹھا۔

یہ سن کر رحیم بابا مسکرائے اور بولے۔

”اس کی وجہ یہ ہے کہ تم اب نوری علم کے ذریعہ سبھی ہو..... کالے علم کے اثرات تمہارے باپ کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔“

”میں اب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اور اب میں..... جان لیوا کے مقابل آنا چاہتا ہوں۔“

”جان لیوا کے مقابل؟“ رحیم بابا نے سوالیہ انداز میں دہرایا۔

”ہاں رحیم بابا.....“ میرے لہجے میں عزم تھا۔

”میں نے تجھے کر لیا ہے کہ اب یا تو خود مر جاؤں گا، یا پھر مارڈالوں گا۔ اس کے لئے یہ نئے نئے پیترے اب میرے لئے ناقابل برداشت ہو چکے ہیں.....

اگر آج آپ نہ ہوتے تو میرا نہ جانے کیا حال ہوتا۔ اس نے شالا کے فرضی وجود میں خود کو ڈھال کر میرے دل کو دھوکا دیا ہے آپ یقین کریں کہ میں شالا سے مل کر اپنے

سارے غم بھلا بیٹھا تھا۔ میں اس سے شادی کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا چاہتا تھا..... لیکن..... اس نئی زندگی کا خواب میرے لئے دھوکا تھا..... فریب تھا۔“

”تم کیا کرنا چاہتے ہو.....؟“

”مجھے جان لیوا سے مقابلہ کرنا ہے۔“ میں نے پر عزم لہجے میں کہا۔

”یا تو میں مارڈالوں گا یا مر جاؤں گا۔“

یہ سن کر رحیم بابا کچھ سوچنے لگے، پھر بولے۔

”سوچ لو..... یہ اتنا آسان نہیں ہے، تمہیں مشکلات کے پانچ بیٹے پڑیں گے۔ قدم قدم پر تمہیں رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا، اور مقابلے کے لئے تمہیں مرحلوں سے گزرنا پڑے گا۔“

”مشکلات تو اب بھی میرا دامن پکڑے ہوئے ہیں رحیم بابا۔“ میرا لہجہ شکایت بھرا تھا۔

”ایک بات تو میں آپ کو بتانا ہی بھول گیا۔“

”کیا بات ہے..... بتاؤ۔“

”میں نے انہیں کرائے داروں کے متعلق بتا دیا

وہ خاموشی سے سنتے رہے اور سر ہلا کر بولے۔

”میں سمجھ گیا ہوں..... خیر..... انہیں جانے دو۔“

”لیکن رحیم بابا..... اس طرح تو ہم بھوکے مرجائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”اس طرح کے حالات رہے تو جلد ہی دنیا سے رخت سفر باندھ لیں گے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا..... کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اسے پھر کرائے پر اٹھا دیں گے۔“

”لیکن وہ بھی نہ رہ سکیں گے۔“ میرا لہجہ زیر خند تھا۔

”یہ جان لیوا ہماری بے بسی کا تماشہ دیکھنا چاہتا ہے کرائے داروں کو بھگانے میں ضروری کا ہاتھ ہے۔“

”ہاں..... میں جانتا ہوں..... رحیم بابا بولے۔

”تو پھر..... میں اب آریا پار کرنا چاہتا ہوں۔“ میں زنج ہو کر بولا۔

”میں ڈٹ کر اس کا مقابلہ کروں گا۔“

”یہ بہت مشکل ہے بیٹا..... وہ بولے۔

”تم کہہ تو رہے ہو لیکن..... عمل کے میدان میں اترنے کے لئے تمہیں بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔“

”میں تیار ہوں.....“ میرا جواب تھا۔

”آپ یہ بتائیں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”بتا دوں گا۔“ انہوں نے کہا۔

”حویلی کا وہ حصہ خالی ہونے دو..... میں وہیں تمہیں بتا دوں گا کہ کیا کرنا ہے۔ تم اپنے اخراجات کی پرواہ مت کرو۔ یوں سمجھ لو کہ میں تمہاری حویلی کا وہ حصہ کرائے پر لے رہا ہوں۔“

”لیکن..... آپ یہ سب کیسے کریں گے؟“

”یہ میں اسی وقت بتاؤں گا جب تمہارے کرائے دار مکان خالی کر دیں گے۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”کیونکہ مجھے بھی تمہارے ساتھ ہی رہنا پڑے

گا۔ اب میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ جان لیوا حد سے گزر رہا ہے..... اور اب اسے انجام سے دو چار کرنا بہت ضروری ہے۔“

☆.....☆.....☆

اور پھر کرائے داروں نے حویلی کا حصہ خالی کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ان کے جاتے ہی اماں جی کے چہرے پر اداسی پھیل گئی..... میں ان کی دلی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا، چنانچہ میں نے انہیں دلا س دیا۔

”اماں جی..... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے دوسرا کرائے دار فوری طور پر ڈھونڈ لیا ہے۔“

”کیا واقعی؟“ انہوں نے چوہک کر میری طرف دیکھا۔

”ہاں..... میں نے کہا۔“

”آپ بالکل ٹھیک مت کریں۔“

”اچھا.....! وہ کون لوگ ہیں.....؟“

”کل آئیں گے..... میں آپ سے ملوا دوں گا۔“

”کیا تمہارے جاننے والے ہیں.....؟“

”جی ہاں..... بہت قریبی.....“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”اماں جی..... ایک بات کہوں.....؟“

”ہاں بیٹا..... بولو۔“

”دراصل بات یہ ہے کہ جب تک ہم لوگ دشمن کی زد میں ہیں اور وہ ہماری تاک میں ہے تو ہم اسی طرح پریشان رہیں گے ہمارے یہ مسئلے اس وقت حل ہوں گے جب ہم مضبوط ہوں اور دشمن کمزور۔“ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”دشمن.....؟“

”ہاں..... میں شجید کی سے بولا۔

”میرے خاندان کوٹی میں ملا دینے والا ابھی آرام سے نہیں بیٹھا..... اس نے میرے باپ کے

ذریعے میری بہنوں کو ہلاک کر دیا اور پھر تمہارے ہاتھوں اباجی کو بھی انجام سے دو چار کر دیا۔“

”تم نے..... تم نے پھر وہی بات کی.....؟“

”ہاں..... میں یہی بات کہوں گا۔“ میرا لہجہ تیز تھا۔

”کیونکہ میں اس قتل کا چشم دید گواہ ہوں.....“

آپ اس وقت اپنے ہوش میں نہیں تھیں..... اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت وہ اسے آپ پر حاوی تھی..... خیر.....

آپ اس بات کو مانو یہ نہ مانو..... لیکن اب وہ مجھ پر اپنے داؤد آزار مار رہا ہے..... کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن آپ مجھ سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔“

”ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو.....“ وہ بے ساختہ ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

”خاموش ہو جاؤ۔“

”خاموش ہونے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا، ماں جی۔“ میں طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”وہ ایک دن کاری دار کرے گا اور.....“

”دیکھ لو..... آپ کے اندر سننے کی سکت نہیں ہے، تو ہوتے ہوئے کیسے دیکھو گی..... اس لئے اپنے دل کو مضبوط کر دو اور غور سے میری بات سنو..... رحیم بابا بہت اچھے انسان ہیں، بلکہ انہیں فرشتہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ وہی اب ہمارا گھر کرائے پر لے رہے ہیں اور وہ مجھے جان لیوا سے مقابلہ کے قابل بنائیں گے۔“

”رحیم بابا.....؟“

”ہاں..... میں نے سر ہلایا۔

”اب وہی اس معاملے میں میری مدد کریں گے۔ اور میں اس میدان میں اترنے سے پہلے آپ کی رضا مندی چاہتا ہوں۔ کیونکہ چوہے کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ شہر کی طرح مقابلہ کیا جائے۔“

یہ سن کر اماں جی کسی سوچ میں ڈوب گئیں پھر کافی دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا اور پر عزم لہجے میں بولیں۔

”ٹھیک ہے..... میں تمہیں اجازت دیتی ہوں۔“

تم اس کا مقابلہ کرو اور اسے نیست و نابود کر دو۔“

رحیم بابا کے آنے سے ہمارے گھر میں رونق سی آگئی تھی، انہوں نے اماں جی کے ہاتھ میں جب ایڈوانس کی رقم رکھنی چاہی تو وہ خوار ہو گئیں۔

”میں یہ ہرگز نہیں لوں گی کیونکہ یہ آپ ہی کا گھر ہے اور آپ میرے بھائی ہیں.....“

”جب بھائی کہہ دیا تو یہ بہن کا حق ہے، جو میں  
دے رہا ہوں۔“ رحیم بابا بولے۔

”میں نے قاسم میاں کے یہاں جب سے نوکری کی ہے، میری تنخواہ میرے پاس جمع ہوئی رہی، کیونکہ میرا ہے کون کہ جس پر میں خرچ کرتا..... اب تو موقع ہاتھ لگا ہے کہ میں اس رقم کو کسی کام میں لاسکوں..... ورنہ میرے لئے تو اتنی رقم کافی ہے کہ میرا کفن آجائے۔ اور مجھے اب کیا کرتا ہے۔“

”خدا آپ کو کسی عمروے ایسی باتیں نہ کریں۔“  
 ”مرنا تو ہے ایک دن..... اور یوں بھی موت  
 کو یاد رکھنا ضروری ہوتا ہے خیر..... ابھی آپ یہ رکھ  
 لو بہن..... اور میں اپنا نہ کر ابھی دوں گا میں یہاں رات  
 میں آیا کروں گا، کیونکہ میں دن قاسم میاں کے گھر کا کام  
 سنبھالنا ہے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اچھی خاصی رقم زبردستی اماں جی کے ہاتھ پر رکھ دی مکان خالی ہو چکا تھا، چنانچہ وہ میرے ساتھ اسی حصے میں آ گئے..... اور ہال نما کمرے میں پہنچ کر بولے۔

”بس..... یہ کمرہ ہی ہمارے کام کا ہے..... یہیں  
سے ہمارے مشن کا آغاز ہوگا۔ اور مجھے امید ہے کہ جلد ہی  
جان لیوا سے آمناسا منا ہو جائے گا۔“

”جتنی جلدی ممکن ہے چڑھ گیا۔۔۔؟“  
 ”جتنی جلدی تم۔۔۔۔۔ عملیات پر عبور حاصل  
 کر لو گے۔۔۔۔۔ کیونکہ صرف عملیات ہی کے ذریعے اسے  
 قابو میں کیا جاسکتا ہے۔“

اور پھر..... میں نے عملیات کی دنیا میں قدم رکھ  
 دیا..... رحیم بابا کسی ڈیوٹی کی طرح اپنی آمدورفت

نہاڑ ہے تھے..... دن بھر قاسم ماموں کے گھر میں رہتے  
اور رات کے وقت حویلی آ جاتے۔

میں ابتدائی عملیات سے گزر رہا تھا..... رحیم بابا میرا ذہن اس طرف مائل اور مرکوز ہونے کے طریقے استعمال کر رہے تھے۔

لیکن یہ سب کچھ خیر کے نسخے تھے، یعنی شر سے فکر لینے کے لئے خیر کی پرورش ہو رہی تھی۔

مجھے آج بھی یاد تھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں میرے  
باپ کی جان گئی تھی اور جس نے ان کی جان لی تھی میں اب  
خود اس کی جان کے درے تھا۔

مختلف عملوں کے ساتھ ساتھ رحیم بابا خود اعتمادی پر بھی بے تحاشہ زور دیتے تھے..... اور پھر ایک دن انہوں نے مجھ سے کہا۔

”اب تم تیار ہو جاؤ..... آج رات میں تمہیں ایک اہم چل بتاؤں گا..... اور اسے تم کا تاریک دن تک کرتے رہو گے۔ اس کے بعد تم میرے ساتھ قبرستان چلو گے جہاں تم نے آخری چل کاٹا ہے۔“

”ہاں.....!“ انہوں نے گردن ہلائی۔  
”اس کے بارے میں وہیں بات ہوگی.....“

رہیم بابا چلے گئے، اور میں سوچ میں ڈوب گیا..... میں جس راستے پر چل نکلا تھا، اس کے بارے میں کبھی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میرا باپ بھی عملیات کا ماہر تھا، لیکن اس کی وقتی محبت اور شفقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں اس جے میں چلا آتا تھا۔ ورنہ ذاتی طور پر مجھے ان سب چیزوں سے کوئی بچہ ہی نہیں تھی۔

لیکن آج میں اسی حصے میں بیٹھ کر رحیم بابا سے  
عملیات سیکھ رہا تھا.....

رجیم بابا کو گئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ  
ماں جی آ گئیں۔

مجھے ان کے تیور کچھ ٹھک نہیں لگ رہے تھے، وہ

مجھے خون خوار نظروں سے دیکھ رہی تھیں، پھر اچانک ہی مجھ پر ہنس پڑیں۔

”میں نے تجھے منع کیا تھا نا کہ اپنے باپ کے نقش قدم پر مت چلنا۔ لیکن تو نے میری ایک نہ سنی۔ اب تو زندگی بھر مجھ سے بات نہ کرنا۔۔۔۔۔ ہاں۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”لیکن اماں جی..... میں تو آج کی اجازت سے  
یہ کام کر رہا ہوں..... میں آپ کو سب کچھ بتا چکا ہوں۔“  
”ہاں..... میں جانتی ہوں..... تم نے مجھے  
بتا دیا تھا۔“ وہ قدرے نرم ہو کر۔

”لیکن میں اس وقت شاید ہوش میں نہ ہوں  
گی۔۔۔۔۔ اب میں اپنے ہوش و حواس میں تمہیں حکم دے  
رہی ہوں کہ تم ان چیزوں سے دور ہو۔ کیا تم نے اپنے  
باپ کا انجام نہیں دیکھا تھا؟ کیا تم وہ سب کچھ بھول  
گئے؟“

”نہیں..... اماں جی..... مجھے سب کچھ یاد ہے..... اور ان ہی یادوں نے مجھے اس بات پر مجبور کیا کہ میں اس ستر حلوں“

”چھوڑ دو یہ راستہ.....“ انہوں نے سخت لہجے میں

”اور جیم بابا کو بھی بھگاؤ یہاں سے۔“  
یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور میں انہیں نکتہ تارہ گیا تھا۔  
تھوڑی دیر بعد میں خود بھی اماں جی والے حصے  
میں چلا آتا تھا، لیکن، خلاف توقع ان کا موڈ ناٹل تھا جب

انہوں نے دوبارہ اس موضوع کو نہیں چھیڑا تو میں سمجھ گیا کہ یہ اسی "جسم بوجوہ" کی کارستانی رہی ہوگی۔

چنانچہ اس کی طرف جانکا..... سدو نے مجھے

”بیٹا..... اتنے دنوں بعد شکل دکھا رہے ہو.....“

خود تمہارا امتحان لے رہا تھا..... محنت کیا ہوئی، تم نے

تو اپنے دوست کو بھی بھلا دیا..... ہاں بھی۔“

”مثلاً میرے لئے صرف اور صرف ایک ڈراؤنا خواب تھا۔“

”کیا مطلب.....؟ میں سمجھا نہیں۔“ اس نے  
حریت سے مجھ کو کہا

”اور مزرے کی بات یہ ہے کہ میں سمجھا بھی نہیں  
سکتا.....“ میں نے ایک طویل سانس لی، پھر اس کے  
کنہ سے راتھہ ہاتھ مار کر کہا۔

وہ صرف ایک دھوکا تھا، فریب تھا۔“

”ہو سکتا ہے؟“

”وہ دنیاں ایک بدروح سی.....“ میں سنجیدی سے بولا۔

”ہاں..... میں جس سے ملا تھا، اس لڑکی کا اصل وجود تو کئی سال پہلے دنیا سے ہی رخصت ہو چکا تھا.....“

”کیوں ڈر رہے ہو مجھے.....“ وہ ہنسی کر بولا۔  
 ”تم تو اس کی محبت میں دیوانے ہو چکے تھے،  
 پھر یہ راز کیسے کھلا؟“  
 ”مجھ دیوانہ، نہ اتنا کہ لوگ کہتے ہیں۔“

”کیا تم مذاق کر رہے ہو.....؟“  
”کیا تم کو لای آ رہی ہے.....؟“ میں نے اسے  
مگھورا۔

”میں دیان سے پوچھوں.....؟“  
 ”نہیں..... بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس کہانی کو دفن  
 کر دو..... اب کوئی اور بات کرو!“

”اچھا..... یہ بتاؤ کہ اگر شالا نہیں ملی تو پھر تم کہاں غائب تھے؟

”اسی کے غم میں رہا اور اتنا تھک رہا کہ فتنہ نہیں ہو سکا۔“



کہ تم خود کمر ہر حال چال پوچھ لیتے؟“  
”میں نے سوچا کہ رنگ میں بھگ کیوں ڈالوں  
جب عشق کا بھوت اترے گا تو خود ہی تمہیں میری  
یاد ستائے گی۔“  
”وہ واقعی بھوت تھا۔“ میں نے ایک طویل  
سانس لی۔

”لیکن عشق کا نہیں بلکہ۔۔۔ حقیقی بھوت۔“

☆.....☆.....☆

رجیم بابا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق  
میں نے چھری پر پھونک مار کر اپنے گرد حصار کھینچنا شروع  
کر دیا۔

میں اس وقت کمرے کے عین وسط میں موجود تھا  
اور میرا منہ دروازے کے رخ پر تھا۔۔۔ اسی کمرے کے  
ایک کونے میں رجیم بابا آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔

یہ حصار دراصل میرے اپنے گرد کا حفاظتی حصار  
تھا۔۔۔ رجیم بابا نے مجھے عمل شروع کروانے سے پہلے  
بہت کچھ سمجھایا تھا اور پھر آخر میں کہا۔

”کچھ بھی ہو جائے، لیکن تمہیں اس دائرے سے  
باہر نہیں نکلنا۔۔۔ خود میں بھی اگر تمہارے سامنے دم  
توڑ رہا ہوں، تو بالکل پرواہ مت کرنا۔۔۔ کیونکہ مجھے پورا  
یقین ہے کہ تمہیں اس عمل سے روکا جائے گا۔۔۔ یہ عمل  
تمہیں یہاں تین دن مسلسل کرنا ہے اور پھر ایک آخری  
مرحلہ ہوگا جو کافی کھن ثابت ہوگا۔“

”اس میں کیا کرنا ہوگا رجیم بابا۔۔۔؟“ میں  
قدرے پریشان ہو گیا۔

”وقت آنے پر بتاؤں گا۔“ انہوں نے کہا۔  
”ابھی جو کل تم حصار کھینچ کر کرنے والے ہو۔۔۔

یہ بھی اتنا آسان نہیں ہے۔۔۔ اس کے دوران تمہیں کچھ  
ایسی چیزیں نظر آسکتی ہیں، جو تمہیں ڈرا کر، یا پھر پریشان  
کر کے اس عمل سے روکنے کی بھرپور کوشش کریں گی۔۔۔  
لیکن تم نے کسی بات کا کوئی اثر نہیں لینا۔۔۔ جو کچھ بھی  
ہوتا رہے۔۔۔ تمہارا دھیان صرف اپنے ورد

پر ہونا چاہئے۔“

”جی۔۔۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔۔۔“ میرا  
لہجہ مضبوط تھا۔  
”کیونکہ میں نے اپنے دل سے ڈر نکال دیا ہے  
میں اب جان لیوا کا سامنا کرنا چاہتا ہوں۔“  
”شباباش۔۔۔ مجھے تم سے یہی امید ہے۔“ وہ  
بولے۔

”بارہ بجتے ہیں صرف تھوڑی دیر باقی ہے جیسے ہی  
میں اشارہ کروں، تم عمل شروع کر دینا۔“

اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی میں نے رجیم بابا کا بتایا ہوا  
وردیوں پر جاری کر لیا۔

ابھی مجھے پڑتے ہوئے تھوڑی دیر ہی گزری تھی  
کہ میرا حلق خشک ہونے لگا۔ اچانک ہی شدید قسم کی  
پیس کے احساس نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔

اب کیا کروں۔۔۔ میرا ذہن بھٹکنے لگا۔ لیکن  
اس عمل کو ابھی کئی گھنٹے جاری رکھنا تھا اور اس پیس کے  
ہاتھوں مجھے کچھ دیر بھی ورد کرنا بھاری لگ رہا تھا۔۔۔

میں نے خود کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش صرف کر دی۔۔۔  
ممکن تھا کہ اس عمل کی بدولت ہی میرا یہ حال ہو رہا ہو۔۔۔

چنانچہ میں نے حلق میں پڑنے والے کانٹوں کی طرف  
سے اپنا ذہن بکس رہا تھا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ حیرت انگیز طور پر میری  
پیس کی شدت خود بہ خود کم ہوتی چلی گئی میں کافی حیران  
تھا۔

ایک بار پھر میں جتنی یکسوئی کے ساتھ عمل میں  
مغروف ہو گیا اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ پیس عمل  
کی تکمیل میں پہلی رکاوٹ تھی۔ جسے میں نے قدرے  
مشکل سے دور کر لیا تھا۔

میں پڑھ رہا تھا۔۔۔ مسلسل پڑھتا جا رہا تھا۔۔۔  
میں کبھی آنکھیں کھول لیتا اور کبھی بند کر لیتا۔۔۔ کئی بار نیند  
نے بھی مجھ پر حملہ کیا، لیکن میں نے کمال ضبط سے اسے  
بھی خود سے دور بھگا دیا۔

ہر تھوڑی دیر بعد مجھے پیس کی شدت اس طرح  
محسوس ہونے لگتی تھی کہ اگر سنبھالنے کے سامنے نہ ہوتا تو میں اسے

ہلکا جاؤں۔۔۔ لیکن میں نے اس پیس کو مسلسل شکست دیتا  
رہا۔

آخر کار میں اپنا عمل مکمل کرنے میں کامیاب  
ہو گیا۔

یہ تین دن کا عمل تھا جو میں نے رجیم بابا کی نگرانی  
میں کامیابی سے پورا کر لیا تھا۔

چوتھے دن رجیم بابا آئے تو ان کے چہرے پر  
معمبر قسم کی سنجیدگی طاری تھی وہ مجھے کسی سوچ میں کم  
دکھائی دینے کو قیاس پوچھ بیٹھا۔

”کیا ہوا رجیم بابا۔۔۔ آپ کچھ پریشان دکھائی  
دے رہے ہیں۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔! وہ قدرے مسکرائے۔  
”میں پریشان نہیں ہوں۔۔۔ البتہ تمہارے لئے  
گرمند ضرور ہوں۔“

”میرے لئے۔۔۔؟“  
”ہاں۔۔۔؟“

”کیا آپ کو ایسا لگتا ہے کہ جان لیوا مجھے کوئی  
گزند پہنچا سکتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”انہوں نے چند لمحوں پر توقف کیا، پھر بولے۔  
”دیکھو۔۔۔ جو اس وقت تم کر رہے ہو۔۔۔ وہ  
ایک کھلی جنگ ہے اور جنگ میں دشمن کو کمزور سمجھنا ہے  
قوی ہے۔ اب تم جس اگلے عمل کا آغاز کرنے والے ہو  
وہ کسی حملے سے کم نہیں ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مقابل بھی  
دار کر سکتا ہے۔“

”اب تو اوکھلی میں سروے دیا ہے رجیم  
بابا۔۔۔! میں نے طویل سانس لی۔  
”اب موصول سے ڈرنے کا کیا فائدہ۔۔۔؟“  
”تم ٹھیک کہتے ہو۔۔۔! انہوں نے سر ہلایا۔  
”اب پیچھے ہٹنا بزدلی ہے۔۔۔ گویا میدان چھوڑ  
کر بھاگنے کے مترادف ہے۔“  
”بالکل۔۔۔! میں نے سر ہلایا۔  
”اس لئے آپ کسی اور طرف نہ سوچیں اور مجھے  
اگلیں کہ اب کیا کرنا ہوگا۔“

”اب ذرا مشکل مرحلہ ہے۔۔۔“ انہوں نے اپنی  
سفید داڑھی میں انگلیوں سے خدایا کیا۔

”ہمیں پرانے قبرستان جانا ہوگا۔۔۔ جہاں متواتر  
چالیس دن تک تمہیں چلہ کاٹنا ہے۔۔۔ اور عین ممکن ہے  
کہ چالیس دن سے پہلے ہی وہ تمہارے سامنے  
آجائے۔۔۔ کیونکہ اس چلے کے مکمل ہوتے ہی میں اس  
سے تمہارا مقابلہ کروادوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کامیابی  
سے چلہ کاٹنے کے بعد تم اسے آسانی سے زیر کر سکتے ہو۔“

”ہوں۔۔۔! تو کیا ہمیں چالیس دن تک  
قبرستان میں ہی رہنا ہوگا۔“

”نہیں۔۔۔ لیکن رات بارہ بجے سے پہلے وہاں  
موجود ہونا لازمی ہے۔۔۔ اور پھر وہاں سے فجر کے  
بعد ہماری واپسی ہوگی۔“ انہوں نے بتایا۔

”اوہ۔۔۔! میرے منہ سے نکلا۔  
”تو یہ بات ہے۔۔۔“

”ہاں۔۔۔! اب تم کمر کس لو۔۔۔“ وہ بولے۔  
”کیونکہ آج تمہیں اس چلے کے بارے میں  
تفصیل سے بتانے کے بعد میں کل سے تمہیں وہ عمل  
شروع کروادوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں تیار ہوں۔“  
”شباباش۔۔۔! وہ جوش سے بولے۔  
”کسی بھی موقع پر ہراساں نہ ہونا۔۔۔ میں  
تمہارے ساتھ ہوں۔“

☆.....☆.....☆

دوسرے دن رات کو میں رجیم بابا کے ساتھ گھر  
سے نکل کھڑا ہوا تھا، میرے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس  
میں رجیم بابا کی ہدایت پر کچھ ضروری سامان رکھا گیا تھا۔

اس روانگی سے اماں جی قطعی ناگوار تھیں کیونکہ رجیم  
بابا نے اس سلسلے میں کافی رازداری سے کام لیا تھا، اور ماں  
جی کے نیند کی آغوش میں جانے کے بعد ہی ہم دونوں باہر  
نکلے تھے۔

وہ رات نہ جانے کچھ زیادہ ہی تاریک تھی، یا پھر  
مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا ویسے آسمان کافی حد تک بادلوں

سے ڈھکا ہوا تھا اور اسی وجہ سے شاید چاند کی روشنی انہی بادلوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔

پرانا قبرستان یہاں سے کافی دور تھا، چنانچہ ایک رکشے میں بیٹھ کر ہم وہاں تک پہنچے تھے البتہ رحیم بابا نے تھوڑے فاصلے پر کھڑے رکوالیا تھا۔

یہ ایک نوا آباد علاقہ تھا۔ جہاں تعمیری کام جاری تھا اور کئی گھر اچھوڑے پڑے ہوئے تھے۔ شاید اسی بناء پر ان میں ابھی رہائش نہیں ہوئی تھی۔ یہاں لائٹ کا انتظام بھی ابھی بہتر نہیں تھا۔ اس کے باوجود لوگ یہاں کافی تعداد میں آباد ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ابھی خالی مکانوں اور اھوری اھوری چہار دیواریوں کا تناسب زیادہ تھا۔ اس علاقے سے ذرا ہی دور پرانا قبرستان موجود تھا۔

بھونکنے والے کتوں کی آوازیں گویا چاروں طرف سے گونجتی ہوئی محسوس ہورہی تھیں۔ لیکن رحیم بابا ان سے لاپرواہ تھے اور اپنے تلے ہوئے قدموں سے اندھیرے کا سینہ چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ میں ان کے عقب میں چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی پرانا قبرستان شروع ہو چکا تھا۔ کیروسین لیمپ کی روشنی میں یہ قبرستان مزید ہیبت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

کیروسین لیمپ رحیم بابا کے ہاتھ میں تھا۔ اور چند لمبے پہلے ہی انہوں نے اسے روشن کیا تھا۔ کیونکہ اب چاروں طرف اندھیرے کا راج تھا۔ دور دور تک سوائے کتوں کی ہڈیاں آوازوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یہ وہ قبرستان تھا جسے پرانے قبرستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کیونکہ اب یہاں کافی عرصے سے کسی کو دفنایا نہیں گیا تھا۔ اڑی اڑی خبریں کہ یہ قبرستان کچھ عرصے بعد سار کر دیا جائے گا۔

اب میں مکمل طور پر رحیم بابا کی ہمراہی میں قبرستان کے اندر داخل ہو چکا تھا جیسٹنگروں کی خوف ناک ”جھانکیں جھانکیں“ اب اور زیادہ گونجنے لگی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کانوں میں سوئیاں چھ رہی ہوں۔

”کیا تمہیں ڈر لگ رہا ہے؟“ فحشا رحیم بابا کی آواز میری ساعت سے ٹکرائی۔

میں چونک اٹھا۔

”جی نہیں رحیم بابا۔“

”ہوں۔۔۔ پھر اتنے خاموش کیوں ہوں؟“

”ماحول کا اثر ہے جناب۔۔۔“ میں طویل سانس لے کر بولا۔

”چاروں طرف اس قدر سناٹا اور خاموشی ہے کہ میری زبان بھی چپ ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔۔۔ یہ بات بھی ٹھیک ہے۔“ انہوں نے سر ہلایا۔

”انسان پر ماحول کا بھی بہت اثر ہوتا ہے۔۔۔ خیر آؤ۔۔۔ اس طرف آ جاؤ۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ایک ہموار جگہ کی طرف اشارہ کیا جو قدرے وسیع تھی اور اس کے قریب ایک بوڑھا اور گھناور گدکار دھرت موجود تھا۔

”کیا آپ یہاں پہلے بھی آچکے ہیں۔۔۔؟“ میں نے چلتے چلتے پوچھا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں یہاں متعدد دفعہ آیا ہوں۔۔۔ اور اس کے چپے چپے سے بہ خوبی واقف ہوں۔۔۔ میں نے کئی گھنٹے یہاں گزار دی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔!“ میرے منہ سے نکلا۔

”لیکن یہاں اکیلے رہنا تو بڑے دل گروے کی بات ہے۔“

”میں یہاں وہی چلے کاٹ چکا ہوں جواب تم کاٹنے جا رہے ہو۔“ انہوں نے انکشاف کیا۔

”میں تمہارے دشمن کو زیر کرنے کی کوشش کر سکتا ہوں، لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ کام خود کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ تم خود اپنے آباؤ اجداد کا بدلہ لوگے تو اسی طرح تمہارے دل کو ٹھنڈک مل سکتی ہے یوں بھی میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے رحیم بابا۔“ میں نے سر ہلایا۔

”میں تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس کا قصہ پاک

کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اسی ارادے نے یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔“

”تمہاری بات سن کر میں خوش ہوا۔“ وہ بولے۔

”اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور کامیابی حاصل کرو گے۔“

☆ ☆ ☆

اب صورت حال یہ تھی کہ رحیم بابا اسی بوڑھے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے تھے اور میں ان سے قدرے فاصلے پر کھینچے ہوئے حصار میں آلتی پالتی بار کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں ان کا تپا ہوا وظیفہ شروع کرنے ہی والا تھا کہ رحیم بابا کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”ٹھیکل بیٹا۔۔۔ میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ اسی حالت میں بیٹھے رہو اور میری بات غور سے

سنو۔۔۔ تمہارے سامنے کچھ بھی ہو جائے۔۔۔ لیکن تم اس دائرے سے مت نکلو۔۔۔ جو حصار کھینچا ہے اگر کسی بنا پر تم

نے اپنے جسم کا کوئی بھی حصہ اس حصار سے باہر نکالا تو کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ اگر تم یہ بھی دیکھ لو کہ

گوئی مجھے یعنی تمہارے رحیم بابا کو قتل کر رہا ہے تو تب بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا مجھے امید ہے کہ تم میری باتوں پر عمل

کرو گے اس بات پر عمل شروع کرو۔“

میں نے اپنی آنکھیں قدرے نیم وا کر لیں۔

اور پھر میرا درد شروع ہو گیا یہ وظیفہ اس سے کافی مختلف تھا

میں نے حویلی میں پڑھا تھا کافی دیر تک میں پڑھتا رہا

کہ کوئی واقعہ وارد نہ ہوا لیکن پھر اچانک ہی کسی کے رونے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں بری طرح

کھٹک اٹھا۔ میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے۔

وہ۔۔۔ کچھ ایسی ہی انسانی قسم کی آواز تھی۔ بے حد

ناک اور۔۔۔ کچھ عجیب سا تاثر تھا اس آواز میں۔۔۔

جہاں کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

ہاں وہ یقین تھا۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

میں چھوٹا تھا تو محلے میں نصرت خاں کے شوہر کا انتقال

تھا اور خود نصرت خاں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اسی طرح رویا

کرتی تھیں۔

میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تھا کیونکہ یہ

آوازیں اب بڑھتی ہی جارہی تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا

جیسے کوئی عورت روتی ہوئی کسی طرف قدم بڑھا رہی ہو۔

اور تیز۔۔۔ اور تیز میں بے چین سا ہو گیا البتہ میں

بدستور وظیفہ پڑھ رہا تھا۔

عین اسی وقت رحیم بابا کی آواز مجھے اپنے قریب

سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”دھوکا ہے ٹھیکل۔۔۔ اب سب دھوکا ہے۔ تم اپنا

کام جاری رکھو۔۔۔ کچھ بھر کے لئے بھی غافل نہ ہونا۔۔۔

خبردار۔“

میں مڑ کر دیکھ نہ سکا، کیونکہ اس حرکت سے بھی

انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ میں کسی بت کی

مانتار اپنی جگہ جما ہوا تھا۔

شاید کوئی تصور کر سکے۔۔۔ اس شگستہ حال قبرستان

میں آدمی رات کے وقت اس عورت کی آواز کس قدر

بھیا تک اور لرزہ خیز محسوس ہو رہی تھی۔

تھوڑی دیر گزرتی تھی کہ آواز اچانک ہی بند ہو گئی

اور چاروں طرف موت کا سناٹا چھا گیا۔

یوں بھی یہاں موت کا ہی راج تھا۔۔۔ ہاں۔۔۔

یہ پرانی اور بوسیدہ ٹوٹی پھوٹی قبریں مجھے موت کی کہانیاں

سنارہی تھیں۔

ایک بار پھر اس فضا پر جیسٹنگروں کی جھانکیں جھانکیں

غالب آ گئی اور میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

میرے ہونٹوں پر بدستور وظیفہ جاری تھا۔

میں نے وظیفہ ختم کیا تو صبح کا نور چاروں طرف

پھیلنے لگا تھا۔

عین اسی وقت رحیم بابا اٹھ کر میرے سامنے آ گئے

اور بولے۔

”کامیابی کی بیڑھی پر پہلا قدم مبارک ہو۔“

”جی رحیم بابا۔۔۔ شکریہ۔۔۔“ میرے منہ سے نکلا۔

”چلو اب گھر کا رخ کرتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”آس وقت سواری بھی ذرا مشکل سے ہی ملے



ایس اتیاز احمد - کراچی

## شب

نوجوان کے پاس اب قطعی وقت نہیں تھا اس کا قہقہہ رات کے اندھیرے میں قرب و جوار کو دھلا کر رکھ دیا، وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گیا تھا اسے پتا تھا کہ اصل سراغ لگاتے لگاتے پولیس تھک جائے گی۔

دوسروں کو بے وقوف سمجھنے والا..... خود بڑا بے وقوف ہوتا ہے..... ایک حقیقی کہانی

ایشینوں کے نیوز روم بند ہو جاتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا توئی وی والوں کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ ظاہر ہے وہ ایسے ہی مناظر خود بھی فلم بند کر سکتے تھے۔ وہ ہر رات دعا کرتا کہ ٹی وی ایشین سے متعلق ہر آدی خواب خرگوش میں کھو جائے تاکہ وہ جو کچھ منظر عام پر لانا چاہتا ہے اس کی بھجک بھی کسی کے کان میں نہ پڑ سکے۔ وہ اس کام میں مسلسل جدوجہد کر رہا تھا اور اب اسے اپنے کام کے تمام شب و فراز کا علم ہو گیا تھا۔ ٹریک اپنی یادداشت پر ہنستا اور خوف ناک مناظر اس کے دماغ میں رقص کرتے رہتے تھے۔ ابھی یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنی چادر کے نیچے دبکا بیٹھ رہا تھا۔ رول

شو پیکر خون آشام چکا دوڑ کی مانند ہو گیا۔ اس نے واقعتاً خون نہیں پیا تھا بلکہ اس نے بھیا تک منظر کی فلم بند کی تھی۔ سورج غروب ہوتے ہی وہ مردہ جسموں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس کا معمولی ٹرک پولیس سے رابطہ قائم کئے ہوئے تھا۔ پولیس نے اسے شہر میں ہر طرح کی معروفیت برقرار رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ ایک گاہر کیمرہ مین تھا۔ اسے توقع تھی کہ ایک دن اس کی کہانی نہ صرف اسے شہرت کی بلند یوں پر پہنچا دے گی بلکہ اس کے اپنے بچے وہ خوش حال اور دولت مند آدمی بن جائے گا۔ اس کی کہانی کا آغاز نصف شب کے بعد سے صبح بچے تک ہونا ضروری تھا۔ اس وقت تمام ٹی وی

ناساز ہو گئی۔

اس چلے کے دوران وہ مستقل حویلی میں ہی رہ رہے تھے..... انہوں نے قاسم ماموں سے ڈیڑھ ماہ کی باقاعدہ چھٹی لے رکھی تھی۔

انہیں بخار نے آلیا تھا..... جو کہ تھا بھی زوروں پر..... اپنی طبیعت سے زیادہ انہیں اس بات کی فکر لاحق تھی کہ میرے چلے کا کیا ہوگا..... کیونکہ اس میں ایک دن کی بھی غیر حاضری ساری محنت پر پانی پھیر دیتی۔

کافی دن چڑھے وہ گہری نیند سو رہے تھے..... میں آتے جاتے ان کا جسم چھوٹا تو یوں لگتا جیسے میرا ہاتھ چل جائے گا۔

اس نئی صورت سے میں بھی پریشان ہو گیا تھا۔ چنانچہ شام ہوتے ہی میں ایک ڈاکٹر کو گھر لے آیا۔

اس نے رحیم بابا کا باقاعدہ چیک اپ کیا، فوری طور پر ایک آپریشن لگانے کے بعد اس نے کچھ دوائیں دیں اور بولا۔

”کافی تیز بخار ہے، اور اس وقت اسی کی وجہ سے ان پر نیم بے ہوش طاری ہے..... خیر..... میں نے آپس ڈوز دے دی ہے جلد ہی بخار ہلکا ہوگا اور پھر انہیں یہ دوا دینی ہے..... پھر مجھے بتانا..... اگر طبیعت بہتر ہو جائے تو مجھے کل پھر بلوالینا..... کم از کم تین دن علاج کروانا ہوگا۔“

”جی بہتر.....“ میں نے سر ہلایا۔  
”..... اور جب یہ ہوش میں آجائیں تو انہیں کچھ کھلا کر دوایں دے دیتا میں اب چلتا ہوں۔“  
ڈاکٹر چلا گیا..... تو میں رحیم بابا کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا..... تھوڑی دیر گزری تھی کہ رحیم بابا کے جسم میں حرکت ہوئی اور پھر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میری طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے کہا۔

”تکلیل..... کیا وقت ہو گیا.....؟ ہمیں قبرستان جانا ہے۔“  
(جاری ہے)

کی..... آؤ۔“

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو یوں لگا جیسے پورا جسم اکڑ کر رہ گیا ہو۔ ہڈیاں کڑکڑانے لگیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ٹانگوں میں جان باقی نہ رہی ہو..... میں بھرپور قسم کی کوشش کے بعد اٹھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں نے اپنی کیفیت رحیم بابا سے چھپالی تھی..... پھر ہم دونوں نے سامان سمیٹا اور قبرستان سے باہر نکل آئے۔

اتفاق سے آبادی میں داخل ہوتے ہی ایک درکشہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

جلد ہی ہم حویلی کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ راستے میں رحیم بابا نے دھیمی آواز میں کہا۔

”تم نے کمال حویلی سے وظیفہ ختم کیا ہے..... آج تمہارا پہلا دن تھا..... میں جانتا ہوں کہ عورت کے بین کی آوازیں نے تمہارے وظیفے میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی..... بس..... تم ایسی تمام چیزوں کی طرف ہرگز دھیان مت دینا..... اسی میں تمہاری کامیابی ہے..... جیسے جیسے دن گزریں گے تو رکاوٹوں کے کئی پہاڑ تمہارے سامنے کھڑے ہوں گے..... تمہیں ان کو سر کرنا ہے۔“

”میں بھرپور کوشش کروں گا رحیم بابا.....“ میں بھی آہستہ سے بولا۔

رحیم بابا نے امید بھرے انداز میں سر ہلادیا تھا۔ اور پھر دن آہستہ آہستہ گزرتے چلے گئے..... میں اب اس قبرستان میں کافی حد تک مانوس ہو چکا تھا..... ایک بے حد طاقتور قسم کی دلیری تھی..... جو نہ جانے کہاں سے میرے اندر نمودار آئی تھی۔

اس دوران مجھے کئی طریقوں سے غافل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی..... ڈرایا گیا..... دھمکا گیا..... لیکن رحیم بابا کے دست شفقت نے مجھے کسی بھی موقع پر گھبرانے اور کوئی چوک ہونے کا موقع نہیں دیا۔

وہ میری کامیابی کا آخری ہفتہ تھا..... اب میری منزل زویاہ دور نہیں تھی کہ اچانک ہی رحیم بابا کی طبیعت



کرو۔ رول کرو۔ کمرہ سے متعلق افراد اس منظر پر ہر وقت نہیں پہنچتے تھے ایک حادثے کا منظر تھا اور اسے دوبارہ حقیقی انداز میں سامنے لانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

”وہ چھ بجے سے پہلے کسی سے نہیں ملتا۔“  
 ”بہر حال میں اس سے ابھی اور اسی وقت ملنا  
 چاہتا ہوں۔“ ٹریکرنے کہا۔

مستحق۔ رپورٹر اس نام کے پہلے حصے سے پکارتے تھے اس لئے کہ وہ پھر کا کھانا خرید کر لانا ان کے معمول میں شامل تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر محل کر رہتے تھے جیسے صرف اسی طرح اس کی خوشنودی حاصل ہو سکتی تھی۔ نہ معلوم کب ان کا مستقبل ٹریڈ کی فلم سے وابستہ ہو جائے۔

دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوف ناک باتیں بھی موجود ہیں۔ ”ٹریڈر نے کہا۔

گوسٹ نے ایک دراز جھکے سے کھولی اور فلم خریدنے کا فارم نکالا۔ ٹریڈر کا نام پر کرنے کے بعد اس نے دریافت کیا۔

چاہئے۔

”رات بھر کے کام کا معاوضہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے میرا خیال ہے میں نے پہلے ہی زیادہ پیش کش کر دی ہے۔“ ایڈیٹر نے روکھائی سے کہا۔  
”مکویا اگر میں ایک ہفتے میں ایسی فلم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو میری ضرورتوں کے لئے کافی ہوگی۔“ فریکر نے تلخ لہجے میں کہا۔

گوسٹ نے لا پرواہی سے کندھے جھٹک دیئے۔ ”قل کی وارداتوں کا صاف مطلب ہے ڈھیر سارا خون۔ رات کے کھانے پر دکھائے جانے والے پروگرام میں نہیں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ایسا منظر دیکھ کر ہمارا پروگرام دیکھنے والے اپنی بھوک ہی کھو بیٹھیں۔“

”میں اپنے کام میں محتاط ہوں۔“ فریکر نے کہا۔  
”میں نے ان زاویوں سے فلم بندی کی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”ٹھیک ہے ہم ابھی دیکھ لیتے ہیں۔“ گوسٹ نے ڈرامائی انداز میں اپنے ڈیسک آئیگر پر ہاتھ مارتا کہ فریکر بھی صورت حال سے آگاہ رہے۔ ایڈیٹر کا یہ دوسرا حربہ تھا۔ جس سے وہ فریکر جیسے کسمیرہ مینوں پر قابو پالیتا تھا۔ بعض اوقات پولیس والے اس واردات کی کہانی کو انتہائی بے زار کن بنا دیتے تھے اس لئے فلم کا تاثر بھی کم ہو جاتا تھا۔

لیکن اس بار جاسوس غیر متوقع طور پر باتونی ثابت ہوا۔ ”یہ فریکر تو خون آشام ہے۔ اس نے لاش کے معاملے میں ہم سے بھی اولیت حاصل کر لی۔ کیا ہم اس وقت آئیگر پر ہیں؟“

”ہاں۔“ ایڈیٹر نے کہا۔  
”خالی فریکر میری تمہارے پاس ہی موجود ہے؟“ ایڈیٹر کے حلق سے بے معنی آواز فلی جو غراہٹ سے مشابہت تھی۔

”اس سے کہو کہ فلم کا بغور مشاہدہ کرے۔ اس بار ایک عجیب قاتل ہے سے پالا پڑا ہے۔ اس نے لاش پر کچھ اس قدر کام دکھایا ہے کہ ہم تفصیلات کو زیادہ پھیلانا

نہیں چاہتے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ ہم لوگوں پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔“ جاسوس کی آواز سنائی دی۔  
”ہم اسے احتیاط سے پیش کریں گے۔“ گوسٹ نے وعدہ کیا۔

”کیا تم اس واردات کے بارے میں کوئی سرکاری بات بتا سکتے ہو۔“

”ابھی وقت نہیں آیا۔ فی الحال شناخت بھی عمل میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ لاش ایک ریزر تھا لیکن تمہیں کارڈنر کی رپورٹ کا انتظار کرنا پڑے گا اس سے پہلے کوئی بات نشر نہ کرنا۔“

”چونکہ ہم اس واردات کے بارے میں کوئی خیالی بات نہیں کہہ سکتے اس لئے فلم کی قیمت 75 ڈالر سے زیادہ ہونی چاہئے۔“ فریکر نے شکایت کی۔

”اب پرانے وقتوں کی جیسی بات نہیں ہے، کیا تمہیں کینڈی کی وہ کہانی یاد ہے جس نے میلی بیویں جنم لیا تھا؟“

”وہ بات دوبارہ منظر عام پر نہیں آ سکتی۔“ فریکر کی آنکھیں جھپکے لگیں۔ ”یہ 2006 کا واقعہ ہے۔ ممکن ہے 2007 میں پیش آیا ہو ان دنوں کینڈی ساحل کے ساتھ ساتھ گاڑی چلا رہا تھا کہ چانگ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چند لمحے سمندر کی چھاگ میں چھل قدمی کر کے محفوظ ہو۔ اس وقت صرف ایک کسمیرہ مین وہاں اتفاق سے موجود تھا۔ اس نے فلم بندی کی اور بعد میں اسی فلم کا اسے ایک ہزار ڈالر معاوضہ ملا تھا۔“

”وہ ایک اتفاق تھا۔“ گوسٹ نے کہا۔  
”اب ایسا اتفاق دوبارہ کبھی پیش نہیں آ سکتا۔ اب اسٹیشن بہت بڑے ہو گئے ہیں۔ اور فلم کا عملہ بھی بہت بڑھ چکا ہے۔“

”نہیں۔“ فریکر نے احتجاج کیا۔  
”اب بھی میرے پیشے کے لوگ کوئی اہم کہانی منظر عام پر لا سکتے ہیں۔“ گوسٹ تھپتھپ مار کر ہنس پڑا۔

ایک ہفتے بعد ایک اور لاش پائی گئی۔ اس لاش کا گلا بھی بری طرح کاٹ دیا گیا تھا اور اس منظر کی فلم بندی میں

بھی فریکر سب پر سبقت لے لیا گیا تھا جیل نے اسے اس فلم کی ایک سو ڈالر انعام کی تھی۔

ناگمرا اخبار، جس نے پہلی واردات کی خبر آخری صفحے پر دی تھی اس نے دوسرے قتل کی خبر سرخی کے ساتھ پہلے صفحے پر شائع کی۔ گلا کاٹنے والے قاتل کی واپسی پر سرخی فریکر کے لئے بہت اہم ثابت ہوئی کیونکہ ٹی وی کے لئے بہر حال یہ ایک سرکاری حوالہ تھا۔ قاتل کی خراب وقت کی اہم ترین خبر بن گئی تھی۔

جب تیسری لاش دریافت ہوئی تو فریکر نے ایک ہم پیشہ کسمیرہ مین کو ساتھ ملا دیا۔ اس بار اگرچہ فلم زیادہ اہم نہیں تھی لیکن ایڈیٹر کو یہ سو ڈالر دیئے پر آمادہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ دوسرے چینل سودے بازی پر آمادہ ہیں۔

فریکر اب ایک اہم کسمیرہ مین بن چکا تھا۔ اس نے مقابلے کی کبھی پروا نہیں کی تھی۔ وہ اس پیشے کے ساتھ ایک طویل عرصے سے وابستہ تھا اب اسے یقین ہو رہا تھا کہ قتل کی اگلی واردات اس کے لئے جادوئی نمر کی حامل ہوگی۔ ایک ایسا جادوئی عدد جو اس کے لئے خوش قسمتی کا مظہر ہوگا۔ ایک ایسی واردات جس کے ذریعے وہ بہت زیادہ کمائے گا۔ ممکن ہے اس واردات کی فلم کینڈی کی کہانی سے بھی سبقت لے جائے۔ اس نے یہ بات دل کی گہرائیوں سے محسوس کی تھی۔ خلاف توقع صورت حال بگڑ گئی۔ ٹی وی اسٹیشن نے پولیس سے ساز باز کر لی۔ ان کے درمیان ایک معاہدے نے جنم لیا۔ پولیس اس معاہدے کے مطابق ہمارا راست ٹی وی کے عمل کو ترجیح دے گی۔

”بہر حال۔۔۔۔۔“ گوسٹ نے فریکر سے کہا۔  
”دیوانے قاتل روزانہ ہی وارداتیں نہیں کرتے۔

اس کے علاوہ تم آزاد کسمیرہ مین نہیں لوگوں کے تاثرات کو اہم نہیں کر سکتے۔ اس حادثے کے دوران بعد میں کاشانیوں کی آوازیں بھی فلم کے ساتھ موجود ہوں تو فلمی عناصر میں حقیقت کا عنصر بڑھ جاتا ہے مجھے انفسوس ہے کہ اگر تم نے سودے بازی کا جو بازار گرم کر رکھا تھا وہ اب

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینے پڑیں گے۔“

فریکر نے دل میں سوچا اور پیشانی پر سلوشیں ڈال کر ایڈیٹر کو گھورنے لگا۔ اس بات سے بھی اسے جتنی سکون حاصل نہ ہو سکا۔ وہ بچپن برس کا ایک پیشہ ور پور تھا اس عمر میں عموماً دوسرے لوگ رہنا نہ ہونے کا منصوبہ بناتے ہیں جبکہ وہ ایک دیوانے قاتل اور اس کے شکار کا ستلائی رہتا تھا۔

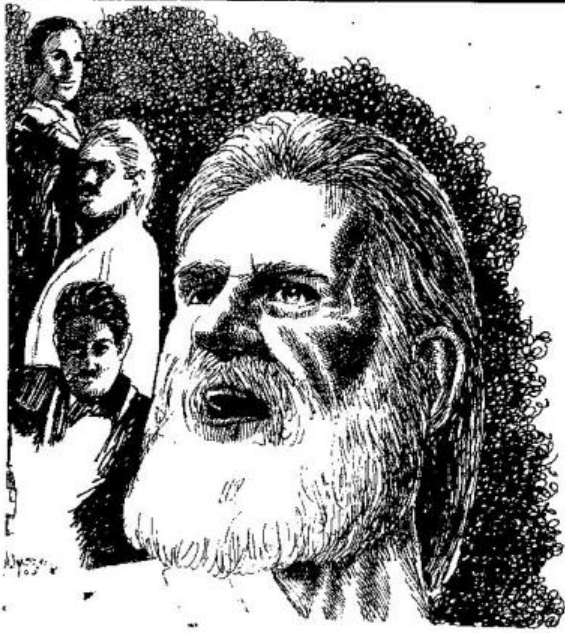
”مجھے مددگار رپورٹر بنانے کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ فریکر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔  
”تم جانتے ہو کہ کبھی تم بھی تمہارا عملہ بھی ناکام ہو سکتا ہے۔“

کشادہ آنکھوں سے ایڈیٹر نے اسے گھورا۔  
”تم۔۔۔۔۔؟ نہیں فریکر۔۔۔۔۔ اگر میرا ایک عملہ ناکام رہتا ہے تو میرے پاس ان کی مدد کے لئے دوسرے آدمیوں کی کمی نہیں ہے اور پھر تم یونین کے ساتھ وابستہ بھی نہیں ہو۔“ جب وہ نیو زروم سے باہر نکلا تو اس کا دماغ غصے سے کھول رہا تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹی وی کے عملے کو ہر حال میں نچا دکھائے گا۔

وہ تھا تھا کا سا اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر سوچ کی گہری سلوشیں تھیں۔ اور وہ غور کر رہا تھا کہ رات شروع ہونے میں ابھی کتنی دیر باقی ہے۔ کئی بیزار کن گھنٹے گزارنے کے بعد کہیں کام کا وقت شروع ہوگا۔ ایسے میں گھر جانے سے کیا فائدہ؟ صورت حال اس حد تک بگڑ گئی تھی کہ پیشہ ور رپورٹروں کا کام تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ فریکر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ریزہ ریزہ ہو گئی ہو۔

”میں بھی ان شرایینوں کی طرح آوارہ گرد ہو گیا ہوں۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا۔  
”بہر حال اب مجھے کسی نئے انداز سے کام شروع کرنا پڑے گا۔“ اس نے شہر کی طرف اپنی گاڑی پوری رفتار سے اڑانی شروع کر دی۔

اگلے روز صبح چارنج کرتیں منٹ پر اس نے گوسٹ کے گھر فون کیا۔  
”تمہیں میرے گھر کا نمبر کہاں سے ملا ہے؟“ ایڈیٹر غرایا۔



## آخری وقت

مہر پرویز احمد دلو-میاں چنوں

رات کے اندھیرے میں نشہ آور اشیا کھلا کر خاتون کو مدھوش کیا گیا اور پھر اس کے بعد خاتون کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، اندھیرے کا ہر سوراج تھا کہ اچانک ظلم کی دیوار گر گئی اس کے بعد.....

اچھائی بھلائی اور نیکی کبھی بھی رازیگان نہیں جاتی..... حقیقت کہانی میں پنہاں ہے

جن پہاڑوں کے درمیان وادی میں انہوں نے جنم لیا تھا وہ ان کی سوچ و فکر سے بھی بلند تھے۔ پورے علاقے کے لوگ دین کا علم حاصل کر کے دینی اور دنیاوی آسائش کو حاصل کرتے تھے۔ شعور کی حدود میں قدم رکھتے ہی ان کو گاؤں سے دور حصول علم کے لئے مدرسے میں داخل کروادیا گیا۔

پابندی کے شکنجے میں کسب کیا تو وہ بہت کسمپاسیا لیکن مقدر میں لکھی پابندیاں ختم نہ ہو سکیں۔

دلوں بھائیوں کے لئے دیگر رشتے داروں کی طرح دینی تعلیم لازمی قرار دی گئی، اس کے صدمے ان پر روزی کے دروازے ہوتے تھے، پورا گاؤں عالموں اور حافظ قرآن پر مشتمل تھا۔

یہاں کے بڑے لکھے نوجوان ملک کے طول و

ابرار شاہ شروع سے ہی مخفی تھا جبکہ باقر شاہ کو

”اس بات کو چھوڑو۔“ ٹرکیر نے کہا۔  
 ”میں ایک فیصلہ چاہتا ہوں ابھی اور اسی وقت۔“  
 ”کیا کوئی نئی واردات ہوگئی ہے؟“  
 ”تم ایک دوسرے قتل کی فلم کا کیا معاوضہ دو گے۔  
 دو ہتھول جن کے گلے کٹے ہوئے ہیں؟“  
 ”تم جانتے ہو کہ میرا عملہ کام کر رہا ہے۔“  
 ”دو ہر قتل اور قاتل سے مخصوص انٹرویو؟“  
 ”ہیں..... کیا کہا انٹرویو۔ کیا تمہیں یقین ہے؟“  
 ”میں دو ہزار معاوضہ چاہتا ہوں۔“ ٹرکیر نے کہا۔  
 ”کیڈنی کی فلم کا دو گنا معاوضہ.....“  
 گوسٹ کی طرف سے جواب ایک غراہٹ سنائی دی۔  
 ”میں اتنا بڑا فیصلہ ذاتی طور پر نہیں کر سکتا۔“  
 گوسٹ نے کہا۔

ٹرکیر کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور ان دونوں پر کیمروں کو کس کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔  
 ”میں چاہتا ہوں کہ مجھے ہمیشہ یاد رکھا جائے۔“  
 وہ زیر لب بڑبڑایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے چہرے پر شہرت کی روشنی صاف محسوس کی۔ اس نے آنکھوں سے پسینہ صاف کیا تاکہ وہ کیمروں کے ٹھیک سے سیٹ کر سکے۔ اسی لمحے ٹرکیر نے محسوس کیا کہ چینل کی تین نیوز ویگن آ رہی ہیں۔

اب اس کے پاس قطعاً وقت نہیں تھا۔ اس کا قہقہہ پل کے نیچے مسجد و جگہ میں گونج اٹھا۔ پولیس کو اصل قاتل کا سراغ لگاتے لگاتے ایک عرصہ گزر جائے گا وہ تمام چال بازیوں سے آگاہ تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟

چند لمحے وہ کھڑا موزوں ترین زاویے کا انتخاب کرتا رہا پھر اس نے جیب سے ایک تیز دھار ریزر نکالا۔ وہ آگے بڑھا دونوں آوارہ گرد بے ہوشی کی وجہ سے مداخلت کے قابل نہیں تھے۔ اس کے سامنے چند ہی لمحوں کے بعد دو لاشیں تھیں جن کے گلے کٹے ہوئے تھے اور وہ فلم بندی میں مصروف تھا۔



”بارہ سو سے زیادہ نہیں۔ یہ انتہائی معاوضہ ہے۔“  
 ٹرکیر مسکرایا۔ ”بارہ سو کا معاوضہ اسے وقت کا سب سے مہنگا پورٹریٹ بٹا دے گا۔ وہ جانتا تھا کہ کئی وی نے اس سے پہلے کبھی اتنی رقم ادا نہیں کی۔“ اس نے گوسٹ کو ابھریں دیا اور کہا۔  
 ”تمہارا عملہ وہاں کتنی دیر میں پہنچ جائے گا؟“  
 ”چند منٹ۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“  
 ”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔“ ٹرکیر نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا، وہ ٹیلی فون بوتھ سے باہر نکلا اور



عرض میں دینی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ ان دنوں بھائیوں پر بھی بزرگوں کی پیروی لازمی قرار دی گئی۔ ابرار شاہ نے محنت اور ایمان داری سے تعلیم حاصل کی اور دور کے ایک گاؤں میں جا بسا، جہاں امامت کے ساتھ دین اسلام کی تبلیغ بھی شروع کر دی۔ باقر شاہ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا، لیکن اسے بھی ایک گاؤں میں امامت مل گئی۔

انسان اور خاص کر مسلمان بڑے ہی سہل پسند، جلد باز اور بغیر محنت کے منزل کے حصول کے خواہاں ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق سب سے زیادہ موہاں فون پاکستان اور بھارت میں استعمال ہوتے ہیں۔ جبکہ یورپی ممالک میں اس کا استعمال بہت کم ہے۔ وہ اس لئے کہ قائمہ عظیم محمد علی جناح کے جس فرمان پر ہم پاکستانیوں نے عمل کرنا تھا کہ ”کام، کام اور کام اس فرمان پر انگریز کار بند ہیں۔“ فضول سرگرمیوں کے بجائے وہ کام، کام اور کام کرتے ہیں۔

یہ ان کا احسان ہے کہ آئے روز کی ایجادات سے مہینوں کا کام گھنٹوں میں دنوں کا سفر گھنٹوں میں ہو رہا ہے۔

کپڑے سینے والی سوئی سے لے کر جہاز تک ایجاد ہو چکے ہیں۔ لیکن انہوں نے ہمارے سربراہ بڑے فخر سے بیانات دیتے ہیں کہ ہم تیسری دنیا کے ممالک میں شامل ہیں۔ پاکستانی قوم کام کرنا تو جین اور جبری مشقت سمجھتی ہے۔

شہروں سے لے کر گاؤں، بہت سی گاؤں، ڈیرے، محلے، قصبے تک فارغ لوگوں کی فوج ظفر موج نظر آتی ہے۔ چوک، بازار اور ویکوں، رکشوں کے اسٹاپوں پر چائے کے ہوٹلوں، پیسٹریز کے پھنوں پر نو جوانوں کا جم غفیر نظر آتا ہے۔

فیکٹری، کارخانوں اور سرکاری وغیرہ سرکاری دفاتر میں کام کرنے والے جیلوں، بہانوں، قلم چھوڑ تحریکوں اور ہڑتالوں کے اسباب تلاش کر کے فارغ رہنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

ہماری خواہشات غریب کی دکھ بھری زندگی کی طوالت کی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ خوشحال زندگی کے حصول کے لئے کام کرنا سخت معیوب سمجھتے ہیں۔ چور دروازے سے ترقی کے زینے طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں بے شک محنت زیادہ کرنی پڑے، پیسے کا بے دریغ استعمال کرنا پڑے۔ اس کی پروا نہیں۔

☆.....☆.....☆

باقر شاہ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے باہر نکلے تو معصوم بچہ تھا۔ ایک خاتون سامنے آ گئی۔

”حضرت صاحب! بچہ بہت روتا ہے، دور دیکھ نہیں پیتا، اسے دم کر دیں۔“

حضرت صاحب نے دم کیا جبکہ دیگر نمازیوں نے پچھلیں ماریں۔

اگلے دن جب حضرت صاحب نماز سے فارغ ہو کر نکلے تو کل والی عورت مٹھائی کا ڈبہ لئے سامنے آ گئی۔

”باباجی! آپ کے دم سے میرے بچے کو آرام آ گیا ہے۔ میں اپنی خوشی سے یہ مٹھائی کا ڈبہ لائی ہوں، ڈبے کے ساتھ سوکا ٹوٹ بھی تھا دیا۔“

جبکہ اس کے ساتھ آئی عورت بچے کو دم کرانے کے لئے باباجی کے سامنے لائی۔ دم کرنے سے وہ بچہ بھی ٹھیک ہو گیا اور ایک بار پھر مٹھائی کا ڈبہ اور سوکا ٹوٹ لے گیا۔ حضرت صاحب مسجد سے شعل گھر پہنچے تو چارہ پانچ عورتیں وہاں موجود تھیں، جو مختلف امراض میں مبتلا ہو کر دم کرانے کے لئے آئی تھیں۔

حضرت صاحب پڑھ پڑھ کر پچھلیں مارنے لگے، جبکہ خواتین پچاس، سو کے ٹوٹوں کی صورت میں ہدیہ پیش کرتے لگیں۔

باباجی کے دم سے خواتین کو آرام آنے لگا، بچے خوشی سے قلقاریاں مچا رہے تھے۔ اور بدلے میں نذرانے کی مد میں ٹوٹوں کی بارش ہونے لگی۔

آئے روز کی مجبور خواتین اور بچوں کے دل نے بابا جی کو باقاعدہ تعویذ گنڈے پر مجبور کر دیا۔

ایک کمرے کو حجرے کا درجہ دے کر اسے باقاعدہ آنے والے حاضرین کے لئے مختص کر دیا۔

ہر آنے والے دن تعویذ گنڈے سے شفا یابی کا عمل پانے والی خواتین میں اضافہ ہونے لگا۔

نذرانہ مانگنے کے بجائے کھی کا خالی کنٹر لے کر اسے چندہ بکس کا نام دیا اور حجرے کے درمیان رکھ دیا۔

ہر آنے والی خاتون اپنی حیثیت کے مطابق تعویذ اور دم درد کرانے کے بعد حسب حیثیت کام کی

لاحیت کے حساب سے نذرانہ ڈالنے میں ڈالنی، باباجی نے خاص مرید اور مریدیاں بھی بنا لیں جو آنے والے

نارائین کو جلد کام اور تعویذ سے جلد اچھا اور زیادہ نتیجہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ نذرانہ دینے پر

مائل کرتیں۔ جتنا زیادہ نذرانہ کام جلد ہونے کے اتنے زیادہ چانس کے دعوے کئے جاتے۔

رات کو جب چندہ بکس کھول کر نذرانہ شمار کیا جاتا، ایسی چوڑی رقم برآمد ہوتی۔

عوام کو مزید قائل اور آگاہ کرنے کے لئے باباجی نے بہت بڑا بیٹا نکلس لکھوا کر دروازے کے ساتھ دیوار پر لٹا دیا۔

”من چاہی مراد گھنٹوں میں پوری، بے اولاد بھرات بچوں کی قلقاریوں سے محفوظ ہوں، محبوب آدموں میں، دنوں میں لکھ پتی نہیں، پرانے بانڈ پر پہلا انجام پائیں۔“

جھوٹ بچ کا لمبا چوڑا مضمون لکھ دیا جو پڑھنے والے کو بہت کرتا، خواتین پہلے ہی مرعوب تھیں۔ اب من بھی مرضی کے نذرانے کے عوض ٹوٹوں کی بیوہ بیٹیوں کو مدد کرنے لگے۔

جاہت کے پھول چنے کے خواہش مند در پر ابھری دے کر تسکین کے غوطے کھانے لگے۔ باباجی سے بھی دیوی سنبھائی مشکل ہو گئی۔

شہر سے پلاٹ لیا، گاؤں سے رقبہ خریدا، دھوم دھماکے سے شادی کی، کاروبار خوب چل نکلا۔

بات تعویذوں سے میری مریدی تک جا پہنچی، بیرو

کاروں کا جم غفیر صبح شام در پر حاضری دینے لگا۔ وقت کی دوڑ دھوپ میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے باپ بن گئے۔

بڑا بیٹا نو جوانی کی عمر کو پہنچا تو اسے بھی اپنے نقش قدم پر چلانے کے لئے ساتھ بیٹھا کرتا۔ خواتین و حضرات کو پروف بنانے کے گر سکھانے لگا، ساتھ ہی امام مسجد کے فرانس بھی سرانجام دینے لگا جبکہ چھوٹا بیٹا اسکول سے پڑھ کر کالج میں جا پہنچا۔

باقر شاہ اور بیٹوں کی شہرت نے دور دور تک لوگوں کو گرویدہ بنالیا۔ ابرار شاہ بھی بھائی اور بیٹیوں کے کثوت سے آگاہ تھا۔ وہ اکثر اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتا، لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے خوفناک نتائج سے آگاہ کرتا مگر اب وہ لوگ اس میدان میں بہت آگے نکل چکے تھے۔

وہ خود اکثر لوگوں کو ہدایت و رہنمائی سے بد اعمال سے پرہیز کرنے کی تلقین کرتا۔

باقر شاہ دولت کی گاڑی پر زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی بیوی چند دن بیمار ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔

بیوی کے فوت ہوتے ہی اس کی امامت پر پابندی لگا دی گئی، بڑا بیٹا باقاعدہ امام بن گیا، جبکہ باقر شاہ اب گھر تک محدود ہو گیا، صرف تعویذوں کی کمائی سے گزارہ چلانے لگا۔

گاؤں والے لکھ سادہ سہی، لیکن انہوں نے ایک عقل مندی کا فیصلہ کیا کہ باقر شاہ کے تعویذوں اور امامت پر پابندی لگا دی۔

”باقر شاہ اگر تم کو امامت کرنی ہے تو تعویذوں کا وعدہ کرتا ہے تو شادی کرو، ورنہ نایک رشتوں کے پاس ہم اپنی خواتین نہیں بھیجیں گے۔“

باباجی نے کاروبار بچانے کے لئے اور دولت کی بہتی ندی کے سامنے باندھا گیا، بند کرانے کے لئے ایک خاص مریدی سے شادی رچا کر ایک طرف تو مریدی کی پرانی خواہش پوری کر دی اور دوسری طرف گاؤں والوں کی

بوتی بند کردی۔

شادی کرنے کی دیر تھی کہ مریدوں اور سائین نے بارش کے لولوں کی طرح برسات شروع کر دیا۔

☆.....☆.....☆

ابراہیم شاہ ایک انتہائی نیک، پارسا اور مبلغِ فطرت انسان تھا۔

خدا ترس، معصوم، مجبور لوگوں کا ہمدرد، غمگسار، دکھ درد کے صحرائیں اور رحمت کی طرح برسنے لگا۔

جس مسجد میں امام تھا، مسجد کی آمدنی بڑھانے، اسے وسیع کرنے، حفظ و ناظرہ پڑھنے والے بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ساتھ ہی ایک مارکیٹ بنادی۔ دکانیں کرائے پر اٹھا دیں، جن کے کرائے سے مسجد کے اخراجات پورے ہونے لگے۔ اس مارکیٹ میں نہ تو

کسی ناانصافی کو شیعہ کرنے کے لئے دکان دی گئی اور نہ ہی کسی ویلے پوری ڈی کا کاروبار گیت، نفی، ڈرامے، فلمیں اور مجرا وغیرہ کی ریکارڈنگ کرنے والے کو دکان کرائے پر دی گئی۔

ابراہیم شاہ کا بیٹا بھی باپ کی طرح صوم و صلوة کا پابند، انتہائی نیک اور پارسا تھا۔ ابراہیم شاہ اکثر ملک کے طول و عرض تبلیغ کے سلسلے میں سفر کرتا۔

رشد و ہدایت سے لوگوں کی بھلائی کا فریضہ سر انجام دیتا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ کر کے لوگوں کو نیکی طرف مائل کرتا جبکہ گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتا۔

مقامی شر پسند، چور، ایچکے، بگڑے نوجوان، نشئی اور اوباش نوجوان ابراہیم شاہ سے نفرت کرتے۔ جب وہ تبلیغ کے سلسلے میں دورے پر چلے جاتے تو یہ لوگ سکھ کا سانس لیتے۔

اب کی بار جب شاہ کی تبلیغ پر جانے لگے تو مسجد کی مارکیٹ کے دکاندار بھی تیار ہو گئے۔ ان کے روانہ ہوتے ہی مارکیٹ کی دکانوں کو تالے لگ گئے۔

یہ اطلاع جب اوباش نوجوانوں کو ملی تو وہ خوشی سے جموم اٹھے، نفی کے لئے روپوں کی آمد کا سلسلہ چلنے کا امکان پیدا ہو گیا۔

پروگرام کے مطابق چند نوجوانوں نے آدمی رات کے وقت مارکیٹ کا رخ کیا۔

تالا توڑنے کے اوزار، ہتھوڑے، سریے وغیرہ سنبھالے جب قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر دکان کے سامنے ایک سفید لباس اور پگڑی باندھے بزرگ کھڑا ہے، جس کے ہاتھ میں بڑی لمبی لٹاخی ہے۔ وہ ذکر اللہ کرنے کے ساتھ پھر دوسرا ہے۔

ان لوگوں نے کافی دیر ان کے جانے کا انتظار کیا، مگر بے سود۔

صبح جب مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی تو یہ لوگ ناکام گھروں کو لوٹے۔

اس ناکامی کے بعد ایک بزرگ کی بھیمنس تھی جس کو چارہ اس کی بیوی ذاتی تھی جبکہ وہ شاہ جی کے ساتھ گئے ہوئے تھے۔

ان نوجوانوں نے وہ بھیمنس رات کو چوری سے کھولی، ڈالے میں ڈال کر دور ایک سماجی کے گھر چھوڑ آئے۔ اس دوست نے بھیمنس بیچنے کی بہت کوشش کی لیکن جرائم پیشہ لوگ تھے اس لئے کوئی بھی بیوپاری خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔

”چلے“ چالیس دن پورے ہونے میں دو دن باقی تھے کہ ایک بیوپاری بھیمنس خریدنے آیا۔ بھیمنس کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

”یہ تو فلاں بزرگ کی بھیمنس ہے جو ابراہیم شاہ کے ساتھ تبلیغ پر گیا ہوا ہے۔“ اتنا سننا تھا کہ وہ شخص سخت پریشان ہو گیا۔

بیوپاری کے روانہ ہوتے ہی بھیمنس لانے والوں سے رابطہ کیا، وہ لوگ آکر بھیمنس کو واپس گاؤں لا کر متعلقہ بزرگ کے دروازے پر چھوڑ کر واپس ہو گئے۔

صبح جب وہ بزرگ گھر پہنچے تو بھیمنس کو دروازے پر کھڑے پایا۔

☆.....☆.....☆

باقرا شاہ کی بیوی جب باقاعدہ زوجیت میں آئی تو اس کے تہ بدیل گئے۔ پہلے تو وہ ہاتھ پاؤں چومتے نہ تھے

پاؤں کی دھول کو بھی روپوں کے عوض بیچتی، اور شان گھر کی روپوں کے عوض بیچتی۔

شاہ کی بیوی نے ان کے لئے روپوں کی آمد کا سلسلہ چلنے کا امکان پیدا ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر ایل، حکیم مولانا ہارین طبک ہدایت لکھی گئی منفی کتاب

## دل کی بیماریاں

قیمت - 100 روپے

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی سختی و ہائی بلڈ پریشر، غذائی 5 تبدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تلخیاں اور ہارٹ ایکٹ، مرض دل کا سن کر

اوسان خطانہ کریں، دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ ایکٹ کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں بچوں میں دل کی بیماریاں، بائی پاس سرجری اور فرائیڈ

چکن، امیر جنسی تدابیر، صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھانے کا غذا سے علاج، دل کی سوچن، درم غلاف

القلب بخیری کارڈائیس، دل کی سوچن، درم قلب، دل کی عضلہ کی سوچن کارڈائیس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں جاننے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

دعابک کارنر 5 فیصل آباد

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

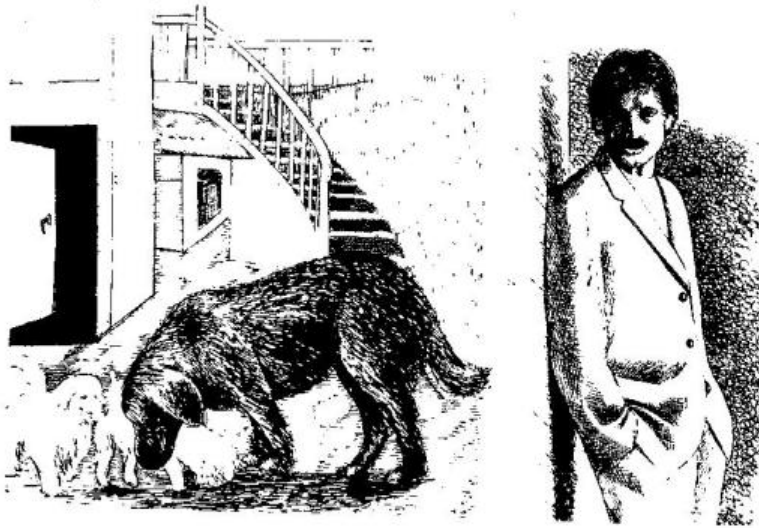
☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆

☆.....☆.....☆



## شیطان کی روح

فلک زاہد - لاہور

خونی عفریت نے اچانک نوجوان پر حملہ آور ہو کر نوجوان کو بے بس کر کے اس کے نرخرے کو بہنہ بوڑ ڈالا اور بہتا ہوا خون بڑی رغبت سے پینے لگا اور پھر.....

حقیقت سے چشم پوشی کرنے والا..... نہ گھر کا رہتا ہے..... نہ گھاٹ کا سبق آموز کہانی

بچنے کے باعث اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی اسے اسپتال لے جانے کی بھی نوبت نہ آ سکی تھی۔

میں گھنٹوں اس کا سراپا بنی گود میں رکھے دھواں دھار روتا رہا تھا۔ ہم دونوں کی شادی محبت کی تھی، ہماری شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ مجھے یوں چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔ یہ سانحہ

مارچ میری بیوی کا نام تھا جس سے میں محبت کرتا تھا۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے میں کچھ ضروری اشیا کی خریداری کے لئے قریبی دکان گیا تھا مگر میرے واپس آنے تک میری کل اتنا اجڑ چکی تھی۔ میری پیاری بیوی، میری محبت، میری جیوں سے پھسل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھے دکان میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ میڑھیوں سے

قبرستان میں دفن کرنا، کچی اینٹوں کی قبر بنانا، کوئی کتبہ نہ بنانا نہ رکھنا، تمام گاؤں کے لوگوں کو میرے حق میں دعا کے لئے کہنا۔ میرے بعد گاؤں کا پیر بننے کے بجائے ان کا خادم اور دین کا اوائی خدمت گار بن کر لوگوں کی خدمت کرنا، رزق کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنا، تعویذ گنڈے کو روزی کا ذریعہ نہ بنانا۔“

بابا جی جب نصیحت کا قرض اتار چکے تو صاف آسمان سے نکل نکلا۔

بارش سے بچنے کے لئے جب بیٹا باپ کی طرف متوجہ ہوا تو وہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ رم جھم کے دوران غسل اور جنازہ کر دیا گیا۔

دفن کے وقت بوڑھا باندی خراج عقیدت پیش کرنے لگی۔

جب لوگوں نے ثواب کی غرض سے قبر پر مٹی ڈالنی شروع کی تو ماحول یوں ہو گیا جیسے چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو کی بارش ہو رہی ہو۔

پورا قبرستان خوشبو سے مہک اٹھا۔ جن لوگوں نے مٹی ڈالی ان کے ہاتھ یوں معطر

ہو گئے جیسے گلاب کے عرق سے دھوئے ہوں۔ قبر پر موجود ہر شخص خوشبو کے سحر میں مدھوش ہو گیا، وہ لوگ معطر فضاؤں کے باسی لگنے لگے۔ دفن سے فارغ ہوتے ہی بوڑھا باندی ہتھم گئی، سورج چاند کی طرح دھیمی روشنی سے منور ہونے لگا۔ لوگ بابا جی کی وفات سے شگین اور قبر کے استقبال پر خوش تھے۔

آج وہ گاؤں مثالی ہے، وہاں کے بڑے لکھے نوجوان، نچ اور گورنر کے عہدے تک پہنچنے ہوئے ہیں۔ خوب صورت، خوشحال گاؤں کے ہر گھر میں درجہ چہارم سے لے کر سیکرٹری تک کے عہدے آفیسر پائے جاتے ہیں۔ بابا جی کے نسل کے لوگ آج بھی دین کی شمع جلا کر اندھیری راہوں کو روشن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔



میاں بیوی کے تعلقات خراب سے خراب ہوتے گئے۔

آخر تک آ کر باقر شاہ نے بڑے بیٹے سے مشورہ کر کے اسے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ”بیٹا! تمہارا چھوٹا بھائی جیل میں بند ہے، بہن منہ کالا کر کے چلی گئی، میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہوں۔ اگر مر گیا تو زرعی رقبہ، شہر کا پلاٹ اور دیگر جائیداد کا بٹوارہ ہوگا۔ تمہاری سوتیلی ماں کو بھی حصہ ملے گا۔“

حالانکہ وہ ایک فاحشہ بیوہ خاتون تھی، لوگوں سے اس کے معاشرے چلتے تھے، حالانکہ عورت تھی مجھے پھانسنے میں کامیاب ہو گئی۔ اور آخر کار گھر کی مالک بن بیٹھی۔

میں نہیں چاہتا ہماری خون پسینے کی کمائی اس بدکردار عورت کو ملے، جس کے ساتھ میرا سوائے بیوی کے کوئی خونی رشتہ نہیں۔

حریس باپ کے حریس بنے کو بات سمجھا آ گئی۔ ایک دن رات کو نشہ آور اشیا کھلا کر اس خاتون کو مدھوش کیا گیا اور پھر اس دوران اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ہمسائے والے اکثر جھگڑے کے دوران ثالث کا کردار ادا کرتے تھے قتل کی خبر محلوں میں پھیل گئی۔

ہمسایوں کی گواہی پر باقر شاہ اور بیٹے کو اتمام قتل میں گرفتار کر لیا گیا۔ مرحوم کے گھر والوں نے کیس کی پیروی کی، باقر شاہ کو عمر قید اور بیٹے کو سزائے موت سنائی گئی۔

جس دن قاتل بیٹے کو سزائے موت ہوئی، اس کے ایک ہفتے بعد منشیات فروش بیٹے کو سزائے موت دی گئی۔

جیل میں بیٹوں کی سزائے موت کی اطلاع ملی تو دل کا دورہ پڑنے پر باقر شاہ بھی زندگی کی بازی ہار بیٹھا۔

☆.....☆.....☆

امیر شاہ ولی اللہ تھے، ان کے زیر تربیت نوجوان، نچ اور گورنر کے عہدے تک پہنچے، جب آخری وقت قریب آیا تو بیٹے کو بلایا۔

”میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ میری موت کے بعد بارش ہوگی، بارش میں میرا جنازہ اٹھانا، اسی گاؤں کے



میرے لئے کسی موت کے پروانے سے کم نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میرا اس دنیا میں تھا ہی کون۔ وہ بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے مجھ سے بہت دور چلی گئی تھی۔ جن لوگوں کو مارچ کی موت کی اطلاع ملی وہ تعزیت کے لئے آنے لگے۔ مارچ کی تدفین میرے جانے والوں نے ہی کی ورنہ میں اس حالت میں کہاں تھا۔ میرے تو دل و دماغ نے دور دور تک اب بھی اس کی موت کو قبول کر لینے پر آمادہ نہیں تھے۔

بار بار اس کا ہنسا مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور میں پاگلوں کی طرح اسے ”مارچ مارچ“ کہہ کر لیکارنے لگتا۔ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے۔

جس قدر مارچ کو میں چاہتا تھا اسی قدر وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔ ہماری محبت مثالی تھی کہ دیکھنے والے عشق کر اٹھتے تھے لہذا اس کے یوں اچانک چلے جانے سے میرے دل و دماغ کو شدید دھچکا لگا تھا۔ میرا خود پر کوئی اختیار نہ رہا تھا۔ میں دن بدن جنونی اور وحشی مریض ہوتا جا رہا تھا۔

مارچ کو جب میری نظروں کے سامنے قبر میں اتارا جا رہا تھا تو میں اس کے جد خاکی سے لپٹ کر چیخنے چلانے لگا تھا۔ بڑی مشکلوں سے مجھے میرے دوستوں نے سنبھالا اور مارچ کی آخری رسومات بھی ادا کر دی گئیں۔ کافی دن گھر پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہا جو سب ہی میری دیکھ بھال کرنے کو آتے رہتے مگر پھر آہستہ آہستہ سب ہی اپنی اپنی مصروفیات میں مصروف ہو گئے۔ اور میں اس بڑے سے گھر میں جسے میں نے اور مارچ نے اپنی محبت سے تعمیر کیا تھا بالکل اکیلا رہ گیا اب یہاں صرف میں اور میری تنہائی تھی بے شک میری نگاہوں کے سامنے مارچ کو قبر کے اندر اتارا گیا تھا اور میں ہر روز باقاعدگی سے اس کی قبر پر تازہ پھول چڑھا کر آتا تھا۔ اس کے باوجود میرا ذہن بے تسلیم کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ مارچ مجھے اتنی جلدی اکیلا کیسے چھوڑ کے جاسکتی ہے۔ ایک ہی تو خواب تھا میرا کہ میری مارچ

میرے پاس ہو اور ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا تھا۔

مارچ کے سوا میں کسی اور عورت کا خیال اپنے دل میں لای بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت تھی جسے میں نے دل و جان سے چاہا تھا اور اب بھی اسے ہی چاہتا تھا۔ لہذا مارچ کو دوبارہ حاصل کرنے کا جنون مجھ پر دن بدن سوار ہونے لگا۔ اب میں ہر پل ہر لمحہ بس یہی سوچتا رہتا تھا کہ میں کس طرح اپنی مارچ کو دوبارہ حاصل کر سکتا ہوں۔

چنانچہ مارچ کی محبت میں اندھا ہو کر میں کسی طرح ”بلیک بیچک“ کرنے والوں کے پاس جا پہنچا۔ کس طرح میں نے ان کے بتائے گئے طریقوں پر عمل کیا جو کہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں زیادہ تفصیل میں جانے کے بجائے صرف مطلب کی بات کروں گا۔

مجھے آج بھی یاد ہے وہ پورے چاند کی رات جس دن میں نے اپنے ہاتھوں سے مارچ کی قبر کھود کر اس کے تابوت کا ڈھلکا کھولا تھا۔ یہ سب میں نے نہایت احتیاط اور راز داری سے کیا تھا۔ چاند کی دھیمی روشنی میں جب میں نے اس کے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا تو چند ساعتوں کے لئے اس کی زندگی سے عاری چہرے کو دیکھتا ہی رہ گیا وہ گویا بہت گہری اور پرسکون نیند سو رہی تھی اس کے چہرے سے بلا کا اطمینان جھلک رہا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اس پر بے حد پیار آیا اور میں سے اپنی ہانہوں میں اٹھا کر گھر چلا آیا۔

یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ کاش..... کاش، مجھ سے وہ غلطی نہ سرزد ہوئی ہوتی..... مجھے جو کچھ چاہیے بھی کرنے کو کہا گیا تھا میں نے ان کے مطابق عمل کیا اور ٹھیک چند لمحوں بعد میری مارچ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا ہمارے خوشی کے میں کسی چھوٹے بچے کی طرح زور زور سے تالیاں بجانے لگا جیسے مجھے میرا کھویا ہوا کھلونا مل گیا ہو۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر مارچ کو گلے سے لگا لیا۔ مارچ کا جسم نہایت سرد اور سخت تھا۔

میرے جسم میں پہلی جیسی وہ حرارت اور زندگی مجھے نہیں نہ ہوئی جو میں پہلے محسوس کیا کرتا تھا۔

مارچ کی کالی آنکھیں پہلے سے کہیں زیادہ بڑی تھیں جن میں اس کی سفیدی کا حدود ہو کر رہ گئی تھی۔ مجھے ان سب باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میری مریضی میری محبت مجھے واپس بل گئی تھی۔ جس کے لئے میں نے بہت بھاگ دوڑ کی تھی اور پیسہ پانی کی طرح اٹھاتا ہوا اور مجھے کیا چاہئے تھا۔

میں مارچ کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگا اور اسے دنیا والوں کی نظروں سے بچا کر رکھتا۔ آفس کے بات پر اور جب بھی مجھے کسی کام سے کسی دوست کے پاس یا پھر سامان کی خریداری کے لئے بازار تک جانا ہوتا تو مارچ کو گھر کے اندر لاک کر جاتا اسی خطرے کے پیش میں میری عدم موجودگی میں مارچ کہیں باہر نہ چلی جائے۔ ہر کوئی بڑی گھر کھلا دیکھ کر بے دھڑک اندر نہ چلا سکتا۔ میں ویسے بھی بلا وجہ اسے اکیلا چھوڑنے سے بڑی پرہیز کرتا اور اپنا سارا وقت اس کے ہمراہ گزارتا۔

مارچ پہلے بے حد محبت کرنے والی نرم دل لڑکی تھی جو ہر وقت ہنسی مسکراتی کھلتی رہتی تھی مگر اب والی صبح کے زرد چہرے پر مسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی دیرانی تھی اور بے رحمی چھائی ہوئی تھی۔ میں ہمہ وقت اسے خوش کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا مگر وہ خوش ہو کر نہ دیتی۔

ایک روز اچانک مارچ نے مجھ سے عجیب بات کر کے مجھے سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ کافی دیر اس کے احساسات سے عاری چہرے کو میں دیران نظروں سے گھورتا رہا تھا۔ جہاں پہلی بار اس نے اس کے ہونٹوں پر زرب لب مسکراہٹ دیکھی تھی۔ اس نے مجھ سے انسانی گوشت کھانے کی فرمائش کی۔

میں نے اس کی فرمائش سے پیاس بجھانے کی۔ اس نے کمری پر بیٹھ کر بڑی بڑی سنسنی آمیز دھڑک دھڑک کر میری بڑی عجیب سی نظروں سے انتہائی غور سے دیکھ کر کہا۔

رہی ہو۔ نہ جانے کس طرح میں نے مارچ کو خوش کرنے کے لیے حافی بھری اور وہ خوشی سے منہ بھاڑ کر ہتھکڑیاں لگائی۔ میں اسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ ایک عرصے بعد میں نے اسے اس قدر ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

مجھے بالکل سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میرے لئے یہ سب بہت عجیب و غریب تھا۔ یہ سب تو مجھ سے عاقلوں نے بھی نہ کروایا تھا جو میں اب کرنے جا رہا تھا، نہ جانے کس طاقت کے زیر اثر آ کر میں ہاں کہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شاید یہ میری مارچ سے شدید محبت ہی تھی جس میں اس کے لئے ہر وہ کچھ کرنے کو تیار رہتا تھا جو اس کے حسین لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دے۔

میں نے مارچ سے ایسی فرمائش کرنے کی وجہ بھی نہ پوچھی تھی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایک طویل نیند سے جاگنے کے بعد شاید یہ سب اس کی ضرورت تھی۔ میں مارچ کو ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ جب سے وہ مجھے دوبارہ ملی تھی وہ خوش نہیں تھی، چپ چاپ سی رہتی تھی اور اسے خوش کرنے کے لئے ہی میں نے جبراً دل پر پتھر رکھ کر اس کام کی حافی بھری تھی۔ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا مگر پھر بھی مارچ کے لئے میں نے یہ سب کرنے کی ٹھانی اور ایک روز اپنے ایک دوست کو بہانے سے گھر پر رات کے کھانے پر مدعو کر لیا۔ وہ خوش خوش میرے ساتھ ہو لیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مارچ کے بعد میں کتنا اکیلا ہو گیا ہوں۔ تنہائی مجھے کاٹتی ہے۔

لہذا مجھے کسی سماجی کی ضرورت ہے اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے اپنی محبت واپس حاصل کر لی ہے اور آج وہ اسی کی خوراک بننے میرے گھر مدعو ہے۔ میں مارچ کی محبت میں اتنا خود غرض ہو جاؤں گا مجھے نہیں پتہ تھا۔ کھانے کے دوران وہ مجھ سے دوستانہ انداز میں کسی مذاق کی گپ شپ کرتا رہا اور میں بظاہر اس میں اس کا بھرپور ساتھ بھی دیتا رہا۔ مگر اندر ہی اندر کوئی نا دیدہ طاقت بار بار مجھ سے کہہ رہی تھی ”میں جو کرنے جا رہا ہوں وہ صحیح نہیں ہے غلط ہے انسانیت کا قتل ہے۔“ یہ تمام آوازیں اس وقت دب کر رہ جاتیں

جب کمرے کے اندر کھڑی مارج کی طرف دیکھتا جو دروازے کی آڑ سے مجھے رحم طلب نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ گویا یہ خوراک اس کے لئے ایسے ہی ضروری تھی جیسے زندہ انسان کے لئے سانس۔ اسے اپنی جانب یوں گھورتا یا کمرے کے صغیر اور میری دوستی پر مارج کی محبت پر غالب آجاتی، آخر کو میں نے اسے بڑی مشکلوں سے دوبارہ حاصل کیا تھا کیونکہ اس کے لئے یہ سب بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر نہیں کر سکتا تھا تو میری محبت پر لعنت تھی۔

لہذا اگر یہی میری محبت کا امتحان تھا تو مجھے اس امتحان پر پورا اترنا تھا۔ میں نے اپنے اندر ایک نئے عزم ایک نئے حوصلے کو محسوس کیا اور اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ مارج بے چینی سے کمرے کے اندر ادھر سے ادھر ٹہل رہی تھی جس بات کا مجھے اندازہ وقفے وقفے سے ابھرنے والی آوازوں سے ہو رہا تھا۔ جب وہ اپنا ہاتھ بے صبری سے دروازے پر مارتی تھی گویا اپنی بے بسی کا مظاہرہ کر رہی تھی کیونکہ میں نے اسے بہت زور دے کر اپنے دوست کے سامنے آنے سے منع کر رکھا تھا اور اب ایک طویل انتظار اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا وہ میرے اشارے کی منتظر تھی۔ میرے دوست نے ابھرنے والی ان آوازوں پر زیادہ غور نہ کیا کیونکہ میں نے اسے سمجھا رکھا تھا کہ گھر پرانا ہے۔ لہذا کوئی چوبانگی گزرے تو لکڑیوں کے چرچانے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ میرا بے حد پرانا دوست تھا۔ میری بات پر یقین نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور پھر اس کے ذہن کے کسی کو نے میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ یہاں اس کے اور میرے علاوہ بھی کوئی تیسرا تھا اور وہ کوئی اور نہیں مارج تھی۔

کھانے کے بعد میں نے دوست کے سامنے دو پیگ رکھے جنہیں وہ غٹا غٹا حلق سے اتارنے لگا۔ گلاس خالی ہونے کے بعد میں نے اسے دو پیگ مزید پلائے جس کی بدولت وہ جلد ہی نشے میں دھت ہو گیا اور اول فول کینے لگا۔ میں نے پیگ کا ایک گلاس بھی نہیں پیا تھا۔ لہذا مجھے نشہ نہیں تھا۔ کچھ ہی لمحوں بعد میرا دوست نشے میں ڈوبا زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ اور

میں نے آگے بڑھ کر مارج کو کمرے سے باہر آنے کی اجازت دے دی جو نجانے کب سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ میرے اجازت دینے پر اس کے چہرے پر خوشی کی طویل مسکراہٹ رقص کر گئی جس نے میرے جسم و جاں میں نئی زندگی دوڑا دی، اس مسکراہٹ کے لئے ہی تو میں نے یہ سب کیا تھا اور اسی مسکراہٹ کے لئے میں ایسی ہی کئی زندگیوں کی قربانی دے سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے مارج کو اپنا کام کرنے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے ہی وہ کمرے سے باہر آ گئی اور میں ایک طرف کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ مارج نے اپنا منہ اس کے زرخے سے لگایا اور پھر لبالب اس کا خون چوسنے لگی۔ میں پچھلی پچھلی نگاہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت مارج مجھے مارج نہیں کوئی اور ہی شیطان نما بدروح لگ رہی تھی۔ جو بڑے مزے سے اپنے گرد و نواح سے بے نیاز ایک انسان کا خون پینے میں مشغول تھی۔

میرا دوست نیند میں ہی نجانے کب زندگی کی بازی ہار گیا اور مارج اس کا گوشت نوج نوج کر کھانے لگی۔ اپنے پیارے دوست کو میں نے اپنی محبت پر قربان کر دیا تھا، نہیں معلوم تھا کہ میں مارج کو خوش دکھ کر خوش تھا یا نہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

ایک عجیب سی کیفیت مجھ پر سوار ہو چکی تھی۔ میرا دماغ سنسنار ہوا تھا۔ آنکھیں مارج پر جمی جو میرے دوست کا گوشت کسی جنگلی جانور کی طرح بھنبھوڑ کر چبا رہی تھی۔ مجھ سے مزید اپنے دوست کو اس حالت میں دیکھا نہ گیا اور وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں چلا آیا، نجانے کتنی دیر میں بستر پر چٹ لیٹا رہا، ذہن مختلف سوچوں کی زد میں تھا۔

نجانے مارج کو کیا ہو گیا تھا یہ وہ مارج بالکل نہیں تھی جسے میں کبھی جانتا تھا یا پھر یہ میری مارج تھی ہی نہیں۔ میں اکثر مارج کو اس کا ماضی یاد کرواتا رہتا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کیا کرتے تھے ایک دوسرے کے ساتھ کتنے خوش تھے تم میرے لئے

مے مزے کے کھانے بنایا کرتی تھی۔ مگر پھر اچانک سفاک موت جنہیں مجھ سے لے کر لے گئی اور اب میں نے جنہیں واپس حاصل کیا موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا ہے۔ میری ان سب باتوں پر مارج مجھے چپ چاپ ساٹھ چہرے کے ساتھ خالی نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ گویا اسے اپنے ماضی کی بات یاد نہ ہو۔

طرح طرح کے خیالات دل و دماغ میں سرشار تھے۔ دل محبت کے ہاتوں مجبور تھا اور میرے اس کوچ کہہ رہا تھا۔ جبکہ اس کے برعکس دماغ مجھے بار بار کہہ رہا تھا۔ دل و دماغ میں جنگ کی سی کیفیت تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مارج کے جسم کے مارج کی ہی روح تھی یا پھر کوئی اور شیطانی روح لگ کر گئی تھی۔

مارج کی سرد مہری اور اب یہ شیطانی عمل۔ یہ سوچ سوچ کر دماغ پھنجانا رہا تھا۔ مجھے مارج اس رویے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اب اس جاننے کے بعد ایسی کوئی چیز طلب کرے گی۔ میں نے میری خواہش کے مطابق مجھے میری مارج کی لونا دی تھی۔ گویا ان کا کام ختم ہو گیا تھا۔ اب اس آگے میں جانوں یا پھر میرا رب جانے۔ نجانے کتنی شش و پنج کی سی کیفیت میں رہا۔ ہوش تب آیا کہ مارج کو کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے پایا کہ چہرے پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں میرے ڈالہا نہ محبت غالبانہ وہ میرے اس عمل پر مجھ سے خوش تھی۔ اسے خوش دیکھ کر میرے متے ہوئے اعصاب ڈھالے ہو گئے اور کچھ دیر تک والی عجیب سی کیفیت ختم ہو گئی۔ غالباً دل ایک بار پھر دماغ پر سبقت لے گیا۔ اس کی اس خوشی کی ہی خاطر تو میں نے یہ سب کیا اور اب اس کے چہرے سے وہ خوشی اور پیار رہا تھا جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی مجھے خواہش اس کا میں منتظر تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اب میرے قریب چلی آئی۔ وہ میرے سینے سے آگئی

تھی۔ ایک عرصے بعد میں نے مارج کو خود میں محسوس کیا تھا۔ جس کی مجھے بے انتہا خوشی تھی اس کی نرم گرم سانس مجھے خود میں اترتی محسوس ہوئیں۔ وہ رات میرے لئے کسی خوب صورت خواب جیسی گزری۔ میں گویا ساری رات ہواؤں میں اڑتا رہا تھا۔ میں کہاں ہوں کہاں نہیں مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

کچھ دن تک تو مارج میرے ساتھ بہت اچھی رہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا گویا مجھے میری پرانی مارج واپس مل گئی ہو۔ وہ مجھ سے اسی طرح محبت کرنے لگی تھی جیسے پہلے بھی کیا کرتی تھی۔ پہلے ہر روز آفس سے آ کر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا تیار کر کے خود کھاتا تھا اور اسے بھی کھلاتا تھا مگر اب تو وہ خود میرے لئے ناشتہ اور رات کا کھانا اپنے ہاتھوں سے بنانے لگی تھی۔ میرے کپڑے دھو کر انہیں پریس کرتی میرا ہر کام وقت پر کرتی غرض یہ کہ میرا اور میری ضرورتوں کا ہر طرح سے خیال رکھنے لگی۔ مارج میں یہ تبدیلی میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھی۔ ایک انسان کی جان قربان کر کے مجھے اب میں اپنی اس حرکت پر ذرہ بھر کو بھی نادم نہیں تھا۔ اللہ میرے دل کو سکون اور اطمینان نصیب ہو گیا تھا ساتھ میں اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ میری مارج ہی ہے نہ کوئی شیطانی بدروح اس دن خود بخود میں اپنی مارج کے بارے میں نجانے کیا کچھ سوچتا رہا تھا۔ جس پر میں خود سے شرمندہ تھا۔

یقیناً موت کے بعد جاننے پر وہ خود کو ماحول سے ہم آہنگ نہیں کر پاری تھی اور اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایڈجسٹ ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے گلنے لگا تھا کہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میری یہ خام خیالی ہی ثابت ہوئی۔

مارج کی یہ کیفیت صرف عارضی تھی کچھ دنوں بعد اسے پھر سے انسانی گوشت اور خون کی پیاس لگی تو اس نے مجھ سے اس کی ایک بار پھر فرمائش کر ڈالی کہ میں اس کے لئے آج رات ایک اور شکار لے کر آؤں، میں یہ سن

**Dar Digest** **100** May 2018



زندہ کیا ہے بلکہ اب یہی احساس رہتا تھا گویا وہ مجھ سے کبھی پھڑکی ہی نہیں تھی۔ ان سب کے باوجود میں نے کبھی کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اب کس قدر خوش رہتا ہوں۔

دنیا کے سامنے میں وہی بد قسمت شوہر تھا جس کی بیوی بھری جوانی میں اس سے پھڑکتی تھی اور مجھ سا دیوانہ شوہر آج بھی اس کی یاد میں کل رہا ہے۔ حقیقت میرے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی کہ میں اپنی مارج کو واپس حاصل کر چکا تھا اور اب میری زندگی میں کوئی خواہش باقی نہیں رہی تھی۔ بچوں کی خواہش بھی نہیں۔ مارج مل گئی تھی اس سے بڑھ کر اب کوئی اور خواہش معنی نہیں رکھتی تھی۔

بہر حال یونہی ایک ماہ مزید گزر گیا اور اب میں آہستہ آہستہ مارج کی بدلتی کیفیت میں کچھ تبدیلی محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کچھ چڑچڑی ہو گئی تھی۔ بات بات پر مجھ سے اچھے لگتی تھی اور کہتی تھی کہ ”مجھے اس کا خیال نہیں ہے۔“ اس کے ایسا کہنے پر میں سوچوں کی گرفت میں جکڑا جاتا تھا۔ ”احساس نہیں ہے مجھے؟“ یہ الفاظ مجھے سوچوں کے بخور میں پھنسا دیتے۔ ہر طرح سے تو میں مارج کا خیال رکھتا تھا۔

چھٹی کے دن اسے کوئی کام کرنے نہیں دیتا تھا سارا کام خود کرتا تھی کہ کھانا بھی اسے اپنے ہاتھوں سے بنا کر کھاتا پر یہ کہ ہر طرح سے اس کے آرام و سکون کا خیال رکھتا جہاں تک مجھ سے ہو سکتا تھا اس کے لئے وہ سب کرنے کی کوشش کرتا کسی چیز کی محسوس نہ ہونے دیتا جو مانگتی تھی اس کے قدموں میں لا کر رکھ دیتا تھا۔

میرے دل پر تو روز اول سے اس کا راج تھا تو پھر ان سب کے باوجود مجھ سے ایسا کیوں کہتی تھی؟؟؟

باوجود پوچھنے کے نہ بتاتی کہ میں کس طرح سے اس کا خیال نہیں رکھتا وہ بس اتنا کہہ کر خاموش ہوتی کہ ”جب تمہیں خود سے کوئی احساس نہیں ہے تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ اور یہ الفاظ مجھے سوچوں کی آغوا گہرائیوں میں گرا دیتے۔ یہ ضرور تھا کہ میں نے اسے گھر میں قید

کر کے رکھ دیا تھا، باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ بالکل منقطع ہو چکا تھا اور ایسا کرنا میری مجبوری تھی اسے دنیا والوں کی نظر دل کے سامنے لا کر ہم دونوں کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کرنا چاہتا تھا۔ جو مانگتی تھی خود جا کر بازار سے لا دیتا تھا۔

یوں ایک عرصہ بیت گیا تھا اسے باہر کی دنیا دیکھے ہوئے لیکن اگر اس وجہ سے اس کا موڈ خراب رہتا تھا تو وہ مجھ سے اس بارے میں بات کر سکتی تھی لیکن اس نے تو ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ وجہ ہرگز نہیں تھی وہ گھر میں میرے ساتھ خوش اور مطمئن تھی تو پھر کیا وجہ تھی؟؟؟

بالآخر ایک دن حسب معمول وہ مجھ سے بنا کسی وجہ کے جھگڑنے لگی اور یوں اصل بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ اس نے کہا۔ ”میں نے کافی دیر سے تم سے خود انسانی گوشت اور خون کی فرمائش نہیں کی تو تم نے بھی اس کا احساس نہیں کیا۔ اپنی بھوک تو مٹالیتے ہو تم میری بھوک کا کیا ہے۔“

مارج کے منہ سے نکلے ان الفاظ نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ میں نے حیرانی سے اس کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔ ”مارج مجھے تو لگا تھا کہ تم سدھ گئی ہو اب۔ اس لئے تمہیں ان سب کی ضرورت نہیں رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اتنے دن سے تم مجھ سے اس وجہ سے ناراض ہو۔ صاف صاف کہہ دیجیے بھلا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”تمہیں خود احساس ہونا چاہئے اس بات کا۔ جب میں ہر طرح سے تمہارا خیال کرتی ہوں تو تمہیں بھی میرا خیال میرا احساس کرنا چاہئے۔“ مارج نے غصے سے چیخ کر کہا۔

”مارج جو کبھی مجھ سے اونچے لہجے میں بات نہ کرتی تھی۔ آج اس کا لہجہ مجھے انگشت بدندان کر رہا تھا۔ ”میں بھی تو تمہارا ہر طرح سے خیال کرنے کی پوری کوشش کرتا ہوں میری جان بس اب میں اس بات کا ثبوت دینے کے لئے تمہاری روز روز کی فضول فرمائشیں نہیں پوری کر سکتا۔ تم انسان ہو جاؤ تو نہیں اس لئے انسانوں کی طرح رہنا سیکھو آدم خور مت بنو۔“ میں

دروستی سے کہا تو مارج نے شدید غصے میں آ کر حلیف بننے لگی۔ ”میں نے زمین پر پڑے سمیت ڈالے جو زمین پر گرتے ہی چکنا چور ہو گئے۔“

مارج کی اس حرکت پر مجھے اتنا شدید غصہ آیا کہ میں نے زور سے اس کے گال پر تھپڑ بڑا دیا اور وہ لڑکھڑا کر حلیف پر جھک گئی۔ اپنے اس شدید غصے پر میں خود کی حیران رہ گیا۔ میں نے اس سے پہلے اس پر ہاتھ لگانا تو درکنار اس سے اونچے لہجے میں بات تک نہ کی تھی مگر آج اس نے بدتمیزی کی حد کر دی تھی۔ لہذا میں لڑکھڑک نہ سکا۔

مارج حیرت سے اپنے گال پر ہاتھ رکھے مجھے دیکھنے لگی گویا اسے مرنے سے پہلے کی تمام باتیں یاد آ رہی تھیں۔ میں نے بھی اس پر غصہ نہیں کیا تھا۔ میں اسے ان چھوڑ کر جگن سے باہر نکل آیا اور گھر کو تالا لگا کر کئی پارک میں جا بیٹھا۔ دماغ سنسنار رہا تھا اور بدن لرزنا طاری تھی۔ اب مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میں مارج کو زندہ کر کے کتنی بڑی غلطی کر دی تھی۔ جانے کتنے چلے جاتے ہیں ان کا دوبارہ اس زندہ لوگوں کی ایش کوئی کام نہیں رہتا۔

مارج کو خوش رکھنے کا ایک ہی طریقہ تھا اور وہ تھا کہ وہ دن بعد ایک انسانی جان کی سمیٹ جو کہ اب اسے بس میں نہ رہا تھا اسے میری محبت میری وفا کچھ نہیں آتی تھی اگر اسے مجھ میں کچھ دکھائی دیتا تھا تو وہ ایک شکاری تھا جو اسے ہر دو دن بعد شکار لا کر کھاتا تھا۔

میں کافی دیر خالی بیچ پر بیٹھا ہر سکتے پر غور کرتا رہا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اب میں کسی طور بھی اس کی فرمائش پوری نہیں کروں گا۔ چاہے وہ کسی ہی ضد کی جان ضائع نہیں کروں گا اس بار میرا ضمیر میری سانس سے جیت گیا تھا۔

شام ڈھلے میں گھر واپس آیا تو مارج دوڑ کر آ کر بیٹھنے سے اٹھی اور مجھ سے اپنے گزشتہ رویے کی

معافی مانگنے لگی۔ میں نے اس کی نادانی سمجھ کر اسے معاف کر دیا۔ یوں کچھ دن مزید سکون سے گزر گئے۔

تاہم چند دنوں بعد میں پھر محسوس کرنے لگا تھا کہ مارج کی طبیعت بگڑنے لگی تھی اس کی طبیعت میں عجیب سا اضطراب اور بے چینی انداز تھی۔ جو اس کی حرکات و سکنات سے واضح ہوتی تھی کہ اس نے مجھ سے دوبارہ انسانی گوشت اور خون کی فرمائش نہیں کی تھی مگر میں اس کی دلی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس کے منہ کو انسانی گوشت اور خون لگ چکا تھا۔ جس کے بغیر رہنا اب اس کے لئے مشکل تھا۔ لہذا ان سب کی ایک بار پھر شدید طلب محسوس ہونے لگی تھی۔ کیونکہ بڑی دیر گزر گئی تھی اسے یہ چیزیں میسر نہیں آتی تھیں۔ میں نے اس کی بدلتی کیفیت کو بہ خوبی نوٹ کیا تھا مگر اس سے اس کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ میں خود سے عہد کر چکا تھا کہ اب جو مرضی ہو جائے میں یہ گناہ کسی قیمت پر نہیں کروں گا۔ اور پھر میری زندگی میں وہ رات بھی آئی جس کا تصور میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا اور جسے یاد کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اس روز کھانا کھانے کے بعد میں ٹی وی کے آگے بیٹھا کوئی بار مودی دیکھ رہا تھا، مارج بھی میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی کہ یکبارگی فلم کے اندر آدم خوروں کو سفاکی سے انسانی گوشت کھاتے ہوئے دکھایا جانے لگا۔ جنہیں دیکھ کر مارج کی حالت بگڑنے لگی اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور میرے پاس سے اٹھ کر سامنے کسی اور صوفے پر جا بیٹھی۔ میں اس کی حالت سے واقف ہوتے ہوئے بھی انجان بنارہا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے اس کی حالت پر ترس آئے اور میں ایک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاؤں۔

مارج کی حالت اعتدال پر لانے کے لئے میں نے ٹی وی پر چلتی فلم بدل دی اور خبروں کے چینل کو بدلنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ مارج کی حالت بہتر ہو گئی تھی مگر اس کی آنکھوں کی سفیدی غائب ہو گئی تھی۔ صرف کالی کالی آنکھیں باقی رہ گئی تھیں۔ مجھے اس کی نظروں کی

تپش اپنے چہرے پر محسوس ہوئی تو میں نے ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا اور یہ دیکھ کر سکت رہ گیا کہ مارچ مجھے ہی ایک نیک گھور رہی تھی۔ اس کے دماغ میں کیا چل رہا تھا میں اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

میں نے اس سے کوئی بات کرنے کے بجائے اپنا چہرہ وہاں ٹی وی کی طرف پھیر لیا۔ مگر میں مسلسل اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کر رہا تھا، میں نے ایک بار پھر اس کی جانب دیکھا تو اس بار میرے دیکھنے پر وہ مسکرا دی اور میں نے دونوں کیلئے دانت واضح اس کے ہونٹوں سے باہر دیکھے اور مجھے سمجھنے میں بالکل دیر نہیں لگی کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہنسنی ہوئی مجھ پر کسی درندے کی طرح چھٹی۔

یہ حملہ میرے لئے غیر متوقع تھا لہذا میں خود کو سنبھال نہ سکا اور مارچ نے اپنے نوکیلے دانت میرے دائیں بازو پر گاڑ دیے۔ درد کی شدت سے میری چیخ نکلنے لگتی رہ گئی۔ یوں لگا تو گویا گرم سیسہ میرے اندر اتر گیا ہو۔ بہ مشکل ضبط کر کے میں نے خود کو مارچ کی گرفت سے چھڑایا اور اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ عورت ذات تھی میرے بھرپور دھکا دینے سے پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگی اور زمین پر گر گئی۔ میرے بازو سے گرم گرم خون بہ کر نیچے فرش پر گر رہا تھا۔ وہ تو شکر تھا کہ میرے بازو کا گوشت مارچ کے منہ میں نہ آ سکا تھا اس سے پہلے ہی میں خود کو چھڑانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے زخم پر دوسرا ہاتھ رکھ کر اسے دبا دیا تاکہ خون بہنا بند ہو سکے۔

شدید درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں میں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔ اتنے دنوں سے مارچ کو کوئی شکار نہ ملا تھا، اپنی بھوک مٹانے کے لئے وہ مجھ پر چل پڑی تھی۔ لیکن میں ایسا ہرگز ہونے نہیں دے سکتا تھا۔ میں مارچ کی خوراک بالکل نہیں بن سکتا تھا۔ شاید میری محبت مارچ کے لئے ابھی اس قدر بھی نہیں تھی کہ میں خود ہی اس کا نوالہ بننا پسند کرتا۔

یوں بھی مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ میری مارچ ہرگز

نہیں تھی جسم مارچ کا تھا مگر اس کے اندر موجود روح کوئی شیطان نما بدروح تھی۔ میری مارچ میرے لئے اپنی جان دے سکتی تھی مگر اپنی خوشی کے لئے میری جان ہرگز نہیں لے سکتی تھی۔ لہذا یہ جو کوئی بھی تھی مارچ بالکل نہیں تھی۔

مارچ غصے سے اٹھ کھڑی ہوئی دیوار کے ساتھ زور سے لگنے کے باعث وہ مزید خنخا رہی تھی اور اس کا چہرہ بھی بے حد بھیانک ہو گیا تھا اور میں کہوں گا وہ میری مارچ کا چہرہ بالکل نہیں تھا۔ وہ کسی شیطان کا چہرہ تھا۔ جسے دیکھ کر میں خود پسینہ پسینہ ہو گیا۔ بڑے بڑے دانت ہونٹوں سے باہر تھے۔ جس سے خون فٹک رہا تھا۔ کالی سیاہ آنکھیں باہر کواہلی ہوئی تھیں اور چہرے پر جا بجا زخموں کے نشان تھا۔ وہ کسی طور بھی مارچ کا چہرہ بالکل نہیں تھا ہرگز نہیں تھا۔

آج صبح معنوں میں مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں نے محبت میں اندھا ہو کر کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اس سے پہلے کہ مارچ مجھ پر ایک بار پھر حملہ آور ہوئی میں نے کمرے سے باہر کی جانب دوڑ لگا دی اور فوراً سے بیشر باہر کے کمرے کو بند کر دیا۔

مارچ پانگوں کی طرح دروازے پر ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ اس کے حلق سے نکلنے والی غرائشیں کسی درندے سے مشابہہ تھیں۔

میرا دل بری طرح دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور پسینہ کسی پانی کی طرح پورے بدن پر بہہ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دروازہ توڑ کر مجھے کچا چائے۔ میں چند لمحے ہراساں لگا ہوں سے دروازے کو گھورتا رہا۔ جس پر مارچ وحشتناک انداز میں تباہ توڑ حملے کرنے میں مصروف تھی۔ میرے جسم پر کچلی طاری تھی، میں اسے کمرے میں بند چھوڑ کر اپنے زخم پر مرہم لگانے لگا۔ یہ سب کچھ میرے لئے نہایت خوفناک اور دل دہلاہٹے والا تھا۔ اگر میں بھرتی نہ دکھاتا تو آج مارچ کا نوالہ بن چکا ہوتا۔

شدت غم سے میرا دل پھٹا جا رہا تھا۔ اپنی مارچ کو اس حال میں لانے والا میں خود تھا۔

کاش! میں نے محبت میں اندھا ہو کر یہ سب نہ

ہوتا تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا دل میں درد کا زہر اٹھا جو آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہنے میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

مارچ کی چیخیں مسلسل جاری و ساری تھیں۔ وہ دروازہ توڑ دینے کی کوششوں میں تھی۔ میرا گھر رہائشی تھے سے ذرا فاصلے پر تھا۔ لہذا مجھے اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ کوئی بڑی شور سن کر یہاں چلا آئے گا۔

ساری رات میرا دل مارچ کی حالت پر روتا رہا۔ صبح کی سفیدی سے پہلے پہلے مارچ کی ہمت اب دے گئی اور وہ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ نہ جانے وہ درواری تھی یا کیا کر رہی تھی میں نہیں جانتا تھا۔ نہ ہی میں خود میں اتنی ہمت جمع کر پا رہا تھا کہ اندر جا کر دیکھ لوں کہ اب وہ کس حال میں ہے۔ میرے زخم سے درد کی تک نہیں گیا تھا اور پھر جو کچھ مجھ پر گزری تھی اسے صبح سویرے کساری رات کا جاگا ہوا، میں باہر صوفے پر سو گیا۔ نہ جانے کب تک سوتا رہا۔

آنکھ کھلی تو شام ڈھل رہی تھی۔ مجھے اتنی دیر بھانپنے پر خود پر حیرت ہوئی۔ شاید یہ سب میرے زخم کی وجہ سے تھا جیسی مجھ پر غنودگی چھائی رہی تھی۔ میں ہوا دروازے کے پاس آیا اور کان لگا کر دوسری طرف سننے کی کوشش کرنے لگا مگر اندر گہری خاموشی رہی تھی۔ شاید مارچ دوبارہ نہیں جیتی تھی ورنہ میری آنکھ کا کھلنا یقینی تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مارچ کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہی تھا اور اسے ٹھیک کرنا بھی میری ہی ذمہ داری تھی۔ میں پہلے مشکل تمام خود میں تمام ہمت و حوصلے کو یکجا کیا اور اسے اس کمرے کی طرف آیا جس کے اندر مارچ بند ہے۔ آخر کو وہ میری بیباکی بیوی تھی خواہ اس کے اندر کسی ہو جسم تو اس کا تھا نہ۔ اور اس کے اس جسم کو میں اذیت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ بدروح مارچ کے جسم پر ہمیشہ کے لئے قابض آ جاتی اور خود باہر جا کر لوگوں کو مار کر نہ لگتی اس سے پہلے پہلے مجھے اپنی مارچ کے

جسم کو اس سے آزاد کروانا تھا اور یہ کام مجھے کسی پادری کے ہتھکنڈے سے انجام دینا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا یہ کلمات پڑھتے ہوئے با آہستگی اندر کی جانب دروازہ کھول دیا۔

لیکن یہ کیا، پورا کمرہ خالی پڑا تھا، مارچ اندر کہیں نہیں تھی، میں نے باہر ہی کھڑے ہو کر کمرے کے چاروں طرف کونوں میں نگاہیں دوڑائیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک اور نارمل تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ سلیپے سے پڑی تھی۔ پھر مارچ کہاں چلی گئی؟ کمرے میں دوسرا کوئی اور دروازہ بھی نہیں تھا جس سے اندر باہر آیا جا سکتا۔

ایک ہی دروازہ تھا جس کے آگے میں ایسا وہ تھا۔ میں نے جوبھی کمرے کے اندر کا جائزہ لینے کی غرض سے قدم رکھا ایک نکتہ مارچ نے مجھ پر پیچھے سے حملہ کر دیا اور اپنے نوکیلے دانت ایک بار پھر میرے اسی زخم میں پیوست کر دیے۔ اس اچانک افتاد پر میں ہولکھلا گیا اور درد کی اذیت سے میری چیخیں نکل گئیں۔ وہ دروازے کے پیچھے سے نمودار ہوئی تھی اس کی اس ہوشیاری پر میں انشت بدحال تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا بازو مارچ کے نوکیلے دانتوں سے آزاد کروایا اور اسے زور سے پیچھے کی جانب دیکھا دیا، وہ دیوار کے ساتھ جا لکرائی۔ میرے زخموں سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا اور درد تھا کہ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ مارچ کی وحشت میں کوئی کی نہیں آئی تھی۔ وہ گزشتہ رات کی ہی طرح گوشت کی بھوک تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بدروح اس کے جسم پر حادی ہوئی جا رہی تھی۔

مارچ نے اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ کرنا چاہا اس بار میں ہر حملے کے لئے بالکل تیار تھا میں نے اپنا فولادی مکا اس کے جڑے پر رسید کر دیا جسے وہ سہمہ نہ سکی اور چیختی ہوئی صوفے سے پیچھے جا گری۔ اگرچہ مارچ کے جسم کو چوٹ دیتے ہوئے میرے اپنے دل کو چوٹ لگ رہی تھی لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں مجبور تھا اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ مجھے نقصان پہنچانے



## قاتل

احسان الحق

جب کسی وفادار عورت کے جذبات سے کھیل کر اسے کچل دیا جائے تو جیتے جی مرجاتی ہے مخلص عورت اور پھر معاشرے میں ناقابل فراموش کہانیاں جنم لیتی ہیں کہ لوگ انگشت بدندان رہ جاتے ہیں۔

ایک روح کی دیدہ دلیری کے اس نے اپنا انتقام لے کر چھوڑا..... ایک حقیقی کہانی

”مارتھا!“ اس کے منہ سے ہلکے سے نکلا۔ ”مارتھا!“ اس نے دوبارہ سے زیر لب یہ نام پکارا۔ پھر اپنا سر جھٹکا۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے پھر سے خودکامی کی۔ ”سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ کرسی جس کی ایک ٹانگہ ٹوٹ چکی تھی۔“ اس نے بستر کے سائیڈ پر رکھی کرسی کی جانب دیکھتے ہوئے زیر لب کہا۔ کرسی اپنی جگہ سالم حالت میں تھی۔ کرسی کو مسلسل مٹھرتے ہوئے اس

سوچ ہوئی۔۔۔ نئے دن کا سورج چمکا۔ سورج کی پہلی کرنوں نے اس کے چہرے کا احاطہ کیا تو اسے ایک جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس نے انگڑائی لی اور نیم وا آنکھوں سے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے یکدم اپنے ہاتھ کو ڈبل بیڈ کے ہائیں جانب پھیرا۔ انداز ایسا تھا جیسے کسی کو ٹولا جا رہا ہو۔ پھر جیسے اسے ایک دلچسپ سا لگا!

سے گریز نہ کرتی۔ میں نے مارج کے گرے ہونے کا فائدہ اٹھایا اور بھاگتا ہوا جگن میں آیا۔

میں نے تیزی سے صلیب سے تیز دھار گوشت کاٹنے والا چھرا اٹھایا اور دل میں بچے بچے تمام جذبات کو روند ڈالا۔ یہ میری مارج کا جسم ضرور تھا مگر یہ مارج نہیں تھی اور پھر اس کے سوا اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا۔

مجھے ہر حال میں مارج کے اندر موجود بدروح کو واپس اسی جگہ بچکانا تھا جہاں سے وہ آئی تھی میں واپس اس کمرے میں آیا تو مارج اٹھ کر ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔

میں نے آؤدیکھا نہ تاؤ آنا فانا اس کے گلے پر تیز دھار چھرا پھیر دیا۔ مارج کی آنکھیں مزید باہر کواہل آئیں اور حلق سے عجیب و غریب غرائش نکلنے لگیں۔

میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ مگر میں نے یہ مشکل خود کو کسی طرح سنبھالے رکھا۔ میں نے موقع غنیمت جان کر ایک بار پھر چھرا مارج کے پیٹ میں گھونپ دیا، وہ فرش پر گر کر رڑھیں لگی اس کی آنکھوں میں میرے لئے بے پناہ نفرت تھی۔ میں بھی سپاٹ چہرے سے اسے دیکھتا رہا۔

چند لمحوں بعد وہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ اس کے جسم میں اب کوئی جان باقی نہ رہی تھی، میں کافی دیر تک اس کے چہرے کو مٹھرتا رہا اس کے چہرے پر زندگی کی رونق تو پہلے بھی نہ رہی تھی اب بس وہ ہلے جلنے سے ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئی تھی۔

وہ ایک بار پھر موت کی آغوش میں جاسوئی تھی۔ میں نے الماری میں سے صلیب نکال کر اس کے گلے میں ڈال دی تو رفتہ رفتہ اس کے چہرے کے خدو خال بدلنے لگے۔ کچھ ہی لمحوں میں میرے سامنے میری وہی معصوم مارج تھی جیسے دیکھ کر میں بیتا تھا۔ چند لمحے پہلے جو چہرے پر خوفناکی تھی وہ اب نہ رہی تھی۔

مارج کا خوبصورت چہرہ دیکھ کر میں ایک بار جذباتی ہو گیا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھنے نچانے کب تک دھواں دھار روٹا رہا۔ یہ ج تھا کہ اگر مارج کا روپ





نے پھر سے خودکامی کی۔ ”آہ۔۔۔ سنیاس ہو۔۔۔ یہ سب ایک خواب تھا۔ ایک ڈراؤنا خواب۔“

”ضروری نہیں کہ سب کچھ خواب ہی ہو، ڈارلنگ!“ ایک سوائی آواز اس کی سماعت سے گزرائی۔ یہ مارتھا کی آواز تھی۔ آنجنابی مارتھا ایک ہفتہ قبل قتل کی جانے والی مارتھا۔

مارتھا کی آواز گویا اس کے وجود پر بھاری پڑ رہی تھی۔ ایک ظالم نے اس حین کو مار ڈالا تھا۔ مارتھا جو ایک حسن کا شاہکار عورت تھی۔ آخری کیا تھی اس میں۔ ہنسی، نکھرنی، بھرپور نسوانی جسم کی مالک، کھلتی ہوئی مسکراہٹ چہرے پر ہر دم چائے، مارتھا! کہ جس کی ہر ہر ادا پر صنف کرخت مرنے، قابل قبول تو تھی وہ۔۔۔ لیکن افسوس کہ اس کا تصور بتائے بغیر اس کی ہنسی کھلتی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ عداوتیں بھی کسی کو یونہی سزاے موت نہیں سنایا کرتیں تو مارتھا کو تو۔۔۔ سچ یہی تھا! وہ مر چکی تھی۔ ابدی نیند کے ساگر میں کہیں گم کر دی گئی تھی۔

”ڈارلنگ! اٹھو! اب صبح ہو چکی ہے، یہ لو میں بیڈ ٹی بھی لے آئی ہوں!۔۔۔ جلدی سے اٹھ جاؤ اب۔۔۔“ مارتھا کے الفاظ ایک بار پھر اس کے کانوں میں گونجنے تو ایک انجانے خوف کے احساس کے ساتھ اس نے ارد گرد دیکھا۔ کمر اخالی تھا لیکن اس کی آنکھوں میں وحشت بھرے آنسو تھے۔ یقیناً متواتر رونے سے اس کی آنکھیں سو جن کا شکار تھیں۔ کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا تو پھر یہ مارتھا کی آواز کہاں سے آرہی تھی؟

”اٹھو، فریش ہو جاؤ! نہیں تو دفتر سے پھر دیری ہو جائے گی اور تمہارے پاس کوتم سے شکایت بھی!“ وہ بارہ سے مارتھا کی آواز سن کر اس نے اپنی پچھلی پچھلی آنکھوں سے کمرے کا بھرپور جائزہ لیا لیکن کمر اخالی تھا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ قطعی نہیں ہو سکتا۔ مارتھا مر چکی ہے۔۔۔ ہاں!۔۔۔ مارتھا مر چکی ہے۔“ اس نے اپنے آپ میں خوف و ڈر کے طے جملے احساسات کے ساتھ بڑبڑاتے ہوئے عجب سی خود کلامی کی تھی۔

”بھلا ایک وجود، جسے موت لے جا چکی ہو، جس وجود کی روح ٹکڑوں میں نکھیر گئی ہوگی، اک بھر پور زندگی کے آچار ختم، ایک ایسا وجود جو ایک پتھر نما کیفیت میں جٹلا کر دیا گیا، تو اس کی روح کیسے واپس آ سکتی ہے۔ لے جانے والا روح لے گیا، تمام تر جذبات و احساسات تو لے گیا، وہ۔۔۔ نہیں!، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ مارتھا مر چکی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے جیسے تیسے بستر سے اٹھتے ہوئے نہایت غفلت میں کپڑے تبدیل کئے اور اس خوفناک آسیب زدہ کمرے سے ہی نہیں بلکہ اپنے گھر سے بھی باہر کی جانب بھاگنے کی، کی۔ باہر آتے ہوئے اس نے گھر کا مرکزی دروازہ مقفل کرنے کی بھی زحمت نہ کی۔ اس کی منزل پتھر جوہن کا اپارٹمنٹ تھا لیکن اسے پتھر کے اپارٹمنٹ میں پتھر سے ملاقات نہیں کرنا تھی۔

نزدیکی ٹیلی فون تو پتھر سے مال مال کر اس نے کسی طرح پتھر کو قاتل کر لیا کہ وہ چاہے چند منٹوں کے لئے سہی لیکن اس سے ملاقات ضرور کرے۔ پتھر نے حامی بھر لی تھی لیکن پتھر نے آخری جملہ کہتے ہوئے نہایت بے قدری سے فون بند کیا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں، اسٹریٹ پارک کے بیچ پر میرا انتظار کرو لیکن دس منٹ سے زیادہ ملاقات کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ only ten minutes۔“ اوکے!“ پتھر نے کہا اور اس نے فوری رابطہ منقطع کر دیا۔ ریسور میں سے ”ٹھک۔۔۔ ٹو دو۔۔۔ ٹو دو دو۔۔۔“ کی آواز کون کر اس نے سمجھا کمر ریسور کی جانب دیکھا اور زور سے اسے پتھر کے کریڈل پر واپس رکھتے ہوئے ایک بھر پور گالی پتھر کی نذر کی۔ ”سارے! فون میں نے کیا ہے اور بند تو خود کر رہا ہے۔ آداب بھول گیا ہے۔۔۔“

تھوڑی دیر میں پتھر نے اپنا وعدہ وفا کر دیا تھا۔ وہ آ گیا تھا۔

”بولو کیا بات ہے؟“ پتھر نے روکھائی سے پوچھا۔

”یہاں بتانا مشکل ہے!“ اس نے مختصر کہا۔

”تو پھر؟“

”کل میرے گھر آ جانا۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ۔۔۔“

”مارتھا مری نہیں، بلکہ زندہ ہے!“ اس نے پتھر کی بات کاٹتے ہوئے اپنے مدعا کی بات کی تو پتھر نے عجیب ٹیڑھا سامنہ بنا کر اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”واٹ!“

”ہاں یہ سچ ہے، وہ مری نہیں ہے! وہ زندہ ہے۔“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ پتھر ہنسیائی کیفیت میں غرایا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں، دماغ تمہارا ٹھکانے پر نہیں ہے، نہ بھی تھا!“

”اوکے۔۔۔ میں سمجھ گیا! تمہیں ایک اچھے نفسیات دان کی ضرورت ہے، اور کچھ نہیں!“ پتھر یہ کہتے ہوئے سچے اٹھ گیا۔

”کل رات تو بچے! ضرور آ جانا، میں اپنی بات پر اب بھی قائم ہوں، مارتھا مری نہیں بلکہ اب بھی زندہ ہے!“ پتھر اس کی ایک نہ سنتے ہوئے رخصت ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

بارہ ضرب بارہ کے ایک کمرے میں دو آدمی آپس میں محو گفتگو تھے۔ پہلا دوسرے کو بتا رہا تھا کہ۔۔۔

”رات نو بج کر دس منٹ پر تائن و ن و ن پر کال وصول ہوئی تھی کہ اس نے پتھر کو جان سے مار دیا ہے۔ پولیس، فوریزک اور میڈیکل انساف جب عمارت پر پہنچے تو قاتل نے خود سوزی کرتے ہوئے اپنے آپ کو بھی قتل کر ڈالا تھا لیکن جو کچھ وہاں ہوا تھا، اسے دیکھ کر روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”ایسا بھی کیا ہوا تھا، وہاں؟“ جوہیر آفیسر مارکس نے سوال کیا تو ڈی ٹیکلپو پال نے اس کی آنکھوں میں چمکاتے ہوئے مزید بتانا شروع کیا۔

”کمرے میں داخل ہوتے ہی خون فرش پر پکھرا ہوا تھا۔ ہر شے جیسے سرخ رنگت میں نہلا دی گئی ہو۔ قاتل نے اپنی ہبہ رگ خود ہی کاٹ ڈالی تھی۔ پولیس والوں نے

وہاں اس کے کمرے میں ایک کرسی پائی جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ غالباً دھچکا مٹتی میں ایسا ہوا ہوگا اور بالآخر قاتل پتھر کے پیٹ، گردے، سینہ، دل اور ماتھا چیرنے میں کامیاب رہا۔ پتھر پر پتھر کے پے در پے وار کئے گئے تھے۔ بے چارے کا قہر کر دیا گیا تھا۔“

”یہ سب کچھ کرنے کی اسے کیا ضرورت پیش آئی تھی؟“ ٹھیکے سے قد کے جوہیر آفیسر مارکس نے سوال کیا۔ ”بلاوجو کوئی کسی کو قتل نہیں کرتا!“

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مارکس!“ ڈی ٹیکلپو

پال اینڈرسن نے ایک طویل آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”تفتیشی ٹیم سے معلوم ہوا ہے کہ پتھر نے تقریباً ایک ہفتہ قبل مارتھا کو قاتل دے دی تھی۔ اور طلاق کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ مارتھا ایک سوشل اور خوبصورت عورت تھی لیکن اس اچانک حادثے نے اس کی لمبی بے بسی دنیا آ جاڑ دی تھی۔ پتھر اس کی پہلی اور آخری محبت تھا۔ وہ اس کے ساتھ خلع تھی۔ اس واقعہ نے مارتھا کو جیتے جی مار ڈالا تھا۔ وہ پراگندگی ذہنیت کی وجہ سے مانگو لیا، اسکیزوفرینیا اور مسٹر یا جیسے بے قابو نفسیاتی امراض میں مبتلا ہو گئی تھی۔ نشہ آور ادویات نے اور بھی کباڑا نکال دیا۔“

مارتھا کو پتھر کے ساتھ جیتے لمحوں میں اپنی ہی کبھی باتیں سنائی دیتی تھیں، لیکن اپنے تئیں وہ خیال کر چکی تھی کہ اس کی موت واقع ہو چکی ہے، یہ نیوروسز کی خوفناک قسم ہے۔ ان امراض کا نتیجہ ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ مارتھا نے اپنے بے وقاشہ پتھر کے ساتھ کیا۔ جب کسی وفا دار عورت کے جذبات سے کھیل کر اسے قتل دیا جائے تو جیتے جی مر جاتی ہے خلع عورت! اور پھر معاشرے میں ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے جوہیر آفیسر کی جانب افسوس سے دیکھا۔ ”ہاں مارکس! ایسی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں!!! جیسی مارتھا اور پتھر کی یہ خون کی کہانی!“



**پانچویں قسط**

حقیقت سے روشناس کراتی اپنی نوعیت کی عجیب و غریب دماغ سے محو نہ ہونے والی روداد

’اب ان باتوں کا کیا فائدہ میری مرتبہ ہے

”پریکسفر کا تو کوئی علاج نہیں۔“ ساکھشی نے ر

”ساکشی کی ماں کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

”زندگی اور موت آنٹی جی اللہ کے ہاتھ میں ہے آپ اللہ پر بھروسہ رکھئے وہ آپ پر اپنی خاص رحمت کرے گا میں آپ کے لئے کم دیا ہو پانی لے کر آیا ہوں، بسم اللہ شریف میں بڑی طاقت ہے، آپ اسے باقاعدگی سے پیتی رہئے گا انشاء اللہ ہر بیماری آپ کے جسم سے نکل جائے گی۔“ عبداللہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو سرکھٹا نے کوئی جواب نہ دیا عبداللہ نے پانی کی بوتل سرکھٹا کے بیڈ کے ساتھ اونچ نیچل پر رکھ دی عبداللہ سرکھٹا کے کمرے سے باہر نکل آیا ساکشی نے اسے آواز دی..... ”کچھ کھا تو لو“

”نہیں، بس شکریہ میں آنٹی کی تیار داری کے لئے آیا تھا اب میں چلتا ہوں۔“ عبداللہ نے کہا۔

”میری ماں کی باتوں کا برا نہ ماننا۔“ ساکشی شرمندہ لہجے میں بولی۔

”نہیں، نہیں طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انسان چنچڑا ہوا جاتا ہے۔“

”اس پانی کو اٹھا کر باہر پھینک دو۔“ ساکشی کمرے میں داخل ہوئی تو سرکھٹا نفرت سے بولی۔

”مئی جی ایسا نہیں کرتے گھر آئے مہمان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔“ سنتوش نے سرکھٹا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سنتوش بیٹا ایسے لوگوں سے دوستی نہیں رکھنی چاہئے یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“ سرکھٹا نے الٹا سے سمجھانا شروع کر دیا۔

”ٹھیک ہے میں نہیں ملتا اس سے آپ یہ پانی ادھر ہی رہنے دیجئے کچھ نہیں کہتا یہ آپ کو۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ رات کا وقت ہوگا جب اچانک سرکھٹا کے سر میں درد شروع ہو گیا اس نے بے اختیار دڈوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا درد اتنا شدید تھا کہ سرکھٹا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا سر پھٹ جائے گا اس نے دیکھا دواں دم کا دروازہ بند تھا یعنی ساکشی دواں دم میں تھی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے ساکشی سرکھٹا کے ساتھ ہی سوئی تھی

اس نے ساکشی کو آواز دینے کے لئے منہ سے آواز نکالنی چاہئے مگر اس کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی سرکھٹا کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے بھرا آئے تھے اس نے ارد گرد نگاہیں دوڑائیں تو پاس ہی ٹیبل پر عبداللہ کی دی ہوئی پانی کی بوتل نظر آئی اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ بوتل اٹھالی اور ڈھلکا کھول کر بوتل منہ سے لگا لی۔

اس پانی کا حلق سے نیچے اترتا تھا کہ درد فوری طور پر غائب ہو گیا۔ سرکھٹا نے بوتل ہونٹوں سے ہٹائی اب سر میں بالکل بھی درد نہیں تھا۔

”ہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے.....“ سرکھٹا نے حیرانگی سے بوتل کو کھوٹتے ہوئے کہا۔

اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کیا پھر اس نے بوتل کا ڈھلکا لگا کر بوتل سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

اسی وقت ساکشی بھی دواں دم سے باہر نکل آئی۔

”ارے..... آپ اب تک جاگ رہی ہیں۔“ ساکشی نے حیرانگی سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹی میرے سر میں اچانک شدید درد شروع ہو گیا تھا پرتو.....“ سرکھٹا سانس لینے کے لئے رکی۔

”اوہ..... تو..... تو آپ مجھے بلا لیتیں اور یہ بوتل میں پانی کیوں کم ہے۔“ ساکشی ماں کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”بیٹی منہ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا پھر میں نے عبداللہ کی دی ہوئی بوتل اٹھائی اور ڈھلکا کھول کر منہ سے لگا لی، پانی کا حلق سے اترتا تھا کہ میرا درد فوری طور پر غائب ہو گیا۔“ سرکھٹا حیرانگی سے بولی۔

”ج..... ساکشی دلی دلی خوش ہے بولی۔“

”ہاں بیٹی یہ پانی تو واقعی بہت عسکتی شالی ہے۔“ سرکھٹا کے لہجے میں حیرانگی شامل تھی۔

”طاقت کیوں نہ ہو ماں آخراں پر بسم اللہ پڑھ کر پھونکا گیا تھا۔“ ساکشی دلی دل میں خوش ہوئی۔

پھر آہستہ آہستہ سرکھٹا کی طبیعت سنبھلنے لگی کینسر کا

سننے کے بعد سرکھٹا بیڈ سے جاگتی تھی۔ بسم اللہ کا پانی مسلسل پینے کے بعد اس کی طبیعت اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ صحت بھی اچھی ہوگئی تھی اور چلنے پھرنے بھی گئی تھی ادھر سریش بھی عبداللہ کے اخلاق اور دینی باتوں کا دیوانہ ہو رہا تھا اور پھر جب ساکشی کی ماں کی دوبارہ رپورٹیں آئیں تو ایک حیران کن خبر سنانے آئی سرکھٹا کے جسم میں کینسر بالکل بھی موجود نہیں تھا ڈاکٹر حیران رہ گیا اس نے دوبارہ رپورٹیں کرائیں تو پھر وہی نتیجہ نکلا یہ خبر سن کر سنتوش نے اپنے لاکٹ کو جو ماورسا شمسی سجدے میں جاگ رہی اور پھر وہ حسین لہجے میں آگیا جب سریش سرکھٹا کے پاس پہنچا۔

”ماں اور بالوں میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔“ سریش نے سرکھٹا اور اپنے باپ سے بے چہر کن کہو دیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم تمہاری عقل تو ٹھکانے پر ہے۔“ سرکھٹا اور اس کے شوہر غصے سے بولے۔

”میں پورے ہوش و حواس میں یہ بات کہہ رہا ہوں۔“ سریش نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تمہاری قوم ماری گئی ہے۔ سانج کیا کہے گا۔“ سریش کا باپ غصے سے بولا۔

”پتا ہی سانج کا تو کام یہی ہے کل ہم جب مرنے کے بعد اوپر والے کی عدالت میں کھڑے ہوں گے تو وہاں سانج کام نہیں آئے گا بلکہ اسلام کے راستے پر چلنا ہی کام آئے گا۔“ سریش نے کہا۔

”دھرم سے پھرنے سے ہم ترک (جہنم) میں جائیں گے۔“ ساکشی کی ماں نے بظاہر سنتوش کو آگاہ کیا۔

”پرتو بیٹا ذات برادری ہمارا جینا دو بھر کروے گی۔“ سرکھٹا نے کہا۔

”تو کیا ہوا ہمیں اوپر والا بچائے گا پتا ہی اور مانتا ہی میری بات غور سے سنئے اگر پوری دنیا آپ کو ذلیل و خوار کرنا چاہتی ہو اور صرف اوپر والا آپ کو عزت دینا چاہتا ہو تو آپ کو عزت ملے گی اور سانج ذلیل و خوار ہوگا۔“ سریش نے بس طعناں بول کر سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پرتو بیٹا..... سریش کے باپ نے کچھ کہنا چاہا مگر سریش نے انہیں ٹوک دیا۔

”پرتو کچھ نہیں پتا ہی اس حقیقت سے تو آپ بھی بخوبی آگاہ ہیں کہ موت تو ہر حال میں ملے ہے اور دنیا کی ہر دھرم کی کتاب میں یہ لکھا ہے کہ اوپر والا ایک ہے اور اوپر والے نے تو ہمیں اصل راستہ یعنی اپنا راستہ دیکھا بھی دیا ہے جس کی جتنی جاگتی مثال مانتا ہی ہیں کینسر جیسا مرض لا علاج جو کہ اس پانی کے کارن کینسر شریپر سے مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے، پتا ہی انسان سانج کے لئے نہیں بلکہ اوپر والے کے لئے جیتا ہے یہ جیون تو دود چارون کا مہمان ہے اصل جیون تو مریو کے بعد شروع ہوگا اور وہ بھی تب ممکن ہے اگر ہم اس جیون میں کامیاب ہوں تو۔“

آخر کار سریش اور ساکشی کے ماں باپ کے دل میں حق بات بیٹھ گئی اور ماں باپ بیٹے نے ساکشی کی طرح اسلام قبول کر لیا اور جب یہ بات گاؤں پہنچی تو دیانند کا فون آگیا کہ سنتوش فوراً گھر پہنچو، سنتوش اپنے سب دوستوں سے ملنے کے بعد اپنے گاؤں کی طرف نکل آیا۔

ادھر انکیز دیال نے رنیر اور کادی کی شادی بڑے دھوم سے کی تھی۔

☆.....☆.....☆

”بھائی صاحب ٹکٹ دیکھا.....“ اچانک ٹکٹ چیکر نے سنتوش کو ماضی کی یادوں سے کھینچ کر سنتوش نے پہلے ٹکٹ چیکر کی طرف دیکھا اور پھر ٹکٹ نکال کر دکھادیا سنتوش اب انجلی کے بارے میں سوچنے لگا انجلی تو اسے دھوکا دینے میں کامیاب ہوئی جانی اگر وہ لاکٹ وقت پر اسے انعام نہ کرتا تو وہ حیران تھا کہ صرف بیسیوں کی وجہ سے انجلی نے موت کا اتنا خوف ناک کھیل کھیلادہ انجلی کے گھر کے ایڈریس پر گیا تھا مگر وہاں سے پتہ چلا کہ وہاں انجلی نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی تھی یعنی وہ ایڈریس بھی فرض تھا اس نے انجلی کے متعلق کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔

”ارے کیا ہوا بھئی.....؟“ اچانک بس کو بریک لگی تو سب مسافروں نے چلانا شروع کر دیا۔

”دیکھئے شاتی رکھیئے آگے پولیس کی جیپ ہے وہ بس چپک کرے گی کیونکہ اس روڈ پر آئے دن کوئی نہ کوئی بس لوٹ لی جاتی ہے۔“ کنڈیکٹر کے سمجھانے پر سب



مسافر خاموش ہو گئے۔ بس میں تین کانٹھیل داخل ہوئے جن کے ہاتھوں میں ہندو قین تھیں وہ سب کی تلاشی لینے لگے سنوٹوں نے گردن پھیل کر طرف کھمالی پہلی سیٹ پر ایک درمیانی عمر کا آدمی پریشانی کی حالت میں بیٹھا ہوا تھا اس کی گود میں کالے رنگ کا ایک بریف کیس تھا جسے اس نے مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔

سنٹوش نے گردن سیدھی کی تو اس نے دیکھا ان کاٹیلوں میں سے ایک نے سونے کی خوبصورت گھڑی پہنی ہوئی تھی وہی کاٹیل اب سنٹوش کے قریب آ گیا تھا۔

”اس بیگ میں کیا ہے.....؟“ کاشیبل نے کے  
بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”اس میں میرے کپڑے اور مگروالوں کے لئے کچھ چیزیں ہیں۔“ سنوٹوش نے بتایا۔

”کھولو اسے“ کانٹھیل نے سخت لہجے میں کہا تو سنٹوش نے بیک کھول کر کانٹھیل کے سامنے کر دیا بیک دیکھنے کے بعد کانٹھیل نے سنٹوش کی حلائی لی اور اس کا پرس کھول کر دیکھنے لگا۔

”سراقتی خت چینگ“۔ مستوش نے سوالیہ  
لگا ہوں سے کانٹیل کی طرف دیکھا۔  
”یہ آپ لوگوں کی بھلائی کے لئے ہے۔“  
کانٹیل نے بدستور خت لہجے میں کہا۔  
”خوت مجھے تو کوئی بھلائی نظر نہیں آ رہی ہے۔“

سنتوش بڑھایا۔  
 ”کیا کہاتم نے۔“ کانٹیل نے شاید سنا نہیں تھا یا  
 جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا۔

”کچھ نہیں.....“ سنٹوش جواباً مسکرایا تو کاشمیل اسے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”کیا نام ہے آپ کا.....“ کانیشیل نے کالے رنگ کے بریف کیس والے آدمی سے پوچھا۔

”ج.....جی.....م.....م.....موہن داس۔“ وہ  
آدی جس کا نام موہن داس تھا ہکلا یا۔

”اپنا ID کارڈ دکھائے۔“ کاسٹیبیل نے موہن

موہن داں کو سمجھاتے ہوئے کہا اور وہ تینوں کا ٹھیلو بس سے اتار گئے اور تاہرے بس اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ تقریباً سب ہی مسافر بار بار پیچھے مڑ کر موہن داں کی طرف دیکھ رہے تھے اور بے جا رہے موہن داں کے پسینے چھوٹ رہے تھے جبکہ سنسٹو آٹھ گھنٹیں بند کئے لاکٹ کی زنجیر میں اپنی اگلی گھمراہا تھا تاکہ اس نے جھلکے سے آٹھ گھنٹیں کوئیں اور یکدم ہاتھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ارے کیا ہوا بھئی۔“ کنڈیکٹر نے حیرانگی سے کہا۔

”اے جی اگراں دیرانے میں بس روی تو یہ  
موہن داس کے کارن پوری بس کے مسافر سنکٹ میں

اور آپ لوگ شکست میں نہ پڑو تو بس کٹھوری طود پر روک

”مک“ کے لفظ کے ساتھ ایک اور چیز بھی جمع ہے۔

”اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ صحیح سلامت اپنی

پس کی دھری آگئے، دور سڑک پر دور وشنیاں نظر آئیں  
تھیں سنتوش نے لاکٹ کو ہاتھ میں تھاما اور حسرت بھری

15 May 2016

پچھتے ہی وہی لوڈ ٹرک تھا جس میں ڈرائیور سکیہ تھا۔  
 ”جی بادشاہو..... خیر تو ہے“ سکیہ نے مسکراتے  
 ہوئے پوچھا۔

”بادشاہو آپ نے کہاں تک جانا ہے۔“ التماسِ وار  
نے پوچھا۔

”بھو آپ کا بندہ بیچ گیا..... آؤ جی چڑھ جاؤ ٹرک پر۔“ سکھ نے پہلے سنٹوش اور پھر موہن داس سے

میں نے اس کا تیل (مغزی و ملا) کی آنکھوں میں لالچ صاف محسوس کی تھی تمہاری آنکھوں میں مجھے سچائی

بس میں آ کر بیٹھ گیا اب سب مسافر سوالیہ نگاہوں سے سنتے دکھا دیکھا کرتے تھے مگر سنتے نہ تھے نہ دیکھتے تھے نہ

سے رکی اور تقریباً سبھی مسافر اگلی سیٹوں سے ٹکرائے

”وہ..... وہ بس کے سامنے اچانک ایک گاڑی  
 آ کر کھڑی ہو گئی ہے۔“ ذرا سہر نے ہلکاتے ہوئے کہا۔

کے رنگ فق ہو گئے عورتوں نے مجبوراً پھر چمن شمع شروع کر دیا۔  
 ”خاموش ہو جاؤ ورنہ سب کو بھول ڈالوں گا۔“

•

اور بس میں یک دم خاموشی چھا گئی اب چاروں نقاب پوشوں نے موہن داس کی سیٹ کی طرف دیکھا ان میں سے ایک موہن داس کی سیٹ کے قریب آیا۔

”اس سیٹ پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا وہ کہاں گیا.....؟“ نقاب پوش نے سنستوش سے پوچھا۔

”وہ موہن داس جی۔“ سنستوش نے جان بوجھ کر تصدیق چاہی۔

”ہاں.....“ نقاب پوش ہکلا اور پھر سنبھل کر بولا۔

”جو کوئی بھی تھا وہ کہاں ہے۔“

”وہ تو بس سے نیچے اتر کر اپنے گاؤں کی طرف چلے گئے تھے۔“ سنستوش نے جھوٹ موٹ کی کہانی سنائی۔

”یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ نقاب پوش پریشانی سے بڑبڑایا۔

”جی کچھ کہا آپ نے۔“ سنستوش نے پوچھا۔

”ہوں.....“ نقاب پوش چونکا۔

”نہیں کچھ نہیں۔“

سنستوش نے اس نقاب پوش کی کلائی پر بندھی سونے کی گڑھی دیکھ لی تھی۔

”چلو چلتے ہیں۔“ گھڑی والے نقاب پوش نے اپنے بانی ساتھیوں سے کہا۔ جو یقیناً تھوڑی دیر پہلے بس میں داخل ہونے والا کاشیمل تھا وہ چاروں نقاب پوش بس سے اتر گئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ان نقاب پوشوں نے بس کے کسی اور مسافر کو چھوا بھی نہیں اب بس کے بھی مسافر واہبھری نظروں سے سنستوش کی طرف دیکھ رہے تھے اور سنستوش بے چارہ مسکرانے کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہیں اس کے گلے سے وہ لاکٹ اترانا ہوگا۔“ کمرے میں موجود سایہ کے منہ سے آواز خارج ہوئی۔

”م..... م..... میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔“

کمرے میں موجود آدمی ہکلا یا۔

”تمہیں یہ کام کرنا ہوگا ورنہ تمہارا انجام بہت بے نیک ہوگا۔“

اب ایک۔ اس سایہ کے منہ سے غضب ناک آواز نکلی تو وہ آدمی بری طرح کانپنے لگا۔

”م..... م..... میں کوشش کروں گا۔“ وہ آدمی بدستور ہکلاتا ہوا بولا۔

”کوشش نہیں..... تمہیں یہ کام ہر حال میں کرنا ہوگا اس سے تمہیں بھی فائدہ ہوگا اور مجھے بھی۔“ سایہ کے منہ سے آواز نکلی۔

”تم خود بھی تو وہ لاکٹ اترنا سکتے ہو حالانکہ تم شقی شالی ہو۔“ اس آدمی نے کہا۔

”نہیں وہ لاکٹ زیادہ شقی شالی ہے..... اگر اس لاکٹ کی موجودگی میں، میں سنستوش کے سامنے آ گیا تو میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔“ سایہ کے منہ سے آواز نکلی۔

”اس سے پہلے بھی میں نے رنگا اور انجلی کے ذریعے اس کے گلے سے لاکٹ اترانا چاہا پرنتو اس نے ان دونوں کو ٹپکی لاکٹ دے دیا تھا۔“

”اگر تم سے یہ کام نہیں ہو سکا تو میں یہ کام کیسے کروں گا۔“ اس آدمی نے پوائنٹ اٹھایا۔

”تمہارے لئے آسان ہے کیونکہ تم ایک انسان ہو اور میں.....“ سایہ نے حسرت زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑی۔

”ٹھیک ہے میں یہ کام کروں گا۔“ آخر کار وہ آدمی رضامند ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

سنستوش کے آنے سے دیانند اور رانی بہت خوش نظر آ رہے تھے انہوں نے خوشی سے سنستوش کا استقبال کیا۔

”بیٹا اب تم گاؤں میں موجود ہماری زمینوں کو سنبھال لو۔“ دیانند نے کہا۔

”آپ بھی بڑے عجیب آدمی ہیں ابھی میرے سپیڈ کوسٹس لینے دو آتے ہی کام کی باتیں شروع کر دیں۔“ سنستوش کی ماں نے منہ بناتے ہوئے کہا تو سنستوش اور دیانند بے اختیار مسکرا دیے۔

”ارے بھیجی میں تو سمجھا رہا تھا۔“ دیانند نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں..... بعد میں سمجھائیے گا۔“ رانی نے غصے سے کہا تو بے اختیار ایک مرتبہ پھر باپ بیٹا ہنس پڑے اور پھر کاسی رام مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا دونوں دوست مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔

”آگئی تجھے گاؤں کی یاد۔“ رام معنوی غصے سے بولا۔

”مجھے نہیں بلکہ گاؤں کو میری یاد آدمی تھی سو میں چلا آیا۔“ سنستوش نے کہا تو رام ہنس پڑا رام نے دیانند اور رانی کے پاؤں چھوئے دونوں نے اسے پیار دیا۔

”تمہاری ٹانگ کیسی ہے اب۔“ سنستوش نے پوچھا۔

”تمہارا دیا ہوا درم تھا بھی..... تھوڑی بہت تو کسر رہی تھی ناں۔“ رام نے مسکراتے ہوئے کہا تو سنستوش بھی مسکرا دیا۔

”ویسے سنستوش میری سمجھ سے باہر ہے کسا خر تمہیں اس دن ہوا کیا تھا۔“ رام حرا گئی سے بولا۔

”چھوڑ پرانی باتوں کو یہ بتا کر اب تو کیا کرتا ہے۔“ سنستوش نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”میں بتا جی کے ساتھ ہوتا ہوں۔“ رام نے بتایا۔

”بس تو پھر تمہارا پتہ جی کا پتہ نہیں کیا حال ہوگا۔“ سنستوش نے کہا تو رام کے علاوہ دیانند اور رانی دونوں ہنس پڑے۔

”جی نہیں..... جب سے پتہ جی کے کام میں، میں نے ہاتھ بٹانا شروع کیا ہے تو کام دن دگنی اور رات چوگنی تر تری کر رہا ہے۔“ رام منہ بناتے ہوئے کہا۔

”میرا وہم ہوگا۔“ سنستوش نے کہا۔

”وہم..... نہیں تو۔“ رام اپنی ہی ذہن میں کہہ گیا اور مجبوراً اسے پتہ جی کے قہقہے سننے پڑے۔

”انگل آئی آپ بھی اس کا ساتھ دے رہے ہیں.....“ رام نے بچوں کی طرح منہ بناتے ہوئے کہا تو پھر قہقہوں کی برسات ہوئی۔

”جہل اب باتیں چھوڑ اور کھانا کھاتے ہیں۔“ سنستوش نے کہا تو رام نے اثبات میں سر ہلا دیا دونوں گھر

سے باہر نکل آئے۔

”میرے گھر چل.....“ رام نے کہا تو سنستوش نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رام کے ماں باپ سے ملنے کے بعد دونوں کمرے میں آئے۔

”اور سناؤ شہر والوں کا کیا حال ہے۔“ رام نے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ سنستوش نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”آ خر تو وہاں گیا تھا کسی نہ کسی کو سکٹ میں ڈالا ہوگا ناں۔“ رام نے کہا تو سنستوش بے اختیار مسکرا دیا۔

”نہیں نہیں وہاں کچھ نہیں کیا میں نے۔“ سنستوش نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یہ تو خیر ہو نہیں سکتا۔ بچپن میں یاد ہے جب تو مجھے قبرستان میں لے گیا تھا.....“ رام نے کہتے ہوئے سنستوش کو یاد دلایا۔

”ہاں، ہاں یاد ہے جب تو پشیشاب کے کارن کسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔“ سنستوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے تجھے منع بھی کیا تھا پرنتو تو مانا ہی نہیں اور وہ دن بھی یاد ہوگا جب گاؤں میں دو بجی آدمی آئے تھے۔“ رام نے سنستوش کو مزید یاد دلایا۔

بالکل یاد ہے ان اجنبیوں کا پاس رنگا تھا جو حوالات سے پر اسرار طور پر غائب ہو گیا تھا اسپیکر دیال نے غصے کے کارن اس کے چہرے پر تشویر مارا تھا اس نے تو اسپیکر دیال سے انتقام لینے کے لئے بہت گھناؤنا کھیل کھیلا تھا پرنتو اوپر والے نے خیر کی اور سب ماحول ہوئی۔“ سنستوش نے کہا۔

”یار میں نے ایک اور عجیب بات سنی ہے۔“ رام نے کہا تو سنستوش نے سوالیہ نگاہوں سے رام کی طرف دیکھا۔

”تیرے ماما اور ماما نے اپنا دھرم کیوں بدل لیا وہ مسلمانوں ہو گئے ہیں۔“

”تو کیا ہوا..... انہیں سیدی راہ نظر آئی تو انہوں

نے اختیار کر لی۔ "سنٹوش نے کندھے اچکائے۔  
 "تیرا دماغ ٹھیک ہے کہ اسے تو سیدھی راہ کہہ رہا ہے۔" رام کا لہجہ جیراگی سے بھر پور تھا۔  
 "تو دھرم کے بارے میں کیا جانتا ہے؟" سنٹوش نے پوچھا۔  
 "زیادہ کچھ نہیں۔" رام نے بتایا۔  
 "تو پھر چپ رہ کیونکہ تجھے تو اصل میں دھرم کے بارے میں جانکاری ہی نہیں ہے تو تجھے سمجھانے کا کیا فائدہ؟" سنٹوش نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
 "میں سمجھتا بھی نہیں چاہتا تو یہ غلط ہے جو تم تک پہنچتا ہے۔" رام نے منہ بناتے ہوئے کہا۔  
 "غلط سچ کی پہچان پر کھنے سے ہوتی ہے انہوں نے پرکھا دیکھا اور سمجھا پھر انہوں نے اسلام قبول کر لیا میرے خیال سے تو ان کا فیصلہ بالکل سچ ہے کیونکہ انسان کو پورا پورا حق ہے وہ اپنے دھرم کی جانچ کرے اسے سمجھے جو بات انہیں اچھی لگے وہ اپنائے۔" سنٹوش نے صاف اور سیدھی بات کی۔  
 "تو پھر تو نے دھرم کیوں نہیں بدلا۔" رام نے طنز یہ لہجے میں کہا۔  
 "یہ تو اوپر والے کے فیصلے ہیں دیکھتے ہیں وہ ہم پر کب کر پا کرتا ہے۔" سنٹوش نے اوپر کی جانب نگاہیں اٹھاتے ہوئے کہا۔  
 "کیسی عجیب اور بے تکی باتیں کر رہا ہے تو۔۔۔۔۔" رام کو فضا آ گیا۔  
 "بے تکی نہیں حقیقی باتیں کر رہا ہوں میں۔" سنٹوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "چل چھوڑاں باتوں کو۔ تجھے ایک نیو نیوز ملی۔" رام نے سنٹوش کی توجہ دوسرے موضوع کی طرف مبذول کی۔  
 "کون سی نیوز؟" سنٹوش چونکا۔  
 "تمہارے گھروہ چوکیدار تھا ناں۔۔۔۔۔" رام نے سنٹوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 "ہاں، ہاں۔۔۔۔۔ عبد اللہ انکل۔" سنٹوش نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کا تو کئی سال پہلے دیہانت ہو گیا تھا۔" رام نے عجیب خبر سنائی۔  
 "اوہ۔۔۔۔۔" دکھ کے باعث سنٹوش کے منہ سے نکلا اور اس کی آنکھوں میں نمی نظر آنے لگی۔  
 "لوئے۔۔۔۔۔ تجھے کیا ہوا۔۔۔۔۔؟" رام حیران ہوا۔  
 "یہ تو نہیں سمجھے گا۔" سنٹوش لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔  
 "اس کی بیٹی ہے خدیجہ جو کہ بہت سندر باری ہے۔۔۔۔۔ میں نے پوری حیرتی پراقتی سندر کیا نہیں دیکھی اگر وہ میرے دھرم کی ہوتی ناں تو میں کب کا اسے اپنی پتی بنا چکا ہوتا۔" رام نے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔  
 "شرم کرتو۔۔۔۔۔ عورت چاہے کسی بھی دھرم کی ہو یا نہ ہو اسے عزت کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔" سنٹوش نے غصے سے کہا اور اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا اسے رام کی یہ بات اچھی نہ لگی تھی رام اسے آوازیں دیتا رہ گیا۔ مگر اس نے رام کی ایک نہ نہی۔  
 ☆.....☆.....☆  
 سنٹوش نے لکڑی کے اس ٹوٹے پھوٹے دروازے پر نگہ ڈالی اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔  
 "کون۔۔۔۔۔؟" تھوڑی دیر بعد اندر سے پوچھا گیا وہ نسوانی آواز تھی جس نے سنٹوش کے کانوں میں رس مگھولا۔  
 "وہ۔۔۔۔۔ وہ جی یہ عبد اللہ انکل کا گھر ہے ناں۔۔۔۔۔" سنٹوش نے بظاہر تصدیق چاہی۔  
 "جی ہاں۔۔۔۔۔" اندر سے پھر وہی خوب صورت آواز آئی۔  
 "میں دیا بند کا بیٹا ہوں اور انکل عبد اللہ کی پتی سے ملنا چاہتا ہوں عبد اللہ انکل ہمارے ہاں ہی کام کرتے تھے۔" سنٹوش نے بتایا۔  
 "آپ سنٹوش ہیں ناں۔" اندر سے تھوڑے وقت کے بعد مسکراتی آواز سنٹوش کے کانوں سے نکل گئی۔  
 "ابو جی گھر میں زیادہ تر آپ کا ہی ذکر کرتے تھے آپ کی بہت سی باتوں کا ذکر وہ مجھ سے اور امی جان سے کیا

کرتے تھے زندگی کے آخری لمحوں میں انہیں آپ سے ملنے کی بے حد خواہش تھی لیکن۔۔۔۔۔" اندر سے آنکھوں زدہ لہجے میں بات ادھوری چھوڑی گئی۔  
 "پرتو انکل مجھے خبر تو کرتے۔۔۔۔۔" سنٹوش کا لہجہ بظاہر شکایتی تھا کیونکہ اسے بھی اس بات کا دکھ تھا کہ وہ عبد اللہ سے مل نہ سکا۔  
 "۔۔۔۔۔ آپ کے والد صاحب کو خبر کی تو تھی مگر۔۔۔۔۔ پتہ نہیں انہوں نے آپ کو اطلاع کیوں نہیں کی۔" اندر سے حیرانی سے بھر پور آواز آئی۔  
 "اوہ۔۔۔۔۔ پتا جی۔۔۔۔۔" سنٹوش نے گہری سانس کھینچی وہ سمجھ گیا تھا کہ دیا بند نے اسے کیوں خبر نہیں کی کیونکہ وہ عبد اللہ کے خلاف تھے۔  
 "خیر آپ مجھے اندر آنے کو نہیں کہیں گی کیا۔۔۔۔۔؟"  
 "اوہ۔۔۔۔۔ معاف کیجیے گا میں بھی بڑی بے وقوف لڑکی ہوں۔ آپ اندر آئیے۔" ساتھ ہی وہ لکڑی کا ٹوٹا پھوٹا دروازہ مزید کھل گیا اور سنٹوش اندر داخل ہوا اندر مکان کی حالت کافی خستہ حال تھی سنٹوش نے دیکھا دروازے کے پیچھے قید اور پھرے جسم کی لڑکی کھڑی تھی اس نے اپنے دوپٹے سے چہرے پر نقاب کیا ہوا تھا لیکن اس کی جھیل جھیلی خوب صورت آنکھیں نقاب کی قید سے آزاد تھیں آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی کہ نظر ہٹانے کو ہی نہیں چاہتا تھا۔  
 "آئی کجاں ہیں۔۔۔۔۔؟" سنٹوش اس کی آنکھوں میں کھوتے ہوئے بولا۔  
 "دوسرے کمرے میں۔" خدیجہ نے اپنے خوب صورت ہاتھ سے دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور سنٹوش دوسرے کمرے کی طرف بڑھا۔  
 "گھر کا گزارہ کیسے ہوتا ہے۔" سنٹوش نے پوچھا۔  
 "گزارہ۔۔۔۔۔ وہی کرتا ہے جس نے رزق کا وعدہ کیا ہے محلے کے بچوں کو قرآن پڑھاتی ہوں اس سے اچھی بجلی گزر رہی ہوتی ہے۔" خدیجہ نے مسکراتے ہوئے بتایا۔  
 "گھر کی حالت بھی کافی خراب ہے۔" سنٹوش

نے ارد گرد نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔  
 "گھر۔۔۔۔۔ رہنے کے لئے چھت موجود ہواں سے بڑا اور ایک کرم ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کا۔۔۔۔۔ ویسے جی کریم نے فرمایا۔" دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے انسان سفر میں ہو اور کچھ دیر کے لئے قیام و طعام کرتا ہے قیام و طعام دنیا ہے اصل زندگی تو آخرت ہے اگر ہم اس زندگی میں آسائش ڈھونڈتے رہے تو دوسری اور اصل زندگی میں ہمارا کچھ حصہ نہیں ہوگا۔" خدیجہ نے کہا تو سنٹوش نے اس کی بات سے اتفاق کیا وہ دونوں اب کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔  
 "کمرے میں ایک بوڑھی عورت چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی جو سنٹوش کو دیکھ کر کھڑکھڑائی۔  
 "السلام علیکم۔۔۔۔۔" سنٹوش نے عبد اللہ چوکیدار کی بیوی زبیدہ کو سلام کیا۔  
 "علیکم السلام۔۔۔۔۔" زبیدہ نے سنٹوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ سنٹوش زبیدہ کی چار پائی پر بیٹھ گیا۔  
 "اماں جی کیسی ہیں آپ۔" سنٹوش نے پوچھا۔  
 "اللہ کا بڑا کرم ہے بیٹا۔" زبیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
 "سچ پتا مجھے آپ نے۔" سنٹوش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔  
 "نہیں۔۔۔۔۔ ویسے بھی اب میں بوڑھی ہو چکی ہوں نظر ٹھیک طرح کا نہیں کرتی ہے۔" زبیدہ نے کہا۔  
 "میں سنٹوش ہوں، دیا بند کا بیٹا۔" سنٹوش نے اپنا تعارف کرایا۔  
 "تو تو جوان ہو گیا ہے چھوٹا سا تھا جب یہاں آتا تھا اللہ بخشے خدیجہ کے ابو آخری لمحوں میں تجھے بڑا یاد کرتے تھے میں تمہارے گھر کئی مرتبہ جی مگر تمہارے والد نے مجھے ہر مرتبہ جھڑک دیا۔" زبیدہ نے آنکھوں زدہ لہجے میں کہا۔  
 "میں پتا جی سے جاکر پوچھوں گا۔" سنٹوش نے کہا اتنی دیر میں خدیجہ پانی کا گلاس لے آئی اس کے چہرے پر ابھی بھی نقاب تھا، سنٹوش نے پانی پیا اور خالی



گلاس خدیجہ کو پکڑا دیا جسے لے کر وہ باہر نکل گئی تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر عورت بھی جسے حملہ ماسی تاجو کے نام سے پکارتا تھا۔۔۔۔۔

”ارے سنتوش آیا ہے۔“ ماسی تاجو نے آگے بڑھ کر سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا سنتوش کو بزرگوں کی یہ عادت بہت پسند تھی۔

”بڑے عرصہ بعد آیا ہے تو۔۔۔۔۔“ ماسی تاجو نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ماسی۔۔۔۔۔ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد آیا ہوں۔“ سنتوش نے جواب دیا۔

”تو پڑھ میں ہی کوئی کام وام کر لیتا تھا۔“ ماسی تاجو نے بظاہر مشورہ دیا۔

”ماسی میرے لئے کام تو یہی بہت ہے اپنے پرکھوں کی زمین سنبھالوں گا اور ایسے بھی انسان کی اصل بھوک دوسے کی روٹی ہے۔“ سنتوش نے کہا۔

”ماشاء اللہ بڑی اچھی سوچ ہے بیٹا تمہارا۔ تو یہ ساتھ والی کرتارے کی بیوی ہے ناں پرتوشکل وقت میں مجھ سے تین ہزار روپے ادھار لے گئی کہہ رہی تھی میرا بیٹا بڑا بیمار ہے جلدی واپس کر دوں گی مجھے ترس آ گیا میں نے دے دیا چار پانچ مہینے ہو گئے ہیں اس بات کو لیکن ابھی تک واپس نہیں کئے دیے بھی ان غیر مذہبوں پر بھلائی کرنی ہی نہیں چاہئے۔“ ماسی تاجو غصے سے بولی۔

”کوئی احسان کا بدلہ دیتا ہے نہیں۔“

”ماسی انسان پرا حسان کیوں کیا جاتا ہے۔“ ایک طرف بیٹھی خدیجہ نے پوچھا۔

”اللہ کا حکم ہے خدیجہ پتر اور ایسے بھی اللہ احسان کی مدد انسان کے ذریعے ہی پوری کرتا ہے۔“ ماسی تاجو نے پیار سے جواب دیا۔

”یعنی صرف اللہ کو خوش کرنے کے لئے۔۔۔۔۔؟“

خدیجہ نے سوالیہ نگاہوں سے ماسی تاجو کی طرف دیکھا۔

”بالکل پتر۔“ ماسی تاجو نے جواب دیا۔

”تو پھر اس احسان کا بدلہ بھی اللہ سے ہی مانگنا چاہئے کیونکہ احسان کا بدلہ اللہ دیتا ہے اگر احسان کا بدلہ

انسان ہی دے دے تو پھر اللہ کو کون یاد کرے گا اسی لئے ہم جب بھی کسی پرا حسان کریں تو نیت یہ رکھنی چاہئے کہ اللہ اس کا اجر دے گا اور آخرت میں بھی ہمیں اس کا اجر دے گا جو ہماری اصل زندگی ہے یہ زندگی تو ماسی ہماری نجانے کب ختم ہو جانی ہے اس لئے اس زندگی کو چھوڑ کر ہمیں اصل زندگی کی بھಾಗ دوڑ میں لگنا چاہئے اور احسان صرف اپنے لوگوں (مذہب والے) پر ہی نہیں بلکہ غیر مذہبوں پر بھی کرنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی کو یہ دیکھ کر رزق نہیں دیتا کہ وہ اللہ کا نام لیتا ہے کہ نہیں وہ صرف رزق دیتا ہے اسی لئے دنیا کا ہر انسان چاہے وہ مسلمان ہو چاہے ہندو، سکھ ہو یا کوئی اور سب ہی جانتے ہیں کہ اللہ ایک ہے لیکن محض اپنی انا کی خاطر اپنے بزرگوں کی خاطر بتوں اور انسانوں کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں آپ نے کرتارے کی بیوی کو پیسے دیے ہیں ناں کل وہ اپنے مذہب کی کئی عورتوں سے اس بات کا تذکرہ کرے گی کہ ماسی تاجو نے غیر مذہب کی ہونے کے باوجود میری مدد کی شاید آپ کے اس احسان کی وجہ سے کوئی غیر مذہب والا شاید مذہب والا بن جائے ہمارے نبی بھی تو غیر مذہب والوں پر بہرمان تھے اور ان کی عادات اور اخلاق کی وجہ سے لوگ روشنی میں داخل ہوئے ہمیں اسی لئے ہمارا طور طریقہ ہمارے نبی کریم جیسا ہونا چاہئے میں یہ نہیں کہتی کہ آپ اپنے پیسے بھول جائیے لیکن جب آپ کو ان پتیلوں کی اشتداد اور سخت ضرورت ہوگی تب آپ کو یہ پیسے لازماً مل جائیں گے اور وہ اللہ دے گا۔“ خدیجہ نے اپنی آسمان کی طرف اٹھائی۔

”واہ۔۔۔۔۔“ بے اختیار سنتوش کے منہ سے نکلا۔

”آپ تو واقعی عبداللہ بالکل کی بیٹی ہیں۔“

سنتوش نے خدیجہ کی آنکھوں سے اندازہ لگا دیا وہ مسکرا رہی تھی نقاب ابھی بھی اس کے چہرے پر موجود تھا اور سنتوش کو اس بات کی تسننی کی کہ وہ خدیجہ کا چہرہ دیکھے مگر وہ یہ بات منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

سنتوش گھر پہنچا تو اس کے والد دیانند کہیں نکلنے کے لئے تیار تھے۔

”پتائی یہ بات تو بالکل غلط ہے۔“ سنتوش نے

پوچھا۔

”اپنی زمینوں کی طرف جا رہا ہوں۔“ جواباً دیانند مسکراتے۔

”میں بھی چلوں۔“ سنتوش نے بظاہر اجازت چاہی۔

”کیوں نہیں بیٹا۔۔۔۔۔ آخر کل کو تم نے ہی تو سارا کچھ سنبھالنا ہے۔“

دیانند نے مسکراتے ہوئے کہا تو جواباً سنتوش بھی مسکرایا وہ اپنی زمینوں پر پہنچے تو تاحند نگاہ زمینوں کی ہریالی بھیلی ہوئی تھی سنتوش نے دیکھا ایک طرف ان کے کھیتوں میں احمد دین مل چلا رہا تھا دھوپ کی وجہ سے اس کا برا حال تھا وہ ایک ضعیف آدمی تھا اور پیسے کی وجہ سے اس کا برا حال تھا دھوپ کی تیز شعاعیں اس کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔

رامانند بابا اس پر چلا رہا تھا۔

”انکل جی انکل احمد دین کب سے مل چلا رہے ہیں۔“

”سنتوش پتر صبح کالا گے ہے۔“ رامو نے احترام سے جواب دیا۔

”اور انہیں آرام کرنے کا سہ دیا کہ نہیں۔“

سنتوش نے پوچھا۔

”آرام۔۔۔۔۔“ رامو حیران ہوا۔ ”آرام کا ہے کا سنتوش پتر۔“

”ہاں بیٹا۔۔۔۔۔ آرام کس لئے ہم تو کام کے پیسے دیتے ہیں آرام کے نہیں وہ اچھوت ہے۔“ دیانند خشک لہجے میں بولا۔

”پتائی یہ بات تو بالکل غلط ہے۔“ سنتوش دھکی لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب۔۔۔۔۔؟ تم مجھے غلط کہہ رہے ہو۔“

دیانند زراحت لہجے میں بولا۔

”میں آپ کو نہیں پتائی آپ کے دھاروں کو غلط کہہ رہا ہوں اور افسوس رامو صاحب کے دھار بھی یہی ہیں۔“ سنتوش افسوس زدہ لہجے میں بولا۔

”وہ کیسے۔۔۔۔۔؟“ دیانند نے عجیبہ لہجے میں پوچھا۔

”اب آپ ہی دیکھئے احمد دین کی محنت سے جو فصل تیار ہوئی ہے وہ لاکھوں میں کیے گی۔ اور ساری جتنا اس فصل سے فائدہ حاصل کرے گی یعنی اس ایک مزدور کے کارن کتنے فائدے ہوں گے اور ہم اس کی محنت کا خیال نہیں رکھیں گے تو وہ بیمار پڑ جائے گا اور ہمارے کام کا کتنا نقصان ہوگا۔۔۔۔۔“

”جب وہ ہمارا اتنا خیال کرتا ہے تو ہمارا کرتیو بنتا ہے کہ اس کا خیال کریں اسے تھوڑا بہت آرام کرنے کا موقع دیں مہین بھی جب زیادہ جلتی ہے تو ہمیں اس کی بھی ٹیوننگ کروانا پڑتی ہے اگر ہم اس کی ٹیوننگ کرواتے رہیں گے تو وہ ٹھیک کام کرے گی ورنہ وہ بھی ایک دن خراب ہو جائے گی اسی طرح انسان بھی کام کے دوران اگر کچھ سے کے لئے ریٹ کرے اپنا پیٹ بھرے تو وہ باقی کام اچھے طریقے سے کر سکتا ہے اور ایسے بھی اگر ہم مزدور کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں گے تو وہ ہمارے پاس زیادہ سے کام کرے گا اور اگر ہمارا برتاؤ اچھا نہیں ہوگا تو ہم بھی اچھا مزدور نہیں رکھ سکیں گے آخر کار مزدور بھی تو ہماری طرح کا ایک انسان ہے اگر ہم ایک منٹ کے لئے اس دھار کو ذہن میں لائیں کہ اگر کوئی ہم میں سے احمد دین کی جگہ ہوتا تو احمد دین ہماری جگہ ہوتا اور وہ ہم سے ایسا برتاؤ کرتا جو ہم اس کے ساتھ کر رہے ہیں تو ہمارے دل پر کیا گزرتی اس دھار کے کارن ہمیں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت تو احمد دین کا خیال رکھنا چاہئے۔“ سنتوش نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”سنتوش بابو تم ان بکیروں میں نہ ہی پڑو تو اچھا ہے وقت کے ساتھ ساتھ تمہیں ہر چیز کی سمجھ آ جائے گی۔“ رام دین نے بظاہر سنتوش کو بھجایا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

وہ ایک چھوٹی سی جھوپڑی تھی جس میں تین افراد بیٹھے تھے ایک ضعیف بوڑھا تھا جس کے لیے لے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے نہایا نہ ہوا اس کے جسم سے اتنی تیز اور گندی بدبو نکل رہی تھی کہ سامنے بیٹھی دونوں عورتوں کا برا حال تھا لیکن وہ دونوں اس ضعیف کے

سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھی ہوئی تھیں اور اس بوڑھے کی ہوس بھری نگاہیں ان عورتوں میں سے جوان عورت پر لگی ہوئی تھیں اور وہ عورت اس بات کو صاف محسوس کر رہی تھی اور کبھی کبھی اس بوڑھے کی طرف نظریں چرا کر دیکھ بھی لیا کرتی تھی۔

”ہاں بول لی لی..... کنیا کو کیا کشت ہے.....“ آخر کار اس بوڑھے نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”باباجی میری بہو کے ہاں اولاد نہیں ہے اگر آپ کی کرپا ہو جائے تو..... ان دونوں عورتوں میں سے بوڑھی عورت کو رکھ لیتے ہوئے بولی۔

”کیا نام ہے اس کنیا کا.....؟“ بوڑھے نے اپنی غیبی نگاہیں اس جوان عورت پر گاڑتے ہوئے کہا۔

”جی سندرہ.....“ بوڑھی عورت نے بتایا۔

”اپنے نام کی طرح سندرہ.....“ بوڑھا بوڑھلا۔

”اولاد تو اسے مل جائے گی پر تو تیری بہو کو روزانہ رات کے سے یہاں آنا ہوگا۔“ غیبی بوڑھے نے شیطانی نگاہوں سے سندرہ کی سرپا پر نظر ڈالی اور سندرہ اسے غصے سے سمجھنے لگی لیکن بوڑھے کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ طاری رہی۔

”پپ..... پردات کے سے“ پریشانی کے باعث سندرہ کی ساس کے منہ سے نکلا۔

”مورکھ عورت میں چندہ رات تک اس پر منتر پڑھوں گا وہ بری آتما نہیں جو اس کی اولاد میں رکاوٹ بن رہی ہیں میں انہیں اس سے دور بھاگوں گا بہت کچھ کرنا پڑے گا مجھے، تب کہیں جا کر اس کے ہاں خوب صورت اولاد جنم لے گی۔“ غیبی بوڑھا یکدم بھڑکتے ہوئے بولا

اور سندرہ اور اس کی ساس یکدم ہم گئیں۔

”پر تو اس کا بچہ نہیں مانے گا۔“ سندرہ کی ساس پریشان کن لہجے میں بولی۔

”جی..... مورکھ بڑھیا اگر تیرے سپہتر کے ہاں اولاد نہ ہوئی تو وہ سندرہ کی جگہ ایک اور بچی لے آئے گا۔“ بوڑھے نے کن بھیڑ سے سندرہ کی طرف دیکھا

اور سندرہ کے چہرے پر یکدم پریشانی نے سیر کر لیا۔

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا۔“ سندرہ کی ساس کو شاید بوڑھے کی باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

”جب زمین بھر ہو جائے اور کسان کی بار بار کوششوں کے باوجود زمین پھل نہ دے تو کسان اس زمین کو بیج کر بھٹی زمین خرید لیتا ہے۔“ بوڑھے نے بدستور سندرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری بات تو شاید کبھی نہیں جب سندرہ کے ہاں کوئی سنتان ہی نہیں ہوگی تو آخر کار وہ اسے چھوڑ دے گا، نادان مت بن اور سندرہ کو روزانہ میرے پاس بھیج پر بھوک کرپا رہی تو ایک دن ضرور سندرہ کی گود ہری ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے باباجی میں آج سے ہی سندرہ کو آپ کے پاس بھیج دیا کروں گی۔“ یعنی سندرہ کی ساس نے ہار مانے ہوئے کہا تو غیبی بوڑھے کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ نے سیر کر لیا تھوڑی دیر بعد دونوں ساس بہو اٹھیں اور بوڑھے کی جمپوڑی سے باہر نکل آئیں۔

سنتوش بھی اسی طرف آ رہا تھا۔ ”ارے سنتوش بیٹا تو.....“ سندرہ کی ساس بیارے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”جی ماسی میں.....“ جوابا سنتوش مسکرایا۔

”کب آیا گاؤں میں۔“ سندرہ کی ساس نے پوچھا۔

”دو چار دن ہی ہوئے ہیں۔“ جوابا سنتوش نے بتایا۔

”ماسی کدھر سے آ رہی ہو۔“

”میں باباجی کے پاس گئی تھی۔“ سندرہ کی ساس نے بتایا۔

”خیر تو ہے ماسی۔“ سنتوش نے پوچھا۔

”ہاں بیٹا..... یہ مہندر کی بچی کو چار سال ہو گئے ہیں شادی کو پر تو گودھونی ہے۔“ باباجی سے یہی کہنے آئی تھی۔

”سندرہ کی ساس نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

”تو باباجی لوگوں کو سنتان دیتے ہیں۔“ سنتوش نے حیرانگی سے کہا۔

”ہاں بیٹا بڑی بچی ہوئی ہستی ہیں باباجی۔“ سندرہ کی اس نے کہا۔

”پر تو یہ اختیار تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے اسی۔“ سنتوش نے سندرہ کی ساس کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ جو بھگوان کے بچاری زمین پر ہوتے ہیں ان میں بھی بھگوان کی لکھتیاں ہوتی ہیں وہ بھی ہر کام کر سکتے ہیں۔“ سندرہ کی ساس نے کہا۔

”میں ماسی پہلی بات یہ کہ ہم سب میں غلط لکھیاں ہیں کہ انسان بھی اوپر والے جیسا کام کر سکتے ہیں یہ بات بالکل غلط ہے۔ ماسی اوپر والے کا تو انداز ہی نرالا ہے دینے کی شکتی لینے کی شکتی یہ اوپر والے کا اختیار ہے انسان جتنا مرضی پٹنے کا کام کر لے وہ کسی کونہ ہی جان دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ کسی کی جان لے سکتا ہے۔ آنے والے کل کے بارے میں بھی سوائے اوپر والے کے کوئی نہیں جان سکتا، ہمارے ہر نفع نقصان کا مالک اوپر والا ہے ماسی نفع تو ہمیں وہ دیتا ہے پر تو نقصان ہم اپنی غلطیوں سے اٹھاتے ہیں پر تو اوپر والا ہم سے اتنا پرہیز کرتا ہے کہ وہ ہمیں نقصان میں بھی نفع دے دیتا ہے پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ یہ فائدہ تو ہم نے اپنی ہمت سے حاصل کیا ہے پر تو یہ اوپر والے کی طرف سے ہی ہوتا ہے اسی طرح ماں کے پیٹ میں بھی وہی نئی جان پیدا کرتا ہے انسان سے نہیں بلکہ اگر آپ اوپر والے سے بچے دل سے مانگیں گے تو وہ آپ کو بہتر دے گا۔“ سنتوش نے بتایا۔

”پر تو بیٹا منیش کے تو کوئی سنیان تھی وہ سنتان باباجی کے کارن ہوئی تھی۔“ سندرہ کی ساس نے کہا۔

”یہ پردہ بھی میں جلد ہی گاؤں والوں کی آنکھوں سے ہٹاؤں گا۔“ سنتوش نے کسی خیال کے ساتھ کہا۔

”چنگر چر میں چلتی ہوں گھر میں روٹی ہانڈی کا

بھی کچھ کرتا ہے۔“ سندرہ کی ساس نے سنتوش کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور سندرہ اور اس کی ساس اپنے گھر کی طرف بڑھ گئیں جبکہ سنتوش اس غیبی بوڑھے کی جمپوڑی میں داخل ہو گیا۔

گھر پہنچتے پر سندرہ نے اپنا چولہا سنبھال لیا چولہے پر ہانڈی رکھنے کے بعد وہ روٹیاں پکانے لگی۔

”سندرہ بوٹے سے بات نہ کرنا آدمی رات کے سے باباجی کے پاس چلی جانا۔“ چارپائی پر بیٹھی اس کی ساس نے کہا۔

”اماں میرا من بہت گھبرا رہا ہے۔“ سندرہ نے اپنے دل کی کیفیت بیان کی۔

”کیوں رہی۔ تیرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔“ سندرہ کی ساس سخت لہجے میں بولی۔

”اس بوڑھے کی آنکھوں میں مجھے ہوس نظر آ رہی تھی اماں۔“ سندرہ نے ڈرتے ڈرتے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”اری..... نادان کچھ تو بھگوان کا خوف کر باباجی کو برا کہہ رہی ہے وہ تجھے ایسی بات پر جلا کر کھسک کر دیں گے۔“ سندرہ کی ساس یکدم بھڑک اٹھی۔

”نہیں اماں ہم لوگ یہی تو نہیں سمجھتے۔“ سنتوش کا کہنا ٹھیک ہے سنتان کا مالک تو اوپر والا ہے۔“ سندرہ دھکی لہجے میں بولی۔

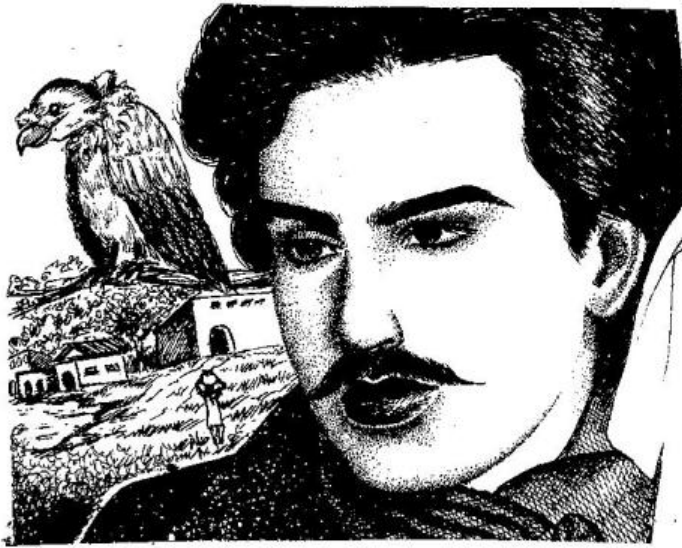
”تو پھر تیری کوکھ کیوں خالی ہے ہر مندر میں جا کے ہاتھ دیتی ہے میں مانگتی ہے پھر بھی تو بانجھ کی بانجھ ہے۔“ سندرہ کی ساس اسے طعنہ دیتے ہوئے بولی۔

”اماں اس میں بھی کوئی نہ کوئی بات ہوگی خدیجہ کہتی ہے اوپر والے کے ہر کام میں حکمت ہوتی ہے ہر چیز کا ایک سے ہوتا ہے اوپر والے کے کام میں دیر ہے اندھیر نہیں وہ گہرے اندھیرے کے بعد ایک خوب صورت اجالا پیدا کرتا ہے۔“ سندرہ نے کہا۔

یہ سن کر سندرہ کی ساس نے اپنا فیصلہ سنایا اور بے بس سندرہ خاموش ہو گئی۔

شام کو وہ خدیجہ سے ملنے گئی۔ ”کیا بات ہے

Dar Digest 123 May 2018



## بھلائی کا صلہ

گلاب خان سولنگی - نوشہرہ فیروز

پورے جسم پر لرزہ طاری تھا اور اندھیرے نے ہر سو اپنا راج قائم کر رکھا تھا کہ ایک نورانی صورت بزرگ اپنے ارد گرد سے بے خبر بیٹھے تھے کہ اتنے میں.....

رات کے گھٹاؤپ اندھیرے میں ختم لینے والی عجیب و غریب تھیرا گیزی اور حیرت انگیز کہانی

**ہمارے** گاؤں سے شہر 8 کلومیٹر دور تھا۔ ایک صحت و ڈگری ہونے کے باوجود نوکری بھی ہم سے نہیں ہوتی تھی مجبوراً دوسرے گاؤں والوں کی طرح میں شہر والی فیکٹری میں مزدوری کرتا تھا۔ لیکن ہماری رات رات کو شروع ہوتی تھی اس لئے سرشام ہی میں اس سے کوچ کر جاتا تھا۔ کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی تھی پبلک ٹرانسپورٹ کا نہ ہونا اور خطرناک جنگل۔ لیکن ہماری پہنٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہم غریب مزدور کسی جنگلی جانور یا ڈاکوؤں کی پرواہ کئے بغیر بلا ناغہ فیکٹری میں حاضری دیتے تھے جس سے گھر کا چولہا جلتا تھا۔ فیکٹری کے افراد تعداد میں تو ماشاء اللہ کثرت میں تھے لیکن کمانے کی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر تھی، بھائی بہنوں کی تو فوج تھی اوپر سے ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا بھی میں ہی تھا۔

سندری آج بڑی اداس نظر آ رہی ہو۔“ خدیجہ نے سندری کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”نہیں کچھ نہیں۔“ سندری نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔  
”ایسا کیسے ہو سکتا ہے میری سہیلی پریشان ہو اور مجھے پتہ ہی نہ چلے۔“ خدیجہ نے سندری کے گالوں میں چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔  
”بس خدیجہ کیا بتاؤں سستان کی کلپنا مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔“ سندری نے لگرمندانہ لہجے میں کہا۔  
”ارے تو اس میں لگ کر کرنے کی کیا ضرورت ہے اولاد تو تجھے تب ہی ملے گی ناں..... جب اس کا وقت ہوگا۔“ خدیجہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔  
”وہ وقت کب آئے گا۔“ سندری نے اکتائے ہوئے لہجے میں لفظ ”کب“ کو لہا کرتے ہوئے کہا۔  
”تجھے اتنی جلدی کیوں ہے اولاد کی۔“ خدیجہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔  
”مجھے چار سال ہو گئے ہیں میرا بیاہ ہوئے اور تو کہہ رہی ہے مجھے سستان کی کیوں چننا ہے..... میری ساس مجھے بانجھ پن کے طعنے دیتی رہتی ہے، پتی سیدھے منہ بات نہیں کرتا اور تو کہہ رہی ہے مجھے اولاد کی کیا جلدی ہے۔“ سندری نے غصے سے کہا۔  
”ارے..... ارے..... تم تو ناراض ہو گئی..... میں تو تمہیں صرف خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہی تھی۔“ خدیجہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔  
”تمہارے کہنے سے تو میں خوش ہو جاؤں گی پر تو میری ساس اور میرا پتی تو تب خوش ہوں گے ناں جب میرے سستان ہوگی۔“ سندری دھکی دل سے بولی۔  
”آج تو واقعی تیرے اندر سے لاوا پھٹ رہا ہے۔“ خدیجہ نے کہا۔  
”تھک آگئی ہوں میں اپنی ساس اور پتی سے..... اگر سستان میرے بس میں ہوتی تو.....“ سندری کہتے کہتے رو پڑی۔

”دیکھو سندری عورت ہو یا مرد، انسان ہو یا جانور..... آسراف صرف اللہ ہی کا ہوتا ہے اگر انسان اپنی سب امیدیں خواہشیں ہر چیز اللہ سے مانگے تو دنیا سے پریشانیوں بالکل ختم ہو جائیں گی کیونکہ وہ اللہ ہی ہے جو ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے، یہ نظام اللہ کا ہے کہ وہ انسان کی ضرورت انسان کے ذریعے ہی پوری کرتا ہے۔“ خدیجہ نے سندری کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔  
”پر تو میں تو مندروں، ماسوؤں کے پاس جاتی رہتی ہوں۔“ سندری نے بتایا۔  
”اللہ مندروں میں نہیں دل میں ہوتا ہے سندری۔“ خدیجہ نے بتایا۔  
”تو پھر تم لوگ مسجدوں میں کیوں جاتے ہو۔“ سندری نے پوچھا۔  
”تم نے بڑا اہم سوال پوچھا ہے سندری۔“ یہ کہتے ہوئے خدیجہ مسکرائی۔  
”تم لوگ..... مندروں میں کیوں جاتے ہو.....؟“  
”ہمارا بھگوان احر ہے ہم ان سے اپنی منتیں، موابیں مانگتے ہیں۔“ سندری نے بتایا۔  
”تم آسمانوں میں موجود اللہ کو مانتے ہو۔“ خدیجہ نے دوسرا سوال کیا۔  
”ہاں بالکل.....“ سندری نے تیزی سے جواب دیا۔  
”لیکن دنیا کے ہر دھرم ہر مذہب کی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ اللہ ایک ہے..... اس کی ذات واحد ہے اس کا دوسرا کوئی شریک نہیں ہاں اکثر لوگ اپنے دھرم مذہب یا زبان میں اس کا نام الگ سے لیتے ہیں لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ اس کی تعداد تین یا چار پانچ ہے، مختلف ناموں سے پکارنے سے اللہ کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوتا، تم لوگ، انسانوں کو، بتوں کو بھگوان مانتے ہو کیا یہ ٹھیک ہے۔“ (جاری ہے)



گر بیچویشن کے بعد تعلیمی سلسلہ رک گیا اور  
مزدوری کا سلسلہ چل پڑا۔ نوکری کے پیچھے کافی وقت  
ضائع کیا۔ پانچویں سرکار اخباروں میں نوکری کے اشتہار  
کیوں شائع کرتی ہے؟

مجھے تو اخباری نوکری تلاش کرنے میں شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور آخر کار تھک ہار کے شہر کی فیکٹری میں ڈپٹی ڈیپوٹر مل گئی۔ اس طرح وقتی طور پر میری ملائف سے پردہ و گاری کا بھوت فی الحال مل گیا۔

آٹھ کلومیٹر کا طویل پرخطر سفر پیدل ہی کاٹنا پڑتا تھا ویسے تو جنگل میں بے ضرر قسم کے جنگلی جانور پھرتے رہتے تھے لیکن رات کے سنائے میں بڑے سے بڑا پہلوان بھی یہاں سفر کرنے سے کتراتا تھا۔ ہماری شفٹ رات 8 سے صبح 8 بجے تک چلتی تھی، کبھی کبھار بجلی کی لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے آدمی رات کو ہی چھٹی مل جاتی تھی۔ میں شہر میں کسی دوست کے یہاں ٹھہرتا تھا اور کبھی کبھار مگر کی راہ لیتا تھا۔

میں بھی انسان ہوں ڈر تو لگتا تھا لیکن ہماری زندگی میں ڈر کدھر میں بیٹھ جانا ناممکن تھا۔ میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے جنگل سے گزر جاتا تھا۔ جنگل سے ہر سو جنگلی بھیڑیوں اور دیگر خطرناک جانوروں کی آوازیں سن کر ایک عجیب سا خوف اور ڈر ہمیں آگھیرتا تھا۔ موٹر سائیکل یا سائیکل خریدنے کا بجٹ بھی ہم افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا خاموشی سے دیہاڑی لگا رہا تھا۔

آج تو سارے شہر میں لال جھنڈے نظر آرہے تھے، ارے ہاں آج تو مارا دن منایا جا رہا تھا جسے لوگ مزدورڈے کہتے ہیں۔ یوم مزدور! ایک بہت بڑے جلے میں درباری قسم کے مزدور ایک سیاست دان صاحب کو گھیرے میں لئے نعرہ بازی کر رہے تھے۔ اور وہ موصوف ڈاؤن بڑے جوش سے تقریر فرما رہے تھے۔

”میرے مزدور ساقیو! میں آپ لوگوں کے لئے دودھ اداہ..... سواری پانی کی ندیاں بہا دوں گا۔ اب ہر مزدور کا بچہ اسکول جائے گا۔ افسر شاہی ختم اور مزدور راج شروع ہوگا۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ بھی ختم اور مہنگائی تو

ہماری حکومت نے ہی ختم کی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”واٹ اے جوک“ جسے سن کر پاس کھڑے ایک پولیس والے نے میرے قریب آ کر کہا۔ ”جاؤ میاں اپنا کام کرو، تمہیں یہ مذاق لگ رہا ہے۔“

میں کندھے اچکاتے ہوئے فیکٹری کی طرف چل پڑا۔ کچ تو یہ ہے کہ آج کے دن بھی ہم مزدوروں کو کھجی نہیں ملتی تو پھر یہ دکھاؤ کہ اس؟ صدیوں سے ہم مزدوروں کی حالت نہیں بدلی اور نہ ہی حالات، لگتا ہے ساری دنیا کے مزدور اپنی محرومیوں پر نہ جانے کب تک نوحہ خواں ہوتے رہیں گے؟ آخر حالات کب بہتر ہوں گے؟

ایک رات فیکسری سے جلدی چھٹی ہوئی۔ میں بیدل ہی بیدل گاؤں چلا آ رہا تھا۔ رات مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی، حسب معمول سڑک ویران تھی، چلتے چلتے میں ایک جگہ رک گیا۔ سڑک کی دائیں طرف والی جھاڑیاں بل رہی تھیں جبکہ ہوا تو رکی ہوئی تھی تو پھر یہ سرسراہٹ کیسی تھی۔

پہلے تو میں ڈر گیا لیکن پھر سوچا کہ ہو سکتا ہے کوئی  
 مصیبت میں ہو شاید میں اس کی مدد کر سکوں، ڈرتے  
 ڈرتے میں نے جھاڑیوں کا رخ کیا، مجھے قریب پا کر  
 جھاڑیوں میں چھپا ایک اڑوا اچکا میرے سامنے  
 نمودار ہو گیا۔ اف خدا یا اتنا بڑا اڑوا میں نے پوری  
 زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے شہر کے سینما گھر میں  
 Anaconda سیریز کی ساری موویز دیکھی ہوئی تھی  
 لیکن حقیقت میں اتنا بڑا اڑوا ہو سکتا ہے؟

میرا تو سر چمکا گیا، وہ غصے سے زبان نکال کر مجھے اپنا نوالہ بنانے کے لئے میری طرف تیزی سے پھڑپھڑاتا، پھر تو میں بے لگام گھوڑے کی طرح وہاں سے ہٹا گیا، کافی دیر تک وہ میرا تعاقب کرتا رہا، لیکن گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی وہ غائب ہو گیا، میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا، اب وہاں کوئی نہیں تھا تب میری سانسیں بحال ہوئیں۔ خوف کے مارے خاموشی سے آ کر میں اپنے بستر پر گر کر اور باقی رات اس آڈو سے

گئے بارے میں سوچتے ہوئی گزری۔

میراجہ پریش رکھ کافی بڑھا ہوا تھا، گاؤں کے حکیم صاحب نے مجھے دوائی دی اور آرام کرنے کو کہا لیکن رات قسمت میں آرام کہاں تھا؟ میں نے رات دوائی سے سب سے چھپائی مبادا کوئی میرا مذاق نہ اڑائے، میں امام صاحب سے ڈر کر تعویذ بھی لیا، پورا دن آرام پایا اور شام کو پھر کام پر چل نکلا۔

پہلے تو اتنا تو نہیں لگتا تھا کہیں رات اپنی آنکھوں سے اس بلا کو دیکھا تھا اس لئے پہلے سے محتاط ہو گیا تھا۔  
 غصا ہوا تو نہیں تھا البتہ ایک عدد مضبوط و ٹھنڈا ضرور اٹھایا  
 آج جھگ کانی پر سکون تھا میں خاموشی سے وہاں  
 گزر گیا۔

رمضان کی آمد آمد تھی، سب لوگ اس بابرکت  
ماہ کی تیاریوں میں مصروف تھے، آج ہماری ٹیلیزی کی  
لن دفتر آئی تھی، میں نے اس سے ملنے کی عرضی پیش  
کر دی تھی۔

وہ اسے سی کمرے میں مختصر لباس میں جیوں کر کسی پر  
نہاں تھا، اس کے آواز و شاید اس کے فریڈز انگریزی  
اس پہننے پہنے پلانے میں مصروف تھے، مجھے دیکھ کر سب  
لے اپنی سرگرمیاں ترک کر دیں اور سب مجھے سر سے پاؤں  
تک دیکھنے لگے۔ شاید مجھے کوئی اور مخلوق سمجھ رہے تھے۔ یا  
میری غریب تر تجربے کی تیاری کر رہے تھے۔

فیکٹری کی مالکن نے پہلے توہری جوتیوں پر نظر پائی اور اس کی مغرورانہ نظر میرے کپڑوں سے ہوتی تھی اس کے سامنے بڑے بڑے سے سچ موہاں پر ہی شاید کوئی کال آ رہی تھی۔ اس نے گھنٹہ بھر وہ کال بٹنی کی وہ سامنے والے سے زیادہ تر آکر بڑی میں بات کر رہی تھی۔ شاید مجھے اسی پڑھ سمجھ رہی تھی۔ لیکن میں تو بے خبر بیٹ تھا، وہ کسی امیر زادے سے ڈنر کے بارے میں بات کر رہی تھی اور مینوفکشن نہیں ہو رہا تھا۔ میں تو بے خبر کھڑے کھڑے۔ کپ گیا، کیسے بد تہذیب لوگ، آخر آخر میں اس نے کال کاٹ دی۔

”محترم XYZ آپ ہم سے کیوں ملنا چاہ

**بیل**

ایک مریض نے اپنے معالج سے کہا: ”ڈاکٹر صاحب میں ان دنوں کسی ایسی چیز کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں جس سے میری سستی دور ہو جائے۔ میں چاق و چوبند نظر آؤں اور میرا سر دھوتا ہوا خون کھولنے لگے۔ کیا کوئی ایسی چیز آپ میرے نسخے میں شامل کر سکتے ہیں؟“

ڈاکٹر نے سرائے بغیر نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ چیز میں نسخے میں نہیں بل میں شامل کروں گا۔“  
 (ہما نصیر - کراچی)

”ہے ہیں؟“

”سوری میم! امیرانام عزیز خان ہے اور.....“ اس نے میری بات کو درمیان میں ہی کاٹ دیا اور اکر کر بولی۔  
”منسو مشرا! میرے پاس ناٹم نہیں ہے، کام کی بات کرو۔“  
”وہی تو کہہ رہا تھا لیکن شاید وہ مجھے ضرور ہونے کا احساس دلا رہی تھی اور خود کو مانگن۔“

”مہم کل سے رمضان شروع ہو رہا ہے اور یہ پہنہ بڑا باہر کت ہے۔ میں دن میں روزے اور رات کو عبادت کرتا ہوں، میں چاہتا ہوں میری شفقت کی آئینہ میں کچھ نری کر دی جائے تاکہ میری عبادت میں خلل نہ پڑے تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔“

”اور کام میں خلل پڑے تو پڑے؟ دیکھو مسٹر جان! یہ ایک نجی فیکٹری ہے، یہاں کام کرو یا عبادت، ہوائس از یورس؟“

یہ سن کر میرا دماغ کھم گیا، یہ کیسی تہذیب پر و ان  
تہذیب رہی تھی، دین و دنیا سے عاری یہ سراسر ایک اسلامی  
ملک کے شہری ہیں اور مجھ سے یہ سلوک ایک سوالیہ نشان تھا؟  
ویسے ہمارے گاؤں اور قیثری کے درمیان اچھا  
خاصا خاصا فاصلہ تھا اور میرے ذہن میں رہتا تھا کہ جسے اللہ  
کھے اسے کون کچھے۔



## آسیب پازل

رشد نور۔ فیصل آباد

یہ حقیقت اور زعمام ہے کہ ہر جاندار ہی نہیں بلکہ نادیدہ مخلوق بھی اپنے مسکن کی حفاظت کے لئے اپنی جان لڑا دیتی ہے اور یہ کہاں تک حقیقت ہے کھانی پڑھ کر دیکھیں.....

ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لینے والی ڈراؤنی خوفناک کہانی

گھٹے کا سفر طے کرنے کے بعد اشتہار میں دیے گئے پتہ پر پہنچ گئی۔  
”جگہ تو یہی لگ رہی ہے“ سوئی اخبار کھولتے ہوئے ریل بڑ بڑائی۔  
”ہیلو میڈم“ وایج مین اس کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے بولا پار بہت خوب صورت تھا اور سلیقے سے سجایا گیا تھا۔

”بھتیجی اور تجرے بکالہ میر ڈسٹر کی خدمت ہے مناسب تنخواہ دی جائے گی۔“  
سوئی کی باچھیں اشتہار پڑھ کر خوشی سے کھل گئیں۔  
”چھ ماہ سے نوکری کی تلاش میں تھی سوا سے یہ پڑھ کر ایک امید کی کرن نظر آئی..... اگلے دن سوئی نے جلدی اٹھی ناشتہ کیا ادا کو بائے بائے ہوئی۔  
”کیونکہ اسے پارلر کی مالکہ سے ملنا تھا وہ آدھے

بھی جاؤ..... اللہ بھلا کرے گا۔“

اور میں نے بزرگ سے مصافحہ کیا اور واپسی کے لئے قدم اٹھانے لگا کہ پھر اچانک میرے دل میں آیا کہ میں بزرگ سے معلوم تو کروں کہ کیا انہوں نے بھی کہیں جانا ہے تو میں ان کی جگہ تک چھوڑ آؤں۔  
اور جب میں نے مڑ کر دیکھا تو بزرگ اپنی جگہ سے غائب تھے۔ اور پھر میں تو اچھے میں پڑ گیا کہ پلک جھپکتے ہی بزرگ گئے تو گئے کہاں۔

اور پھر جب دوسرے روز میں نے معلومات کی تو پتہ چلا کہ اس جگہ ایک بزرگ کی قبر ہے..... اس کے سوا کچھ اور نہیں..... اور لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ قبر جن صاحب کی ہے وہ اپنے وقت کے بہت پیچھے ہوئے تھے اور اب اندھیری رات میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

خیر کسی در کرنے میری بات فیکٹری کے مالک جو اس لڑکی کا باپ تھا اس تک پہنچا دی اس بھلے انسان نے دوسرے دن مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔

”عزیز سارے مزدور میرے دوست ہیں، مجھے پتا چلا کہ رات میں میری بیٹی نے آپ سے بدتمیزی کی ہے، جس کی میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں، اصل میں ہماری نئی نسل کو اسے بزرگوں کی روایات برقرار رکھنے میں کافی وقت لگے گا۔ آپ دن میں روزے رکھیں اور رات کو عبادت، میں نے ایک مہینہ کے لئے آپ کی چھٹی کر دی ہے۔ اب آپ عید کے بعد تشریف لائیے گا اور اپنا حساب کتاب کرنا۔“  
میں چونک کر بولا۔ ”لیکن کیوں سرجی!“

میں سمجھا شاید عید کے بعد وہ مجھے فیکٹری سے نکال دیں گے۔ لیکن وہ ہنس کر بولے۔ ”اسے میاں اچھے پتا ہے آپ گریجویٹ ہیں اس لئے عید کے بعد آپ لیبر یونین بلکہ فیکٹری کے میجر کے طور پر کام کریں گے، اب تو خوش ہیں ناں۔“ اور پھر میں صاحب کا شکریہ ادا کر کے گھر آ گیا۔



میں بلا در خوف روزانہ فیکٹری سے کام نہٹانے کے بعد گھر آ جایا کرتا تھا۔

وہ دوسری یا تیسری رات تھی، میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آ رہا تھا کہ میری نظر راستے سے ہٹ کر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی بزرگ ہیں جو کہ بیٹھے ہیں اور ویسے ہی میں روزانہ رات میں یہ ضرور محسوس کرتا تھا کہ ایک مخصوص جگہ پر کوئی بیٹھا ہوتا تھا۔ خیر میں مخصوص جگہ پر پہنچا تو آواز سنائی دی۔

”عزیز بیٹا ذرا ادھر آنا ایک صاحب کی مدد کرنی ہے۔“ اپنا نام سن کر میں چونک پڑا کہ اس اندھیری اور ملی جلی چاندنی رات..... کیا کوئی میرا جاننے والا ہے جو کہ میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔

اور میں جلدی جلدی مطلوبہ جگہ پر پہنچ گیا تو دیکھا کہ ایک کارکھڑی ہے اور اس کے قریب ایک امیر کبیر شخص اور پاس ہی ایک بزرگ کھڑے ہیں، بزرگ کی نظر جب مجھ پر پڑی تو بزرگ گویا ہوئے۔ ”عزیز بیٹا..... سیٹھ صاحب کی گاڑی رک گئی ہے اور تمہاری مدد کی ضرورت ہے..... آؤ ذرا دکھا لگا کر دیکھتے ہیں کہ شاید یہ اشارت ہو جائے۔“

اور پھر ہم تینوں نے مل کر جب گاڑی کو دکھا لگایا تو فوراً گاڑی اشارت ہو گئی۔ تو گاڑی والے صاحب بزرگ سے بولے۔ ”محترم بزرگ آپ کا بہت بہت شکر یہ میری مدد کرنے کا۔“

یہ سن کر بزرگ بولے۔ ”سیٹھ صاحب کر بھلا تو ہو بھلا..... کرو مہربانی تم اہل زمین پر اور خدا مہربان ہوگا عرش بریں پر، آپ جائیں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھا کریں۔“

اس کے بعد کاروالے صاحب نے بزرگ اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ شکر یہ ادا کیا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔  
اس کے بعد بزرگ مجھ سے مخاطب ہوئے۔  
”عزیز بیٹا..... بڑے لوگ اکثر اپنی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہیں..... لیکن یہ صاحب ایسے نہیں لگتے..... ان کے دل میں غریبوں کے لئے نرم گوشہ ہے۔ خیر اب تم

”WhoAreYou“ سوزی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک خوب صورت لڑکی اس سے مخاطب تھی۔  
 ”ہیلو.....“ اس کو غور دیتے ہوئے پیار سے بولی۔  
 ”آپ نے اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ ایک میٹر ڈریسر کی ضرورت ہے۔“ سوزی نے اخبار آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔  
 ”اچھا تو آج میٹر ڈریسر ہیں؟“ وہ چلتے ہوئے بولی تو سوزی بھی اس کے پیچھے ہوئی۔  
 آگے جا کر لڑکی ایک کرسی پر براجمان ہو گئی اور سوزی کو بھی ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کے لئے کہا۔  
 ”میرا نام ڈاکٹر خانی ہے اور میں اس پارلر کی مالک ہوں، آپ حیران کیوں ہو گئیں۔“ سوزی کے چہرے کو دیکھتی ہوئی خانی بولی۔  
 ”میں میں سوچ رہی ہوں کہ اگر آپ ڈاکٹر ہیں تو پینشن کے شے میں؟“ سوزی اپنی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔  
 خانی مسکرا کر بولی۔ ”ڈاکٹر بنانا مجھے میرے ابو کی خواہش تھی اور میری پسند پینشن بنانا تھا سو ابو کے لئے ڈاکٹر بن گئی اور پینشن لے لے۔“  
 ”سوزی Listen نوٹی میں تمہیں ایک بات کلیر کر دینا چاہتی ہوں یہاں تم سے پہلے بھی بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں لوگ کہتے ہیں کہ میں نے ایک پراسرار جگہ پر پارلر بنایا ہے یہاں پر روجوں آتماؤں کے سامنے ہیں، تم سے پہلے جو لڑکیاں یہاں کام کرتی تھیں یہ باتیں سن کر ایک دو دن میں لڑکی چھوڑ کر چلی گئیں اگر تم کو ان باتوں سے کوئی مسئلہ نہ ہو تو تم مجھے جاسکتی ہو۔“  
 اپنی بیماریاں کی دوا، گھر کا خرچ یہ سب سوچتے ہوئے سوزی ساٹ لہجے میں بولی۔  
 ”مجھے کوئی بات نہیں۔“  
 ”مگر تو تم کل سے جوائن کر سکتی ہو۔“ خانی سوزی کی طرف خانی قائل بڑھاتے ہوئے بولی۔  
 ”کوئے میم تو کل ملاقات ہوئی۔“ سوزی گھر کے لئے واپس مڑتے ہوئے بولی۔

”انشاء اللہ۔“ خانی اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے ہوئے بولی۔  
 اگلے روز سوزی جلدی اٹھی ناشتہ کیا اور پارلر کے لئے نکل پڑی۔  
 چوکیدار سوزی کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”میڈم آپ اتنی جلدی آگئیں۔“  
 سوزی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آج جاب کا پہلا دن ہے اور میں غلط امیریشن نہیں ڈالنا چاہتی تھی سو اس لئے جلدی آگئی۔“ سوزی آگے بڑھتے ہوئے اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور سامنے لگے بڑے سے شیشے میں خود کو دیکھنے لگی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سنہری بالوں والی لڑکی اندر آتی ہوئی دکھائی دی لڑکی نے آ کر اپنا بیگ کاؤنٹر پر رکھا اور سوزی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”میرا نام عریشہ ہے، میڈم خانی نے مجھے کل تمہارے بارے میں بتایا تھا وہ آج نہیں آ رہیں اس لئے آج سارا کام ہم دونوں کو ہی کرنا ہے، کچھ دیر میں کلائنٹ آئے والے ہیں تم جا کر تیار کی کرو۔“ اور خود کرسی پر براجمان ہو گئی۔  
 سوزی میک اپ کو ترتیب دے رہی تھی کہ اچانک اسے سردی محسوس ہونے لگی۔  
 ”اتنی گرمی میں مجھے سردی کیوں لگ رہی ہے؟“  
 زیر لب بڑبڑاتی۔  
 اچانک پارلر کی لائٹ بجھ گئی تو سوزی گھبرائے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دوڑی لیکن کاؤنٹر پر عریشہ نہ تھی سوزی گھبرائی ہوئی آواز میں ”عریشہ عریشہ۔“ نکلنے لگی۔  
 اور پھر چوکیدار سوزی کی آواز سن کر اندر آیا وہ سوزی کو دیکھائی ہوئی حالت میں دو کچرے بولا۔  
 ”کیا ہوا میم آپ اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہیں۔“  
 ”عریشہ کہاں ہے۔۔۔۔۔؟“ سوزی چوکیدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”کون عریشہ؟“ وایج مین نے حیرانی سے پوچھا۔  
 سوزی گھبراتے ہوئے۔ ”وہ جو یہاں کاؤنٹر پر تھی۔“

”یہاں پر تو آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔“ جو کاؤنٹر پر تھی۔  
 ”جوا بھی ابھی یہاں پر آئی تھی وہ کون تھی؟“ سوزی وایج مین کی طرف دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”یہاں پر تو آپ کے سوا کوئی نہیں آیا یا آپ کا دم وایج مین سوزی کو لاس دیتے ہوئے باہر چلا گیا۔“  
 ”یہ میرا دم کیسے ہو سکتا ہے۔“ سوزی خود سے ہم ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”وہ لڑکی اس کے سنہری بال یہ سب یہ میرا دم کیسے لاس ہے۔“ وہ ایک لباس سانس کھینچتے ہوئے بولی۔  
 کہ اچانک کاؤنٹر کی کرسی ہلنے لگی تو سوزی مزید لڑے ہوئی پھر ایک دم سارے پارلر میں خاموشی پڑی۔ سوزی نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو اسے ہر چیز کی نظر میں ڈوبی نظر آئی اس نے سامنے دیوار پر لگی گھڑی کی نظر دیکھا تو چون رہے تھے۔  
 ”شام کے چھ بج گئے ہیں یا یہ گھڑی خراب ہے۔“  
 لڑکی سے دوڑتی ہوئی باہر گیٹ کی طرف آئی تو باہر کا مین اس بات کا شہوت تھا کہ شام ڈھل چکی ہے۔  
 ”کیا شام کے چھ بج چکے ہیں۔“ سوزی گیٹ سے وایج مین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔  
 ”جی سم۔“ وایج مین ایک نظر اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔  
 ”شام کے چھ بج چکے ہیں اور میں تھوڑی دیر پہلے ہی ہوں۔ پارلر میں کوئی کلائنٹ بھی نہیں آیا۔“ سوزی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔  
 وایج مین سوزی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آئینی پارلر ہے اس لئے بہت کم لوگ آتے ہیں۔“ تو سوزی ماتھے پر ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔  
 ”خانی میڈم نے تو کہا تھا کہ انہیں ڈیوٹی پر دھیان دے دو جن کو کہیں اور نہ ملنے دیتا۔“

ڈاکٹر نرمل حکیم کو ماہرین طب ہدایات لکھی گئی مفید کتاب

**شوگر گریڈ (ذیابیطیس)**

قیمت - 100 روپے

اس کتاب میں شوگر کیسے اور کیوں ہوتی ہے، شوگر صحت کے لئے سب سے سنگین خطرہ، ایکسپائر استعمال نہیں کرنی چاہئیں، بڑھتی عمر، شوگر کیا ہے، ٹائپ دن شوگر، ٹائپ ٹو شوگر، بلڈ پریشر کا خطرہ، ہائی بلڈ شوگر کے مریضوں کی سرجری خطرناک ہو سکتی ہے، شوگر کی پیچیدگیوں سے کیسے نمٹنا چاہئے، احتیاطی تدابیر، شوگر اور ڈپریشن کا تعلق، افسردہ اداس مائیں اور بچے، نارمل بلڈ شوگر کیا ہے، جانچ کب کروائیں، شوگر بڑھنے کے اسباب اور تدارک، موٹے افراد کا خوف، سگریٹ نوشی، وجوہات، شوگر سے محفوظ رہنے والی خواتین، انفیکشن، بچوں پر ماؤں کا اثر، پیشاب کی نالی میں انفیکشن، ذیابیطیس کے مریضوں کے لئے خطرناک بیماریاں، ڈپریشن، شوگر کی علامات اور اس سے بچاؤ کے طریقے، دیسی وڈاکٹری نسخے پڑھئے اس کتاب میں۔

حکیم غلام مصطفیٰ

دعابک کارنر ۵ فیصل آباد





## آسیب کا سایہ

ڈاکٹر رانا عامر شہزاد - ننگا نہ صاحب

نوجوان کی آواز سنائی دی لاشوں کی حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہے، آنکھیں سرے سے غائب، پیٹ سے آنتیں باہر نکلی ہوئی اور زیادہ تر اعضا غائب اور ایسی صورت میں.....

خوف و دہشت کے سمندر میں غوطہ زن..... ناقابل فراموش دہشت ناک..... کہانی

ہیں آج جو واقعات آپ کو سنانے جا رہا ہوں اسے ساتھ تقریباً پچیس سال پہلے پیش آیا، ان دنوں ایک چھوٹے سے شہر میں بطور پولیس آفیسر فرائض انجام دے رہا تھا۔ میری زندگی بہت خوشگوار گزر رہی تھی مجھے چہل، جنات اور بدروحوں وغیرہ کے متعلق ایمان پڑھنے اور ڈراؤنی فلمیں دیکھنے کا بے حد شوق اور دین اسلام کے مطابق جنات کی موجودگی پر تو میرا پکا ایمان تھا مگر اس بات پر مجھے قطعاً یقین نہیں تھا کہ جنات وغیرہ لوگوں کے جسموں پر قبضہ کر لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر انہی دنوں ڈپٹی صاحب نے مجھے اپنے آفس میں طلب کیا اور ایک ایسی اسائنمنٹ تفویض کی جس نے مجھے جنات کی کہانیوں میں موجود حرکات پر یقین کرنے پر مجبور کر دیا۔ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”مسٹر خالد آپ

واج میں مسکرا کر بولا۔ ”اگر آپ گھر جانا چاہیں تو جاسکتی ہیں۔“

سوزی نے پارلر کے اندر سے بیگ لیا اور گھر کے لئے روانہ ہوئی۔

”لوگ تو کہتے ہیں کہ یہ جگہ آنتی ہی ہے میرا وقت کیسے گزر گیا وہ لڑکی عریضہ آج صبح کا پہلا دن میرے لئے کتنا برا گزرا، ہوسکتا ہے یہ میرا دم ہوا چلو خیر صبح تو ملی۔“ سوزی بالوں میں کلپ لگاتے ہوئے خود سے ہنسنا شروع ہوئی۔

اسکے دن سوزی جلدی ابھی ناشتہ کیا اور پارلر چلی گئی۔

”ویکم مس سوزی“ خانی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی ہوئی بولی۔

”Thankyou میڈم۔“ سوزی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”سوزی سوزی کل آپ کا پہلا دن تھا اور میں پارلر نہیں آئی۔“ خانی نے بولا۔

سوزی اپنا بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

”یہ سبھی کل پارلر میں کوئی نہیں آیا تھا۔“

خانی اخبار اٹھاتے ہوئے۔ ”پرانج بہت سے لوگ آنے والے ہیں۔“

پھر کچھ دیر بعد پارلر میں جھوم لگ گیا، خانی اور سوزی نے مل کر سب کو تیار کیا رات کے آٹھ بجے کے قریب وہ فری ہوئیں۔

خانی کو کام کے سلسلے میں جلدی گھر جانا پڑا اور پھر معمول کے مطابق سوزی چینیج روم میں پیش در لیاں تبدیل کرنے گئی اور جب وہ چینیج روم سے باہر آئی تو اسے اپنے پیرو پر کچھ گیلا گیسٹ سائیکس ہوا وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار چیخ اٹھی اس کے پیروں سے لٹ پڑا تھا۔

”کھا چاک پورے پارلر میں ایک عجیب و غریب بو پھیل گئی۔“

سوزی کا اس بو کی وجہ سے دم گھٹ رہا تھا۔ ”یا اللہ یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ پھر پارلر کی لائٹ بند ہو گئی سوزی چیخ جاری رکھی کہ اس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ



ہمارے ڈپارٹمنٹ کے ایک بہترین اور قابل پولیس آفیسر ہیں، آپ نے پہلے ہی اپنے جملہ فرائض احسن طریقوں سے سرانجام دیئے ہیں لیکن ان دنوں ہم ایک بہت کمپیور سسٹم سے دوچار ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے بہت دور پریت مگر نامی ایک چھوٹا سا گاؤں واقع ہے۔ جہاں پچھلے دو مہینوں میں سات نوجوان لڑکوں کی پراسرار ہلاکتیں ہو چکی ہیں اور مرنے والوں کی لاشیں انتہائی خطرناک حالت میں ملتی ہیں جس کی وجہ سے نہ صرف اہل پریت مگر بلکہ ارد گرد کے گاؤں کے لوگوں میں انتہائی تشویش پائی جاتی ہے اور پورا علاقہ نہایت افسردہ اور خوف و ہراس میں مبتلا ہے۔ وہاں کی پولیس تاحال اس معمر کو سلجھانے اور قاتلوں کو پکڑنے سے محذور دکھائی دے رہی ہے جس کی وجہ سے ہم سب پر ہائی کمان کا زبردست پریشر ہے۔

لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ اسائنمنٹ آپ کو سونپی جائے اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ پہلی فرصت میں پریت مگر کے لئے روانہ ہو جائیں گے اور جلد از جلد اس اہم اسائنمنٹ کو کامیابی سے مکمل کر کے ہمارے اعتماد میں اور اضافہ کریں گے میری تمام مدد اور دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔“

میں نے فوراً حاضری بھرنی اور جلدی سے مگر روانہ ہوا۔ اور ضروری سامان باندھ کر بذریعہ ٹرین پریت مگر روانہ ہو گیا۔ سات گھنٹے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد آخر میں پریت مگر کے چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر اترا اور ایک تاکہ پکڑ کر گاؤں کی جانب گامزن ہو گیا پریت مگر نام کی طرح بہت خوب صورت گاؤں تھا۔ ہرے بھرے کھیت، کھیتوں میں گلے ٹیوب ویلز اور گاؤں کا کچا راستہ آنکھوں کو بہت بھلا لگا رہا تھا۔ مگر افسوس کہ اتنے خوب صورت گاؤں کو کسی کی نظر لگ گئی تھی کہ گاؤں کا ہر باشندہ انتہائی پریشان اور خوفزدہ دکھائی دے رہا تھا۔

جلد ہی میں تھانے کی عمارت کے اندر موجود تھا۔ تھانے کو ایک ویرانہ کہنا ہی مناسب ہوگا عمارت

بہت پرانی اور بوسیدہ ہو چکی تھی محض میں پتیلی کا بہت بڑا اور گھٹا درخت موجود تھا جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور تھانہ چار دیواری اور تمام بنیادی سہولیات سے محروم تھا، تھانے میں تین سپاہی موجود تھے جن سے میں نے اپنا رسمی سا تعارف کرایا اور تھوڑی ہی دیر میں وہ مجھ سے مل گئے۔

تھانے کے اندر مناسب رہائش کی عدم دستیابی کے بعد مجھے میرے عملے کی مدد سے گاؤں میں ایک چھوٹا سا خوب صورت کمرہ رہائش کے لئے رات ہونے سے پہلے ہی بچھل گیا۔ میرا باقی اسٹاف مقامی ہونے کی وجہ سے مجھے اکیلے ہی رہائش رکھنا پڑی۔

نماز عشاء کے بعد ہم سب نے مل کر گاؤں میں ہونے والے واقعات پر تفصیلی گفتگو کی تھی مجھے شدید سپاہی سے معلوم ہوا کہ شروع سے ہی پریت مگر بہت پر امن گاؤں تھا۔ یہاں کے تمام باشندے بہت اچھے کردار کے حامل ہیں کسی سے کسی کی کوئی دشمنی نہیں، پھر بھی پچھلے دو مہینوں سے گاؤں میں موجود چوہدری رفاقت کی پرانی حویلی سے نوجوانوں کی لاشیں مل رہی ہیں۔

اور لاشوں کی حالت انتہائی خطرناک ہوتی ہیں، آکھیں سرے سے غائب، پیٹ سے آنتیں باہر نکلی ہوئی کسی کا کوئی اعضا غائب اور رنگ بالکل نیلا ہوتا ہے۔“

میں غصے سے بولا۔ ”تو آپ سب کس مرض کی دوا ہیں اتنے بے گناہ لوگوں کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور قاتل آج تک آزاد پھر رہے ہیں!“

مجھے دوسرا سپاہی انور بولا۔ ”صاحب جی! ہم نے گاؤں والوں سے مل کر قاتل کو پکڑنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی ہیں۔ چوہدری صاحب بھی ہمیں ہر طرح سے مدد فراہم کرتے رہے مگر قاتل اتنا ہوشیار ہے کہ کسی قسم کا کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا اور گاؤں والوں کا کہنا ہے کہ شروع سے ہی حویلی پر جنات کا سایہ ہے اس لئے یہ کام جنت کا ہی ہے۔“

میں نے غصے سے انور کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”بکواس کرتے ہیں یہ جاہل لوگ اس جدید دور کی بھی پرانی بوسیدہ باتوں پر یقین رکھتے ہیں افسوس کیا یہ لوگوں پر۔“

اگلے ہی دن میں سپاہیوں کے ہمراہ حویلی میں گیا تاکہ قاتلوں کو پکڑنے کے لئے کوئی لائحہ عمل بنائیں۔ مگر خلاف توقع میرے تینوں سپاہیوں نے حویلی کے اندر جانے سے انکار کر دیا وہ بری طرح خوف میں مبتلا ہو چکے تھے۔ میرے پر زور اصرار کے باوجود وہ حویلی کے اندر جانے سے انکاری رہے۔ یہاں تک کہ شید بولا۔

”صاحب جی! ہم سب نوکری چھوڑنے کو تیار ہو چکے ہیں حویلی کے اندر کسی صورت نہیں جائیں گے کیونکہ حویلی کے اندر جو بھی گیا پھر واپس نہ آئے گا۔“

میں ان کو کوستا ہوا اکیلا ہی حویلی کے اندر داخل کیا۔ حویلی بہت بڑی تھی انتہائی پرانی ہونے کے باوجود بھی یہ تین منزلہ عمارت بہت خوب صورت لگ رہی تھی محض میں موجود تالاب بہت خوب صورت نظارہ پیش کر رہا تھا۔ جگہ جگہ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں میں نے حویلی کا مکمل معائنہ کیا جس میں بہت سارے کمرے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ سب بوسیدہ دکھائے ہوئے تھے مگر دوسری منزل پر ایک بڑا کمرہ لاک کاٹالے سے محسوس ہو رہا تھا جیسے کافی عرصے سے یہ کمرہ بند ہو۔

مجھے اس بند کمرے کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ پھر واپسی پر چوہدری رفاقت کی کوٹھی پر پہنچا جو کسی ضروری کام کی وجہ سے پچھلے دو دنوں سے گاؤں میں موجود نہ تھا۔

اس لئے میں نے اس سے ملنا ضروری سمجھا کہ اگر روایتی مزید آگے بڑھائی جاسکے۔ گاؤں والوں نے نظروں میں چوہدری کی بہت عزت تھی اور بقول ان چوہدری بہت نیک اور معزز انسان تھا مگر میری نظر ان وہ اچھا انسان نہ تھا اور میرا دل کہتا تھا کہ ان بات میں چوہدری رفاقت کا ہاتھ ضرور شامل ہے۔

پیشہ ورانہ طور پر چوہدری سے ملاقات کے دوران میں نے کچھ ایسی باتیں نوٹ کیں جس سے میرا شک چوہدری تک جانا لازم تھا۔

چوہدری سے ملاقات خوشگوار ماحول میں ہوئی اور چوہدری نے مجھ سے کہا۔ ”انسپکٹر صاحب! ہمارے گاؤں کو نجانے کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ اچھے اور پندار ہیں اور میں بھی گاؤں والوں کو اپنی فیملی کی طرح پیار کرتا ہوں اس لئے انسپکٹر صاحب میں ہر طرح سے آپ کی مدد کرنے کو تیار ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جلد از جلد قاتلوں کو کبھی فر کر داریک پہنچانے کے لئے ہر ممکن اقدامات کیجئے اور ہمارے گاؤں کو اس آفت سے بچانے میں ہماری مدد کیجئے۔“

میں نے چوہدری کو بتایا کہ ”میں آج آپ کی پرانی حویلی میں گیا تھا۔ تاکہ مکمل معائنہ کر سکوں وہاں دوسری منزل پر ایک کمرہ لاک ہے اسے تو کھولنے ہو سکتا ہے اس کمرے سے کوئی سراغ مل جائے۔“

تو چوہدری نے جواب دیا۔ ”انسپکٹر صاحب! یہ واقعات تو پچھلے دو مہینوں سے شروع ہوئے ہیں اور یہ کمرہ تو کافی عرصہ سے بند ہے ہمارے آؤ اجداد کہتے تھے اس کمرے میں آسیب موجود ہے، وہاں سے عجیب و غریب آوازیں آتی تھیں اسی وجہ سے ہم نے وہ حویلی چھوڑی تھی اور آج تک اسی خوف کی وجہ سے ہم نے وہ دروازہ نہیں کھولا۔

میرے بہت اصرار پر بھی چوہدری کمرہ کھولنے کے لئے آمادہ نہ ہوا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”اگر میں یہ دروازہ کھول دوں تو میرے خاندان پر کوئی ناگہانی آفت آنے کا خطرہ ہے لہذا اس کو کھولنا میرے لئے ممکن نہیں اور ویسے بھی اس دروازے سے گاؤں میں ہونے والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں۔

ظاہری طور پر تو چوہدری اچھا انسان نظر آ رہا تھا مگر میری چھٹی حس مجھے بتا رہی تھی کہ چوہدری ہر حال میں ان واقعات میں ملوث ہے ہو سکتا ہے کہ چوہدری کی مرنے والوں سے دشمنی ہو اور وہ آسیب کی آڑ میں ان کو

ختم کروادیتا ہو۔ مگر خوش ثبوت اور شہاد کے بغیر میں اس با اثر چوہدری کے خلاف کچھ بھی کرنے سے قاصر تھا اور پھر سے گاؤں والے بھی چوہدری پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ ہفتے کے دن انہی میں تھا نے میں پہنچا ہی تھا کہ شیدا گھبرا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”صاحب جی! غضب ہو گیا آج پھر ایک لاش جو بلی میں ملی ہے۔“

پھر میں فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا اور لاش دیکھ کر میرے حواس کم ہونے لگے مرنے والے کی آنکھیں غائب تھیں، پیٹ بہت بری طرح زخمی تھا، دایاں بازو اور ایک پاؤں غائب تھا۔ اور رنگ مکمل طور پر نیلا ہو چکا تھا جیسے نیلی سیاہی لاش پر ڈال دی گئی ہو۔ سارا گاؤں وہاں جمع ہو چکا تھا۔ سب سب سے ڈرے ہوئے تھے مرنے والے کے گھر والے غم سے ٹھہرا ہو رہے تھے۔ موقع پر چوہدری بھی پہنچ گیا جو خوفزدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا اور آتے ہی بولا۔ ”انسپکٹر صاحب خدا کے لئے کچھ کریں اور نفری طلب کیجئے۔“

آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ کدھر ہے آپ کا قانون جو اس قدر معذور ہو چکا ہے کہ ہمارے تحفظ سے آنکھیں چرا رہا ہے۔“

ضروری کارروائی کے بعد لاش کو سپرد خاک کر دیا گیا پھر میں نے گاؤں کی میٹنگ بلائی اور سب گاؤں والوں کو اس بات پر متفق کیا کہ جب تک قاتل قانون کے شکنجے میں نہیں آ جاتا تب تک سب مل کر بالخصوص حویلی کے ارد گرد اور بالعموم گاؤں کے چاروں اطراف پہرہ دیں گے۔

پھر گاؤں والے باری باری پہرہ دینے لگے اور میں بھی حویلی پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا جب تک پہرہ لگا رہا تب تک گاؤں میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا اور اسی لئے لوگ میری بہادری کو سراہتے ہوئے میری تعریفیں کرنے لگے مگر مجھے صرف اپنے کام سے مطلب تھا اور میں جلد از جلد یہ کام مکمل کرنا چاہتا تھا۔

عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں تھا نے واپس جا رہا تھا کہ راستے میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے مجھے ایک

خط تھما دیا اور بولی۔ ”صاحب جی! خط پڑھنے کے بعد جواب ضرور لکھ دیجئے گا اور میں کل اسی وقت اسی جگہ لوگوں کی نظروں سے بچ کر آپ سے جوابی خط لے جاؤں گی۔“ اور جاتے ہوئے بولی۔ ”انسپکٹر جی! خدا کیلئے ہی پڑھئے گا۔“ اور ہنسی ہوئی چلی گئی۔

میں تھا نے جا کر اب تک ہونے والی ساری کارکردگی لکھنے لگا تاکہ اسے ہیڈ آفس بھیج سکوں زیادہ کام کی وجہ سے خط پڑھنا میں بھول ہی گیا۔

نماز عشا کے بعد اپنے کمرے میں جا کر مجھے خط کا خیال آیا تو میں نے فوراً اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا جس کی تحریر کچھ یوں تھی۔

خالد السلام علیکم

جب سے آپ ہمارے گاؤں آئے ہیں، میں آپ کی بہادری، عقل مندی اور اچھی عادات کی وجہ سے دل سے آپ کی عزت کرنے لگی ہوں۔ ساری ساری رات مجھے نیند نہیں آتی اور میں آپ کو یاد کرتی رہتی ہوں، مجھے لگتا ہے جیسے آپ سے پیار کرنے لگی ہوں، میرے پاس اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے مگر مجھے صرف آپ کی محبت کی ضرورت ہے لہذا براہ مہربانی میری محبت کو قبول کر کے خدمت کا موقع دیں۔ پوری زندگی آپ کی باندی بن کر رہوں گی۔

والسلام

صرف آپ کی

سونیا رافقت

میں نے خط پڑھتے ہی سوچا ابھی ایک مصیبت ٹپ ٹپ نہیں اور دوسری آنے کو تیار ہے۔ ویسے بھی ان دنوں مجھے پیار وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں پیار وغیرہ کو صرف ڈرامہ سمجھتا تھا اور گاؤں کے لوگ میری بہت عزت کرتے تھے اس لئے میں اپنے لئے کوئی مسئلہ کھرا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لئے میں نے خط کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

اور اگلے دن بوڑھی عورت سے کہہ دیا۔ ”اپنی مالکن سے کہو کہ میں پیار و محبت پر یقین نہیں رکھتا اس

المستقبل میں مجھے کوئی خط نہ لکھیں۔“

☆.....☆.....☆

ہم سب نے مل کر پورا ایک مہینہ سخت پہرہ دیا تو لوں میں کوئی بھی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا جس کی وجہ سے مجھے یقین ہو گیا کہ قاتل جو بھی ہے اس کا تعلق اسی گاؤں سے ہے کیونکہ پہرے میں ہم نے ہر طرف کڑی نگرانی ہوئی تھی رفتہ رفتہ پہرے کو نرم کر دیا گیا ویسے بھی رات کے وقت کے ساتھ لوگوں کے دلوں سے بھی کچھ سخت کم ہونے لگی تھی ابھی تو ڈرے ہی دن گزرے تھے لہذا ایک اور لاش حویلی کے تالاب سے ملی جس کی حالت سے بھی زیادہ خوفناک اور دل دہلا دینے والی تھی۔

میں سخت حیران ہوا کہ تقریباً ڈیڑھ مہینے میں رات کا پہرہ کوئی مسئلہ نہیں ہوا مگر جیسے ہی توہوڑی نری ہوئی پھر چالاک قاتل نے گھناؤنا کام کر دکھایا اب تو سو فیصد یقین ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ چوہدری ہی روا رہا ہے کیونکہ پہرے میں کسی کی کروانے میں چوہدری پیش پیش تھا۔ پورے گاؤں میں جیسے صف بچھ گئی ہو ہر شخص نہایت افسردہ نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا لوگ جیسے ہنسا بھول گئے ہوں۔ انہوں اطراف سناٹا چھا گیا تھا ہر کسی کو اپنی جان کی فکر رہی تھی کہ نہ جانے کب اس کی باری آ جائے اور کبھی بھی جب کسی گاؤں میں درجن کے قریب لوگ ان لڑکے انتہائی سفاکی اور بے دردی سے قتل کر دیئے جائیں وہاں خوف نہ ہو تو کیا ہوگا؟

نماز ظہر کے بعد میں امرودوں کے باغ میں گزر رہا تھا کہ اچانک چوہدری کی اکلوتی بیٹی سونیا مجھے سامنے آ گئی آج پہلی بار میں نے اسے استے سے دیکھا تھا وہ انتہائی خوب صورت تھی میں ابھی اسے اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ انداز خوشی سے بولی۔

”انسپکٹر صاحب! میں نے آپ کا کیا قصور کیا میں تو آپ کی راہوں میں ٹپکیں بچھائے رہتی ہوں آپ ہیں کہ مجھ سے نظریں ہی نہیں ملاتے۔ خدا کے لئے غلام نہ بنئے کچھ میرا بھی خیال کریں۔“

میں نے غصے سے سونیا کو سمجھایا کہ گاؤں میں لوگوں کے گھر اجڑ رہے ہیں لوگ وحشت کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور ہمیں اس نازک گھڑی میں شوق سمجھ رہا ہے جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے میرا کام کرنے دو اور ویسے بھی یہ پیار وغیرہ سب ڈرامہ بازی ہے بس دو دن کا بخار ہے جلد ہی اتر جائے گا۔“

میری باتیں سن کر وہ رودی اور بولی۔ ”خدا گواہ ہے کہ گاؤں میں ہونے والے واقعات سے میں خود بھی بہت پریشان ہوں، مرنے والے سب میرے بھائیوں جیسے ہیں مگر یہ کم بخت دل کو بھلا کون سمجھائے۔“ اس کا یہ انداز بیان میرے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا مگر میں اسے وہیں چھوڑ کر تھا نے بچھ گیا۔

رات کو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی میں سوچ رہا تھا کہ گاؤں میں جو قیامت مفری برپا ہوئی ہے اس نے کتنے گھروں کے چارخ گل کر دیئے ہیں آخر لوگوں کا کیا قصور ہے؟ جتنے بھی لوگ مارے گئے تھا نے میں ان کا کوئی بھی ریکارڈ نہ موجود نہ تھا وہ سب اچھے انسان تھے پھر انہیں اتنی بے دردی سے کیوں قتل کر دیا گیا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب سوچ گئی کہ کیوں نہ میں کسی رات اکیلا حویلی میں جاؤں اور بند کر کے کوکھولوں، شاید مجھے کوئی سراغ مل سکے۔ کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ چوہدری کا ان ہلاکتوں میں ضرور کوئی کردار ہے پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگی اور میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دن تیزی سے گزرتے رہے مگر ہر ممکن اقدامات کے باوجود قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

چوہدری نے حویلی کو مکمل طور پر سیل کر دیا تھا اس لئے اب کوئی بھی حویلی میں نہیں جاسکتا تھا۔ میں بھی بار بار کوششوں کے باوجود بند کر کے تک پہنچنے میں ابھی تک ناکام تھا۔

تقریباً آٹھ دن بعد حویلی کے تالاب سے ایک اور لاش ملی اور پورے علاقے میں افراتفری پھیل گئی اوز



ہر طرف لوگوں کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔ اخبارات اور ٹی وی پر میڈیا پولیس کی کارکردگی کے خلاف زہرا گل رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب بھی ان حالات میں سخت پریشان تھے ان پر سنسز حکام کا سخت پریشر تھا مگر پھر بھی انہوں نے مجھ پر اعتماد جاری رکھا اور میرے کہنے پر حید نفری پریت نگر بھجوا دی مگر کچھ حاصل نہ ہو رہا تھا۔

میری سخت جدوجہد اور ہر ممکن اقدامات پر اہل پریت نگر بھی مجھے عزت کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور سونیا بھی مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھی انہی دنوں میں بھی دل سے مجبور ہو گیا اور تیزی سے سونیا کی طرف مائل ہونے لگا اور دھیرے دھیرے ہماری انتہائی خفیہ ملاقاتوں نے محبت کا روپ دھار لیا ہماری محبت خالص اور پاکیزہ تھی مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگے اور اس تڑپ کے باوجود بھی میرے فرائض میں کوئی کوتاہی نہ آئی اور میں مسلسل اپنے کام پر مکمل توجہ دے رہا تھا۔

میرے عملے نے انتہائی جانفشانی سے کام کیا اور کافی حد تک مختلف پیشہ ورانہ مہارتوں کی مدد سے ہم نے ان واقعات پر قابو پایا مگر جب تک قاتلوں کا سراغ نہ ملتا ہم کسی صورت چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ ایک دن میں تھانے میں پرائیمری رپورٹ لکھنے میں مصروف تھا کہ سونیا نے مجھے کسی نوکرانی کے ہاتھ خط بھیجا جس میں اس نے لکھا تھا۔

مسفر خالد السلام علیہ!

آج میں آپ کی محبت کا امتحان لیتا چاہتی ہوں اگر آپ پورا اترے تو مجھے یقین ہو جائے گا کہ آپ بھی مجھ سے میری طرح سچی محبت کرتے ہیں اگر ناکام ہوئے تو آج سے ہماری محبت ختم لہذا آج آپ کو مجھے حویلی میں ملے آنا ہوگا اور وہ بھی رات کو اور ویسے بھی گاؤں میں رونا ہونے والے واقعات کا حویلی سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ کچھ خاص لوگ میرے ابو کو پھنسانے کے لئے ڈرامہ رچا رہے ہیں اب گاؤں میں خفیہ ملاقاتیں کرنا کافی دشوار ہو رہا ہے اسی لئے ہمیں

اب حویلی میں ہی ملنا چاہئے تاکہ ہم بلا خوف و خطر ملنے کی سہری ملاقاتوں سے لطف اندوز ہو سکیں آخر تک ہم جوانی کی تڑپ کو جسموں میں قید رکھیں؟ امید ہے آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے مجھے پورا یقین ہے کہ آپ آج رات حویلی میں ضرور آئیں گے مگر یاد رہے آپ نہ آئے تو پوری زندگی میرا چہرہ دیکھنے سے محروم رہیں گے۔ والسلام۔

صرف آپ کی سونیا

پہلے تو میں سونیا کی اس حرکت اور خواہش پر حیران ہوا مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر حویلی جانے کا ارادہ کیا اور ویسے بھی میں حویلی میں جا کر بندہ کھولنا چاہتا تھا تاکہ میرا کمرے والا سنسن دور ہو۔

میں نے سونیا کی بات مان لی اور خط میں لکھ دیا کہ میں اپنی جان کو ملنے آج رات حویلی میں ضرور آؤں گا۔

رات کے 11 بجے میں اپنے کمرے سے نکلا اور بہت احتیاط سے حویلی کی جانب چل پڑا، گرمی بہت زیادہ تھی ہر طرف ہوکا عالم تھا حویلی گاؤں سے ذرا باہر بنی ہوئی تھی راستے میں بہت بڑا قبرستان تھا جس کے قریب سے گزرتے وقت دل ڈر سا خوف محسوس کر رہا تھا مگر ایک تو محبوب سے ملنے کی خواہش مکر دوسرا کمرے کا راز جاننا میرے لئے بہت بڑی بات تھی۔

حویلی پر پہنچتے ہی سونیا نے مین گیٹ پر میرا پر تپاک استقبال کیا اور مجھے بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی اور نہایت پیار اور شوشی سے بولی۔ ”جلدی سے اندر چلئے کوئی دیکھ نہ لے۔“ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ حویلی کے ارد گرد کوئی چہرے دار موجود نہیں سونیا صورتحال کو بھانپتے ہوئے بولی۔ ”جناب بے فکر رہئے آج کوئی چہرے دار نہیں آیا۔“ میں فوراً بولا۔ ”کیوں؟“

تو وہ میرے بالکل قریب آ کر بولی۔ ”کیونکہ آج ہمارے حقیقی ملن کی رات ہے اس لئے!“ اور مجھے نہایت پیار سے حویلی کی دوسری منزل پر موجود اسی بند کمرے کے دروازے پر لے گئی اور بند کمرے کا نالا

## اسماء الحسنی۔۔۔ کامیابی کا راستہ

ہمارا ہر عمل دنیا کے ہر  
پیشانیوں سے چھٹکارہ  
کونے میں اثر کرتا ہے

شادی کرنی ہو یا رکوانی ہو	جادو چلانا ہو یا ختم کرنا ہو
شوہر یا بیوی کی اصلاح	اولاد کا نہ ہو یا ہو کر مر جانا
گھریلو ناچاقی	کاروباری بندش
جنات کا سایہ	دیگر مسائل

**سید فرمان شاہ** کا پیغام جو لوگ سوچتے رہتے ہیں۔  
وہ ہمیشہ دیکھی رہتے ہیں پلک جھپکنے سے پہلے کام علم جو نگڑے کام بناتے

سراں میں بھوسہ کی آنکھ کا تار بہن کتنی ہے ہر کام 100% رازداری کے ساتھ  
کلام الہی سے ہر پریشانی کا حل پہلے تو بیز سے آجکی اجڑی ہوئی زندگی  
میں بہار ایک فون کال پر آپ کے مسائل کا حل ایک فون کال پر

غرض کوئی بھی جائز خواہش ہے تو پوری ہوگی انشاء اللہ

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آرزو مانجیے  
ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیوں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔  
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ انکس کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں غل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

اچھرہ سٹاپ مین بازار اچھرہ لاہور پاکستان  
**سید فرمان شاہ**  
0300-6484398

آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جایا کرتی ہیں

ہر مشکل کا حل بذریعہ موکلات جس پریشانی کی وجہ سے  
آپ کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو گئی ہو اور ہر عامل  
ناکام ہو گیا ہو ہم سے مشورہ ایک بار ضرور لیں عامل وہ  
جس علم سات سمندر پار چلے کالے و سفلی جادو ختم پتھر  
سے پتھر دل محبوب تابع ہوگا اولاد فرمان بردار خاوند سے  
بے رخی بچوں کے اچھے رشتے اور کاروبار میں کامیابی وہ  
لوگ مایوس نہ ہوں بلکہ اپنی آخری امید کچھ کسید فرمان  
شاہ سے رابطہ کریں انشاء آپ محسوس کریں گے ایک فون  
کال نے ہماری زندگی بدل دی

زندگی کی کوئی بھی خواہش ہے کسی کو پانے کی  
تمنا اپنوں کی بے رخی سے دیکھی ہیں یا میاں بیوی  
کی رخصت کو ختم کرنا ہے

میں آپ سے ایک فون کال کی دوری پر موجود ہوں فون ملائیے اور آرزو مانجیے  
ایک بار ہمیں خدمت کا موقع دیں کامرانیوں آپ کے قدم چومیں گی اور آپ یقیناً بہترین اور خوشگوار زندگی کا لطف اٹھائیں گے۔  
نوٹ: جو خواتین و حضرات خود نہیں آسکتے وہ گھر بیٹھے فون کریں اور ہم سے کام لیں انشاء اللہ کامیابی ہوگی۔

وہ علم ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔ وہ انکس کی کیا جن میں شرم نہ ہو۔ وہ علم ہی کیا جس میں غل نہ ہو۔ وہ زبان ہی کیا جس میں اثر نہ ہو۔

کھولنے لگی میں نے فوراً کہا۔ ”سونیا جی چوہدری صاحب تو کہتے ہیں کہ اس کمرے کو ہم نے بھی کھولا نہیں اور اس کے محلے سے ہمارے خاندان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔“ تو وہ بڑے پیار اور محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ”جناب ایسی کوئی بات نہیں اصل میں اس کمرے میں ہمارے بزرگوں نے بہت سارا خزانہ چھپا رکھا ہے صرف اسی لئے اس کو ہمیشہ بند رکھا جاتا ہے۔“

میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ اس نے پیار سے میرے لبوں پر ہاتھ رکھ کر مجھے بولنے سے منع کر دیا۔ سونیا آج بہت خوب صورت لگ رہی تھی کمرہ اندر سے بہت خوب صورت تھا کھڑکیوں کے اوپر بہت خوب صورت پردے لٹک رہے تھے۔ ٹیبل، روشن دان، صوفے، کرسیاں اور کھانے بننے کے لئے استعمال ہونے والے تھوڑے سے برتن بھی کمرے میں موجود تھے اور فرش پر پیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا مگر کمرہ بجلی سے محروم تھا البتہ روشنی کے لئے لائٹیں موجود تھیں جن کی مدد روشنی میں بیٹھ کر ہم پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے اس وقت میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان تصور کر رہا تھا کہ سونیا جیسی خوبصورت اور جوانی کے نشے سے بھرپور لڑکی کا مجھے قرب حاصل تھا۔

باتیں کرتے کرتے اچانک سونیا اٹھی اور بولی۔ ”مسٹر خالد معاف کیجئے میں آپ کی خدمت میں کچھ پیش کرنا تو بھول گئی۔“ وہ دھیرے سے بیٹھ سے اٹھی اور ٹیبل پر پڑے جگ سے کچھ بھر کر گلاس لاکر مجھے اپنے پیارے ہاتھوں سے پلاتے ہوئے بولی۔ ”لو جان جوس پیئیں۔“

گلاس منہ کے قریب آتے ہی مجھے محسوس ہو گیا کہ یہ شراب ہے میں حیرت سے سونیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سونیا یہ کیا ہے؟ تم مجھے حرام اور گندی چیز پلا رہی ہو۔“

تو وہ فوراً بولی۔ ”بے شمار بھری راتوں کی سختیاں جھیل کر اب ملن کی رات آئی ہے تو تم انکار کیوں کرتے

ہو اگر میں تمہارے قرب کے حصول کے لئے اس خوفناک جوبلی میں صرف تمہاری خاطر آ سکتی ہوں تو تم میرے لئے شراب نہیں لی سکتے۔“

میں نے اس کے نشیلے لبوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”سونیا میں تمہارے لئے جان بھی دے سکتا ہوں مگر خدا کے لئے مجھے شراب سے دور رکھو۔“ تو وہ اپنی لمبی زلفوں کو چہرے سے ہٹا کر بولی۔ ”او کے شراب نہ سہی مگر شباب تو چلے گا نا؟“

اور مجھے بیڑ پر لٹا کر بوس و کنار کرنے لگی۔ سنا تھا جوانی دیوانی ہوتی ہے اسی لیے میں بھی ہوس کی ندی میں بہنے لگا سونیا ہوش و حواس سے بیگانہ مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اور پھر میں نے بھی آج ہر حد پار کرنے کی کھان لی تھی۔

اچانک سونیا نے بڑھتے ہوئے ہاتھ روک لئے اور لڑھک کر بیٹھ سے فرش پر جا گری۔ فوراً میں بھی سونیا کو اٹھانے کے لئے لپکا اور اسے اٹھا کر بیڈ پر بٹھایا اور گرنے کی وجہ پوچھنے لگا تو سونیا بولی۔ ”یار جان کوئی مسئلہ نہیں اچانک چلے آ گیا تھا مگر تم نے اپنے گلے میں اللہ کے نام والا لاکٹ پائین رکھا ہے پلینز اسے اتار دو۔“

اب ایسے کام کے دوران اتنی پاک اور مبارک ہستی کا نام جسوں سے ٹکراتا تو غلط بات ہے۔ میری نظر لاکٹ پر پڑی تو مجھے فوراً ہوش آ گیا اور میں جلدی سے اٹھ کر شرٹ پہننے لگا تو سونیا جلدی سے بولی۔ ”پلینز یہ لاکٹ اتار کر جلدی سے میری ہاتھوں میں آ جاؤ اور برسوں سے لگی میری پیاس بجھا دو۔“

مگر میں بولا۔ ”نہیں سونیا یہ غلط کام ہے ہمیں اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود سے گزرنا نہیں چاہیے۔“

سونیا میری منتیں کرنے لگی مگر میں واپسی کے لئے اصرار کرنے لگا کیونکہ اب میرا خمیر اور ایمان دونوں جاگ چکے تھے اتنے میں سونیا اٹھی اور بولی۔ ”براہ مہربانی جلدی سے لاکٹ اتار دو وقت تیزی سے گزر رہا ہے میں نے گھر بھی جانا ہے۔“ اور میز کی جانب بڑھنے لگی۔

لائٹن کی مدد روشنی میں، میں نے پیچھے سے

سونیا کو دیکھا تو اچانک میری نظر اس کے پاؤں پر پڑی جو اٹنے سے میرے تو ہوش ہی اڑ گئے میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہونے لگا اور سونیا شراب کا ایک گلاس پینے کے بعد ایک گلاس میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”خالد پلینز اب انکار نہ کرنا۔“ مگر میں بری طرح ڈر چکا تھا خوف سے میرا جسم کانپ رہا تھا، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے دل اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ ”سونیا مجھ سے کہہ رہی تھی۔“ جان کیا ہوا اتنے پریشان کیوں ہو۔“ مگر میری آواز بند ہو رہی تھی۔ ”ت۔ت۔ت۔ کون ہو؟“

سونیا حیرت سے انجان ہو کر بولی۔ ”خالد کیا بات ہے تم اتنے ڈرے ہوئے کیوں ہو خیریت تو ہے ارے جوبلی سے خوفزدہ تو نہیں ہو گئے۔“

میں نے بھاگ جانے والے انداز میں اس سے کہا۔ ”تم میری سونیا نہیں ہو۔ تمہارے پاؤں اٹنے کیوں ہیں؟“

سونیا کو معلوم ہو گیا کہ میں اس کی اصلیت جان گیا ہوں تو فوراً ہی اس کی شکل بگڑنے لگی بالوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے سانپ نمودار ہونے لگے آنکھیں جلنے ہوئے انگاروں کی مانند بالکل سرخ ہو گئیں ناک اور منہ سے بچھو اور دیگر خوفناک حشرات نکلنے لگے جسم گھٹنے سڑنے لگا۔ چہرہ ایک جانب سے پھل کر نیچے لڑھکنے لگا اور جڑے کی ہڈیاں واضح نظر آنے لگیں۔

خوف اور دہشت کی وجہ سے میں اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا مگر تیزی سے دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر گیا پھر اٹھ کر دروازہ ڈھونڈنے لگا مگر حیرت انگیز طور پر کمرے میں کوئی دروازہ نہ تھا یعنی یہ کمرہ اب چاروں طرف سے مکمل طور پر سیل ہو چکا تھا چاروں طرف صرف دیواریں ہی نظر آ رہی تھیں اور سونیا کے روپ میں وہ بدروح اب مکمل طور پر چڑیل بن چکی تھی جو ہر حال میں مجھے ختم کرنا چاہتی تھی۔

پھر خوفناک اور نفرت بھرے انداز سے بولی۔

”اور اسپیکر صرف تیری وجہ سے مجھے میرے شکار کی تلاش میں کافی دنوں سے شدید مشکلات کا سامنا ہے پہلے تو میں کسی نہ کسی طریقے سے اپنا شکار جوبلی تک لے ہی آتی تھی مگر جب سے تو اس گاؤں میں آیا ہے تیری اوجھی حرکات اور پھرے وغیرہ سے مجھے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ تجھے تو میں جلد ہی ختم کر دیتی مگر میری تمام کوششیں رائیگاں جا رہی تھیں بھی میں نے تیری محبوبہ کا روپ دھار کر تجھے یہاں بلایا مگر یاد رکھ، اب تو بھی یہاں سے زندہ نہ جاسکا گا۔“

اس کی خوفناک نظروں میں میرے لئے انتہائی نفرت جھلک رہی تھی اور مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی اسی لمحے وہ منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی اور کمرہ زبردست زلزلے کی مانند زور زور سے ہلنے لگا کمرے میں موجود چیزیں اڑنے لگیں اس بھیاں تک چڑیل نے جب شخصے کے برتنوں کی جانب دیکھا تو وہ دیواروں سے ٹکرا کر ٹوٹ کر میری جانب بڑھنے لگے اور میں بری طرح ڈرشی ہونے لگا کپڑے بھی جگہ جگہ سے پھٹ گئے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون بہنے لگا۔

بہتے خون کو دیکھ کر لپچائی ہوئی نظروں سے وہ میری جانب بڑھنے لگی خوف سے میری سانسیں بند ہو رہی تھیں مگر میرے قریب آ کر وہ چیخ مار کر دوڑ جا گری اور نہایت نفرت بھری شیطانی آواز سے بولی۔ ”اوا اسپیکر تم صرف اس صورت میں اس بند کمرے سے نکل سکتے ہو اگر اپنے گلے میں موجود لاکٹ اتار دو۔“ اس کی بات سن کر میں سارا معاملہ سمجھ گیا کہ اس مبارک لاکٹ کی موجودگی میں یہ خوفناک چڑیل میرا کچھ نہیں لگاڑ سکتی۔ لہذا میں نے آیت قرآنی کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔ نیز ہمت کر کے اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ”اے بدروح میں ایسے ہی چوہدری پر شک کرتا رہا مگر اصل مجرم تو ہے اور واقعی گاؤں والے بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جوبلی میں کوئی بدروح موجود ہے اور غور سے سن لے میں کسی صورت یہ لاکٹ نہیں اتاروں گا چاہے تو جو بھی کر لے۔“ اور میں نے اونچی آواز میں آیت الکرسی کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔

وہ بدروح بری طرح سے چیخنے اور چلانے لگی اس کے جسم میں آگ لگنا شروع ہو گئی۔ اور وہ دھیرے دھیرے فرش پر بیٹھنے لگی۔ پھر بولی۔ ”اے اللہ کے نیک انسان آج اس مبارک لاکٹ کی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی لہذا تم باہر جاسکتے ہو۔“ اور واقعی اب کمرے میں دروازہ نمودار ہو چکا تھا مگر وہ بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ”مگر تمہیں قسم ہے اس ہستی کی جس کے نام کا تم نے لاکٹ پکھن رکھا ہے پلیز یہاں ہونے والے واقعہ کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“

میں فوراً بولا۔ ”نہیں بلکہ آج میں تمہیں ختم کر کے ہی یہاں سے جاؤں گا کیوں کہ میرے مرشد پاک نے ہمیشہ برائیوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور وہ ہمیشہ شکر و خیر کرتے تھے۔“

وہ فوراً بلند آواز سے بولی۔ ”جب تک میرا انتقام ختم نہیں ہو جاتا تم مجھے کسی صورت ختم نہیں کر سکتے اور یاد رکھنا تمہارا انجام بھی انتہائی خطرناک ہوگا۔“

میں اس سے مخاطب ہوا۔ ”تمہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی قسم دے کر کہتا ہوں مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ اور بے تصور لوگوں کو اتنی بے دردی سے کیوں ختم کر رہی ہو؟“

وہ نرم لہجہ کرتی ہوئی بولی۔ ”سینکڑ اسی بڑی ہستی کی قسم تم نے مجھے کیوں دی؟“

پھر وہ رونے لگی اس کی آواز میں انتہائی دکھ اور گہرا درد محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل سے غم آنسو بن کر نکل رہا تھا روتے روتے اچانک وہ خوب صورت لڑکی کے روپ میں آ گئی مگر وہ روپ سونیا کا نہیں بلکہ اس کا اپنا تھا اور وہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔

میرے جسم سے درد کی ٹھنسیں اٹھ رہی تھیں میں نے بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر بیٹھنے کی کامیاب کوشش کی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا پھر میں نے اس سے کہا۔ ”اب بولو۔“

تو اس نے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھا تو میں

حیران ہو گیا کہ اتنی بھیاں تک اور کوفتہ کی چیز کی جگہ اب نہایت خوب صورت لڑکی موجود تھی۔ جسے دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا کہ حضرت انسان کتنا بے بس ہے کہ اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود وہ اپنا رنگ بدلنے پر بھی قادر نہیں مگر اللہ نے اس مخلوق کو روپ بدلنے تک کی طاقت عطا فرمائی ہے۔ پھر سوچا جو میرا پروردگار کرتا ہے بہت بہتر کرتا ہے۔ اس لئے ہمیں ہر حال میں خدائے واحد کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کرنا چاہئے کیونکہ میں بھی ایک کامل انسان کی وجہ سے ہی آج زندہ بیٹھا ہوا تھا۔

پھر وہ دھیرے سے بولی۔ ”سینکڑ صاحب! میں نے آج تک جتنے بھی لوگوں کو قتل کیا ان سب کا ذمہ دار چوہدری ہے۔“

میں فوراً حیرت سے بولا۔ ”وہ کیسے؟“ کیونکہ شروع سے میں بھی اسی پر شک کر رہا تھا۔ وہ گہرا اور لمبا سانس لے کر بولی۔

”میرا نام رضیہ تھا میرے گھر والے پیار سے مجھے رجو کہہ کر پکارتے تھے ہم لوگ ساتھ والے گاؤں میں رہائش پذیر تھے ہم لوگ بہت عزت دار اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے ہم سب چچا تایا وغیرہ کے ہمراہ اکٹھے ہی رہتے تھے مگر یوں اختلافات کے باوجود ہم سب ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ غرضیکہ زندگی جنت کی مانند گزر رہی تھی۔“

ایک شام میں کسی ضروری کام کی وجہ سے گھر سے باہر مہر کے قریب سے گزر رہی تھی کہ گاڑی سے دوا ہلکا لٹکے اور مجھے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر کسی نامعلوم مقام پر لے گئے۔ انہوں نے میرے ناک پر کوئی کپڑا رکھا جس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا اور میں محرومیت کرنے سے محروم رہی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو اسی کمرے میں پایا۔ جہاں ہم موجود ہیں رات کافی بیت چکی تھی ابھی مجھے ہوش آئے تھو اسی وقت گزرا تھا کہ تین آدمیوں سمیت چوہدری کمرے میں داخل ہوا اور آتے

ہی شیطانی انداز سے بولا۔ ”رجو کیسی ہو میری جان تمہارے حسن نے تو مجھے پاگل ہی کر دیا۔ تمہیں تو میں نے کئی بار سنبھالیا تھا کہ میری ہاتھوں میں آ جاؤ، مالا مال کروں گا مگر تم مجھے ہمیشہ نظر انداز کر دیتی تھی۔“

مگر آج تو میں پوری رات اپنی پیاس بجھاؤں گا ارے دل تو کرتا ہے کھانا جاؤں تمہیں۔“ چوہدری کے خوفناک ارادے کو دیکھ کر میں نے روتے ہوئے اس کی منت سماجت شروع کر دی مگر اسے مجھ پر کوئی ترس نہ آیا اور اس نے اپنے آدمیوں کی مدد سے مجھے بیڈ کے اوپر باندھ دیا اور میرے کپڑے اتارنے لگا۔

میں نے غصے سے اسے کہا۔ ”تو بہت بڑا مکار اور منافق ہے گاؤں والوں کے سامنے بڑا نیک اور معزز بنا پھرتا ہے یہ بھی نہیں سوچتا کہ تیری میرے جیسی ایک جوان بیٹی ہے تو شیطان ہے لعنت ہے تم پر۔ یہاں سے باہر جا کر میں سب کو تیری اصلیت بتاؤں گی ڈرتی نہیں میں تجھ سے۔“

اور غصے سے پاگل ہو کر اس کے منہ پر تھوک دیا اور چوہدری نے مجھے پھینک کر سید کرنا اور گالیاں دینا شروع کر دیں اور میں نجانے کیا کیا خطاب اسے دیتی رہی مگر وہ غصے سے پاگلوں کی طرح میرے جسم کو نوچنے لگا جیسے بھوکا کتا کھانے پر ٹوٹا ہے۔ بے غیرت نے دل بھر کر اپنی ہوس پوری کی اور پھر باقی تینوں کتوں کو مجھ پر چھوڑ کر براہ راست گھناؤنا منظر دیکھتا رہا اور شراب پیتا رہا۔

جب سب کتوں نے اپنی ہوس پوری کر لی تو ایک کتا بولا۔ ”چوہدری صاحب اس کا زندہ رہنا اب ہمارے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لئے اسے.....“ چوہدری نے بات کاٹتے ہوئے کہا مار ڈالو اس کتیا کو اور اسی بیڈ کے نیچے گڑھا کھود کر دفن کر دو اور اوپر بیڈ رکھ دو پوری زندگی کسی کو اس کی خبر تک نہ ہوگی جہاں بھی چوہدری رفاقت پر تھوکتی ہے۔“

پھر مجھے بے دردی سے قتل کر کے اسی بیڈ کے نیچے دفن کر دیا گیا اتفاق سے وہ رات اماں کی رات تھی

اور اسی نسبت سے شیطان اس رات حویلی میں کسی خاص عمل اور مقصد کی وجہ سے موجود تھا جس نے کسی خاص عمل کی وجہ سے میری روح پر قبضہ کر لیا۔

اور مجھ سے کہنے لگا۔ ”تمہیں بدلہ لینا ہے ان تمام حرام زادوں سے جنہوں نے تمہیں مکمل طور پر برباد کر دیا مگر یاد رکھنا تم اس حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکو گی البتہ میں اپنی ہتھکنڈوں سے تمہیں ایک خاص ہتھکنڈ دیتا ہوں وہ یہ کہ تم کسی بھی عورت کا روپ دھار سکو گی اور ٹوٹ پڑو اپنے دمنوں پر۔“ تب میں نے ان تمام لوگوں کو ختم کرنے کا ارادہ کیا جو ہر کسی کی عزت سے کھینا اپنا مشغلہ سمجھتے ہیں۔

میں روزانہ سوچ سوچ کر روتی تھی کہ میرے والدین اور خاص طور پر میرے اکلوتے بھائی کا میری عدم موجودگی میں کیا حال ہوگا لوگ تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ شاید میں کسی آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہوں۔ گاؤں والوں نے میرے متعلق طرح طرح کی باتیں کر کے میرے گھر والوں کی زندگی اجیرن بنا دی ہوگی۔ ہائے! میرے گھر والے۔ پھر میں نے باقاعدہ اپنے کام کا آغاز کیا۔

اور پھر سب سے پہلے میں نے اپنی خاص ہتھکنڈ سے ان تینوں کتوں کو حویلی میں بہت خوب صورت لڑکی کے روپ میں بلایا اور وہ بے غیرت ہوں کے مارے یہ بھی بھول گئے کہ انہوں نے یہاں کسی بے گناہ کو بے دردی اور سفاکی سے قتل کر کے دفن کیا ہوا ہے لہذا میں باری باری ان ہوس کے ماروں کو قتل کر کے حویلی کے تالاب میں پھینک دیتی تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس اور بے چینی دیکھ کر مجھے تسکین ملے۔

میں نے بہت کوشش کی کسی طرح چوہدری رات کے وقت حویلی میں آ جائے مگر وہ بے حد ہوشیار ثابت ہوا اسے کسی خاص عامل کی وجہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ گاؤں میں ہونے والے واقعات میں کسی بدروح کا کام ہے اور وہ صرف رات کے وقت ہی کسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے اس لئے وہ کسی صورت حویلی میں نہ آ سکا۔



میں جلد ہی ہوں کے مارے لوگوں کو ٹھکانے لگانے لگی، لوگوں کو درغلانے کے لئے روپ بدلنے والا ہتھیار میرے بہت کام آیا کبھی میں کسی خوبصورت لڑکی کا روپ دھار لیتی اور کبھی ان کی محبوبہ بن جاتی جس کی وجہ سے شکار آسانی سے میرے چنگل میں پھنس جاتا اور پھر دھیرے دھیرے یہ بے غیرت لوگ اپنے انجام کو پہنچ جاتے اور شکار کا خون شیطان پیتا اور مجھے مزید خلکیاں دیتا۔

باتیں کرتے کرتے وہ خاموش ہو گئی اور اپنے والدین کو یاد کر کے رونے لگی اور میں سوچنے لگا۔

حیرت ہے ایسے لوگوں پر جو اللہ کی عائد کردہ حد سے تجاوز کرتے ہیں اور صرف چند لمحوں کی لذت کی خاطر اپنی زندگی گنوا دیتے ہیں نیز یہ کہ زنا کی اتنی خطرناک اور بھیانک سزا ان کو دنیا میں ہی مل گئی تو آخرت میں ان کا کیا ہے گا اور اپنے مالک و خالق سے دعا کرنے لگا کہ یا اللہ تمام مسلمانوں کو مجھ سمیت زنا جیسے گناہ عظیم سے بچا اور مرنے والوں کے گناہ معاف فرما کر جنت الفردوس میں ان کو جگہ عطا فرما۔

پھر رجو بولی۔ ”کہاں کھو گئے انسپکٹر صاحب!“ ”میرے بولنے سے پہلے ہی وہ بولی۔“ ”آپ بھی میرے ہاتھوں سے مارے جاتے مگر آپ کو مبارک لاکٹ نے بچا لیا۔“

میں نے کہا۔ ”بیجانے والی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ اب تم لوگوں کو قتل کرنا چھوڑ دو کیونکہ کسی کو درغلا کر قتل کرنا اسلام میں جائز نہیں اور ویسے بھی تم تینوں دشمنوں کو ختم کر چکی ہو اور رہی بات چوہدری کی تو مجھے اس پر پہلے دن سے ہی شک تھا اسے اب قانون بہت سخت سزا دے گا۔“ رجو فوراً غصے سے پھنکارنی ہوئی بولی۔

”نہیں وہ میرا شکار ہے صرف میرا اسے بس میں ہی ختم کروں گی تم کسی بہانے رات کو اسے یہاں لے آؤ۔“

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ قانون اسے

عبرت ناک سزا دے گا تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو مگر اس نے کہا۔ ”میری روح کو چین صرف اسی وقت آئے گا جب میں خود اپنے ہاتھوں سے اس خبیث چوہدری کو قتل کر دوں گی۔“

ابھی میرے دل میں ایک بات آئی میں نے رجو سے پوچھا۔ ”اگر تم چوہدری کو ختم کر ڈالو تو کیا پھر بھی قتل و غارت کا سلسلہ جاری رکھو گی؟“

رجو گہرا سانس لے کر بولی۔ ”ہاں کیونکہ جب تک ہوں پرست شیطانوں کا اس گاؤں سے خاتمہ نہیں ہو جاتا میں چین سے نہیں بیٹھوں گی۔“

میں نے پھر اسے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واسطہ دیتے ہوئے کہا۔ ”اب تم کسی قتل نہیں کرو گی۔“ وہ بولی۔ ”ایک تو آپ مجھے اتنی مبارک ہستی کا واسطہ دیتے ہو تو میں مجبور ہو جاتی ہوں اوکے مجھے منظور ہے اب میں چوہدری کے علاوہ کسی اور کو قتل نہیں کروں گی مگر آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“

میں فوراً سہنس سے بولا۔ ”ہاں بولو۔“ رجو بولی۔ ”میں مسلمان ہوں اس کمرے میں بیڈ کے نیچے میری بے گور و کفن لاش موجود ہے جسے اسلامی رسومات کے مطابق دفن نہیں کیا گیا لہذا جب تک میری لاش کو باقاعدہ اسلامی طریقوں کے مطابق قبرستان میں دفن نہیں کیا جاتا میری روح یونہی بھٹکتی رہے گی۔“

تو میں نے رجو سے کہا۔ ”تم مجھے اپنا سمجھ کر مجھ پر اعتماد کرو میں اس وعدے کو ضرور پورا کروں گا۔ مگر تمہیں بھی میری بات ماننا ہوگی۔“ میری بات سن کر بلند آواز سے رونے لگی۔ ”جی میں ہر بات مانوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”تم چوہدری کے قتل سے باز رہو گی۔“ میں بحیثیت بھائی اپنی بہن کے مجرم کو جبر تاناک سزا دلواؤں گا کیونکہ کوئی بھی غیرت مند بھائی اپنی معصوم بہن کی عزت لوٹنے والے کو نہیں بخشے گا۔“

وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور میں نے موقع کی مناسبت سے اخلاقی اور دینی دلائل سے اسے قائل

کرنے کی کامیاب کوشش کی آخر وہ مان گئی۔ اور میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے حویلی سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اذان فجر شروع ہو گئی میں نے مسجد میں باجماعت نماز ادا کی پھر ناشتہ کر کے تھانے پہنچ گیا کچھ ضروری کام نمٹانے کے بعد میں نے چوہدری کو تھانے بلایا اور وہ آتے ہی بولا۔ ”انسپکٹر صاحب خیریت تو ہے آج سویرے سویرے مجھے تھانے بلالیا۔“

میں نے چوہدری سے کہا۔ ”مبارک ہو جناب قاتل کا سراغ مل گیا ہے۔“ چوہدری کے چہرے سے حیرت اور معصومی خوشی واضح محسوس ہو رہی تھی۔

پھر چوہدری بولا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات ہے قاتل کو ہر حال میں جبر تاناک سزا ملنی چاہئے۔ جس نے کتنے ہی گھر اے اجاڑ دیئے۔“ میں فوراً بولا۔ ”ضرور ملے گی!“

میں نے دھیرے سے چوہدری سے کہا۔ ”جناب مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ ان تمام واقعات کے ذمہ دار آپ خود ہیں۔“

اور پھر وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ ”انسپکٹر صاحب وہ کیسے؟“ میں طنز اور پیار سے بولا۔ ”جناب رجو کو تو جانتے ہی ہوں گے۔“

چوہدری یہ بات سن کر چونک اٹھا اس کی یہ حالت اس کے گناہ کی تصدیق کے لئے کافی تھی اس کی تو جیسے زبان ہی بند ہو گئی۔

م.....م..... میں نہیں جانتا کسی رجو کو تم کیا کہہ رہے ہو انسپکٹر؟“

پھر رات ہونے والا سارا واقعہ میں نے چوہدری کو سنایا اس نے میری بات نہ صرف ماننے سے انکار کر دیا بلکہ لانا مجھے دھمکیاں دینے لگا کہ تم مجھے جانتے نہیں کہ میں تمہارے ساتھ کیا کر سکتا ہوں تمہاری بچت اپنی صورت میں ہے کہ تم اپنی زبان بند رکھو اور اصل قاتل کو ہمہ ثبوت پکڑو یہ ڈراے بازیاں بند کرو۔“ اور غصے سے دھمکیاں دیتا ہوا تھانے سے نکل گیا۔

ہیڈ آفس رابطہ کرنے سے پہلے میں چوہدری سے ایک ملاقات کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ پھر چوہدری سے ملاقات کرنے کے بعد میں نے مکمل رپورٹ ہیڈ آفس پہنچادی اور مزید فوری طلب کی تاکہ بھرپور اور فیصلہ کن کارروائی کرنے میں مزید آسانی ہو۔

میں نے گاؤں سے بزرگ لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کو آگاہ کیا کہ کس طرح چوہدری نے ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کی عزت لوٹ کر اسے قتل کر کے حویلی میں موجود ہمیشہ بند رہنے والے کمرے میں دفن کر دیا تھا اب اسی لڑکی کی بے چین روح گاؤں والوں سے بھیانک انتقام لے رہی ہے۔ مگر ان کی آنکھوں پر چوہدری کے اعتماد کی پٹی بندھی ہوئی تھی وہ لانا مجھے برا بھلا کہنے لگے کہ ”انسپکٹر صاحب کچھ شک نہیں کہ آپ ایک اچھے اور بہادر پولیس آفیسر ہیں مگر ایک نہایت اچھے اور معزز انسان پر الزام لگانا آپ کو زیب نہیں دیتا۔“

لیکن میں نے سخت لہجے میں ایک بار پھر چوہدری سے درخواست کی کہ مجھے حویلی کا بند کمرہ کھولنے کی اجازت دے مگر وہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہا پھر میں نے اپنے سینئرز سے رابطہ کر کے ان سے اس بند کمرے کو کھلوانے کے لئے خصوصی درخواست کی اور ساتھ ہی رجو کے گھر والوں کو اطلاع بھی کر دی جسے سن کر رجو کی پوری ہستی ہی تھانے میں پہنچ گئی۔

سب لوگ جمع ہو چکے تھے کچھ جو شیلے نو جوان بھی پریت نگر سے ہمارے ساتھ مل گئے، نوبت خطرناک لڑائی تک پہنچ چکی تھی پولیس کی تازہ فوری بھی آچکی تھی اب چوہدری کے پاس صرف وہی راستے تھے یا تو بند کمرہ کھولنے دیتا یا اپنا گناہ ثابت کر لیتا۔

آخر قانون کی سختی اور کچھ پورے علاقے کے مسلسل اصرار بالخصوص چوہدری کی اکلوتی بیٹی سونیا کی ضد پر چوہدری حویلی میں موجود کمرہ کھولنے پر آمادہ ہو ہی گیا جلد ہی ہم سب حویلی کے اندر موجود تھے۔ ایک بہت بڑا جھوم جوی کے ارد گرد اور اندر موجود تھا ان سب



## آسیب گھر

مریم فاطمہ - کراچی

خوبرو لڑکی آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا اور جب باہر دیکھا تو ایک کالی بلی اپنی غضب ناک نگاہوں سے اسے گھور رہی تھی کہ پھر اچانک بلسی اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔

دل پر سکھٹاڑی کرتی اور خوف کے جھنجھکے میں جکڑتی عقل میں نہ آنے والی ڈراؤنی کہانی

”چلو بچو! ہا ہرنگو ہارایا گھر آ گیا۔“ مسٹر جمرو نے گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر سے پیچھے جوبانا اور میٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جوبانا سترہ سالہ خوب صورت سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ جبکہ دوسری طرف میٹ ان کا گہرے بھولے بالوں اور بڑے آنکھوں والا اٹھارہ سال کا بیٹا تھا۔ یہ تین لوگوں کی فیملی تھی۔ ان کی والدہ دو برس پہلے انتقال کر گئی تھیں۔

اپنی بیوی کے مرنے کے بعد مسٹر جمرو کا اپنے گاؤں والے گھر میں دل نہ لگا اور وہ اس گھر کو کوچ کر شہر میں یہ نیا گھر خرید بیٹھے۔ یہ گھر خاصا پرانا تھا۔ اور مسٹر جمرو نے بچوں کو یہاں لانے سے پہلے ہی اس گھر کی حالت کے بارے میں آگاہ کر دیا تھا۔ لیکن وہ گھر ان دونوں کی توقع سے بھی بڑھ کر کہیں زیادہ بوسیدہ حالت میں نکلا۔ سامنے

کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ہر حال میں قاتل کو پکڑ کر اسے عبرتناک سزا دی جائے۔

بڑی مشکل سے دروازہ کھولا گیا دروازہ کھلتے ہی اندر سے بدبو کے بھبھوکے اڑنے لگے کمرہ اندر سے انتہائی بوسیدہ اور غلیظ نظر آ رہا تھا حالانکہ جب میں رجو سے ملا تھا تب یہ انتہائی خوب صورت نظر آ رہا تھا پھر میں جلد ہی سمجھ گیا کہ رجو نے اپنے شکار بھانسنے کے لئے اس کمرے کو مصنوعی آراستہ کیا ہوگا۔ پھر رجو کی بتائی ہوئی جگہ سے لاش نکال لی گئی جو حیرت انگیز طور پر بالکل سلامت اور تازہ محسوس ہو رہی تھی اور لاش نکلتے ہی کمرے میں موجود بدبو انتہائی خوب صورت خوشبو میں تبدیل ہو گئی جسے ہر سمجھ دار آدمی نے واضح محسوس کیا شاید یہ رجو کی بے گناہی ثابت کرنے کا ذریعہ تھی۔

میں نے چوہدری کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”جی چوہدری صاحب اب آپ کیا کہتے ہیں۔“

تو وہ فوراً ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں مجھے لگتا ہے یہ میرے کسی دشمن کی چال ہے اور آپ سچ تو یہی اس سے ملے ہوئے ہوتا کہ مجھے پھنسا جا سکے۔“ اور لوگوں سے متوجہ ہو کر خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے جھوٹی قسمیں کھانے لگا۔

اسی وقت کمرے سے ایک سیاہ دھواں بلند ہونے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سفید ہیولہ نظر آنے لگا سارے جھوم کی سپنس سے بھر پور نظریں اس ہیولے پر مرکوز تھیں۔

پھر اس ہیولے سے رجو کی آواز بلند ہوئی جو چوہدری سے مخاطب ہوئی۔ ”اے غیث چوہدری اپنے گناہ کا اقرار فوراً سب کے سامنے کر ورنہ ابھی تجھے جہنم رسید کرتی ہوں۔“

آواز میں سختی، نفرت، غصہ اور رعب شامل تھا۔ خلاف توقع چوہدری نے اب بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیا دراصل وہ ہر حال میں اپنا مجرم سب کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس ہیولے نے چوہدری کو

پھر ہم سب نے مل کر رجو کی میت کو اس کی تمام خواہشات کے مطابق قبرستان میں دفن کیا اتفاق سے دونوں یعنی رجو اور چوہدری کی قبریں بالکل ساتھ ساتھ تھیں۔ فاتحہ پڑھتے وقت مجھے آسمان کی جانب سفید اور پر نور دھوئیں سے رجو انتہائی خوش ہو کر الوداع کہہ رہی تھی اور تھوڑی دیر میں وہ میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔



ڈاکٹرول، حکیمول، ماہرین طب، ہدایت لکھی گئی مفید کتاب

## کولیسٹرول اور علاج

قیمت -/100 روپے

اس کتاب میں، کولیسٹرول کی حقیقت، کولیسٹرول اور ہماری خوراک، کن غذاؤں سے کولیسٹرول بڑھتا ہے، کولیسٹرول کس طرح کم کریں، چھلی، میٹھی اشیاء، زیادہ نمک نہ کھائیں، کولیسٹرول اور دل کے امراض، دل میں درد، ہارٹ ایٹک کی ایک اہم وجہ، احتیاطی تدابیر، ہومیوپیتھی کی دوائیں، دل کے امراض کی وجوہات، موٹاپا، مچھلیوں میں کولیسٹرول کے فوائد، مچھلی اور دودھ، مناسب ماحول، کولیسٹرول کا ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی علاج، کولیسٹرول کا طبی علاج، چربی سے پرہیز کیجئے، کھانے پینے کی اشیاء سے کولیسٹرول کم کیجئے، اور بہت کچھ پڑھئے کولیسٹرول کے بارے میں کہ کس طرح کولیسٹرول سے محفوظ رہا جائے، اور کون کون سی ورزشوں سے کولیسٹرول کو کم کیا جاسکتا ہے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

دعابک کارنر، نئی دہلی 110055 فیصل آباد  
ایم این پور بازار

ہو رہا تھا۔ یہ بات اسے ڈرائے دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ بری طرح چونک پڑی اس نے پاس میں پڑا میٹ کا Bat اٹھایا اور ہمت کر کے آگے بڑھی۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور مسٹر جیمز کے ہمراہ میٹ اندر داخل ہوا۔ ”اومانی گاڈیہ تو آپ دونوں ہیں۔“ جو ہانا ہانپتے ہوئے بولی۔ ”کیوں تمہیں کیا لگا تھا۔“ مسٹر جیمز نے ہنسنے لگا۔

”مجھے لگا کہ کوئی.....“ اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔  
”تمہیں ضرور لگا ہوگا کہ چور یا ڈاکو گھس آئے ہیں۔“ مسٹر جیمز کی بات پر وہ بس گردن ہلا کر رہ گئی۔ انہیں یہ تو بتا نہیں سکتی تھی کہ اسے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی بھوت ہے۔ دوپہر کو کھانے میں ان لوگوں نے سینڈوچز کھائے۔

☆.....☆.....☆

اس رات بڑے زوروں کی بارش ہوئی۔ کالے سیاہ بادلوں سے آسمان ڈھکا ہوا تھا۔ ایسے میں جو ہانا اپنے کمرے میں بستر میں لیٹی آرام کر رہی تھی کہ تب ہی اسے لگا کہ کوئی کمرے کا دروازہ کھرج رہا ہے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تو پہلے ہی اس گھر سے ڈری ہوئی تھی۔ لیکن ہمت کر کے اٹھی اور دروازہ کھول دیا، اب جو سامنے دیکھا تو ایک کالے رنگ کی بلی دروازہ کھرج رہی تھی۔ جو ہانا نے اسے دیکھ کر ہلکی سی چیخ ماری۔ اور بلی ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ دوسری طرف چلی گئی۔ جو ہانا جلدی سے آگے بڑھی اور میٹ کے کمرے میں گھس آئی۔ ”میٹ لگتا ہے پڑوسیوں کی بلی ہمارے گھر میں گھس آئی ہے۔“

”پڑوسیوں کی بلی؟“ میٹ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں پڑوسیوں کی بلی۔“ جو ہانا نے کہا اور میٹ کو ساتھ لے کر پورا گھر چھان مارا لیکن وہ بلی پھر دوبارہ نہیں دکھائی۔ وہی تو میٹ نے اسے اس کا وہم

لیکن جو ہانا کو دور دور تک غیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی کمرے کی چیزوں کو گھور رہی تھی۔ ہر چیز اسے گھورنی محسوس ہو رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ بستر سے اٹھی اور میز پر سے دو تین اٹھا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ سامنے والا گھر خالی پڑا تھا۔ مسٹر جیمز نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا جبکہ اچانک ہی جو ہانا کو لگا کہ سامنے کھڑکی میں کوئی ہے۔ لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہولہولہاں سے غائب ہو گیا۔ اب سوائے تاریکی اور اندھیرے کے وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جو ہانا سوچ میں پڑ گئی کہ آخر وہاں کیا تھا۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ دیکھنے بھی پہنچ جاتی لیکن اس وقت رات ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس نے دو تین واپس اپنی جگہ رکھی اور کھل اڑھ کر لیٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز گھر کے تینوں فرد صبح ہی صبح بیدار ہو گئے۔ جو ہانا کو کل رات والا واقعہ یاد تھا۔ لیکن اس نے ناشتے کی میز پر کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مسٹر جیمز کچھ ضروری سامان وغیرہ لینے بازار چلے گئے۔ میٹ گھر پر بور بور ہوا تھا۔ سودہ اسے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔

جو ہانا کو لگا کہ یہ اچھا موقع ہے، اس بات کا پتہ چلانے کا کہ کل رات باہر کون تھا۔ یہ جاننے کے لئے اس نے سوسٹر اور مفلر ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکلی وہ سیدھی چلتی ہوئی اس گھر کے سامنے رک گئی۔ تب ہی اچانک اس گھر کا دروازہ کھلا اور ایک بچہ مسکراتا ہوا باہر نکلا۔ جو ہانا نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بچے نے شرماتے ہوئے ہاتھ ملایا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”ہنری۔“ اس بچے نے مختصر سا جواب دیا۔  
”تم اندر کیا کر رہے تھے۔ یہ گھر تو بند ہے۔“  
”میں یہاں کھینے آتا ہوں۔“ ہنری نے کہا اور ایک طرف بھاگ گیا۔

جو ہانا کو وہ بچہ کچھ عجیب سا لگا۔ وہ واپس اپنے گھر آ گئی۔ لیکن اسے مسلسل کسی کی موجودگی کا احساس

لان میں ایک بہت بڑا درخت تھا۔ جس پر کسی مخصوص قسم کے پھر لگے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میٹ بہت خوش ہوا۔ اب تینوں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر آ چکے تھے۔  
”واہ! کمال ہو گیا۔ ہمارا خود کا اپنا لان۔“ میٹ نے کہا۔

”مجھے تو یہاں ڈر محسوس ہو رہا ہے۔“ جو ہانا نے خود میں سسٹے ہوئے کہا۔  
”ڈر نہ جیسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ گھر بس تھوڑا پرانا ہے۔ اس لئے تمہیں ایسا لگ رہا ہے۔ تھوڑی سی محنت سے ہم اسے بالکل نئے جیسا بنا دیں گے۔“ مسٹر جیمز نے کہا۔ اور پھر وہ گاڑی میں سے سامان نکالنے لگے۔

جو ہانا کو نامعلوم کیوں اس گھر سے خوف آ رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھی۔ اور گھر کو بغور جانچنے لگی۔ ”تمہیں پسند آئے گا۔ ویسے بھی یاد کرو تم اکثر کہا کرتی تھی کہ گاؤں کی زندگی بہت ہی پور کر دینے والی ہوتی ہے۔“ میٹ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی گھر میں سے کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی تو تینوں ہی چونک پڑے۔

”اوہ میرے خدا وہ کیا تھا ڈیڈ۔“ جو ہانا نے گھبرا کر پوچھا۔

مسٹر جیمز اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے آگے آئے۔ تب ہی کھڑکی کھلی اور ایک شریر سا نظارہ آنے والا بچہ باہر نکل کر ہاگ۔ مسٹر جیمز ہنس دیئے۔  
”مجھے تو لگا کہ کوئی بھوت ہے۔“ جو ہانا نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”مبارک ہو جو ہانا تمہارے نئے گھر کا بھوت۔“ مسٹر جیمز نے اس بھاگتے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میٹ ہنس دیا۔ پھر یہ لوگ باری باری کر کے سامان اندر لے کر جانے لگے۔

سارا دن انہیں کام کرنے میں لگ گیا۔ اور اس رات وہ لوگ جلدی ہی سونے کے لئے لیٹ گئے۔



قرار دیا۔ لیکن جوہانا بھند تھی۔

پھر کچھ خیال آتے ہی وہ بولی۔ ”آؤ تمہیں دکھاتی ہوں بلی کے بچے کے نشانات، اس نے اپنے بچوں سے دروازے کو گھر چاہے۔“ لیکن اب جو میٹ نے وہاں دیکھا تو کوئی نشان نہ تھا۔ ”یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا۔“ میٹ نے بے زار لہجے میں کہا۔ ”میں تو سونے جا رہی ہوں۔“ وہ یہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور جوہانا اچھے میں پڑ گئی۔ وہ رات اسے وقفے وقفے سے بلی کے بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔ وہ خوف سے سبھی ہوئی بستر میں دبکی رہی۔ اس میں ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر دیکھتی کہ کیا وہ بلی واپس آ گئی ہے۔ اس نے سوچا کہ میٹ سے کل صبح پوچھنے کی کہ اس نے بعد میں کسی بلی کے بولنے کی آواز سنی تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلے روز صبح ناشتے کے بعد میٹ لان میں گئے بیر کے درخت پر سے بیر توڑ رہا تھا کہ جوہانا اس کے پاس چلی آئی۔ ”میٹ کیا تم نے رات کو کسی بلی کی آواز سنی۔“

”پھر وہی بکواس۔ ارے نہیں سنی یار۔ تم ایک کام کرو کہ ایک چکر لائبریری کا لگاؤ۔ تھوڑا دل بہل جائے گا ورنہ گھر بیٹھے بیٹھے تم بھوت پریت کی باتیں سوچتی رہو گی۔“

جوہانا نے کچھ سوچ کر اشکات میں سر ہلا دیا۔ اور لائبریری کی طرف چل دی۔ لائبریری میں اس نے گھوسٹ انسائیکلو پیڈیا پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنا چاہتی تھی، پھر لائبریری سے واپس آ کر وہ سیدھی میٹ کے کمرے میں چلی آئی۔ ”میٹ تم جانتے ہو میں نے لائبریری میں بیوقوفوں اور چڑیلوں کے بارے میں کتاب پڑھی ہے۔ اور پتا ہے مجھے کیا معلوم ہوا۔“ ”اوہ تم وہاں بھی یہ فضول مسئلے کے پیچھے رہی۔“ میٹ بے زاری سے بولا۔ ”تم واقعی پاگل ہو گئی ہو۔“

”میٹ یہ کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔ میں نے پڑھا کہ جو گھر زیادہ عرصے تک کے لئے خالی رہتا ہے وہاں بھوت پریت حکومت کرنے لگتے ہیں اور وہ بلی کی شکل میں ظاہر ہو سکتے ہیں اور کل رات میں نے بلی ہی دیکھی تھی۔“

”لیکن میں نے نہیں دیکھی تھی ذرا اپنی عقل استعمال کرو جوہانا اگر یہاں بھوت یا چڑیلیں ہوتیں تو وہ صرف تمہیں ہی کیوں تنگ کر رہی ہیں۔ مجھے اور ڈیڈ کو تو ابھی تک انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بس جب ہو جاؤ اور میری بات سنو! ابھی جب تم گئی ہوئی تھیں تو تمہارے پیچھے ساتھ والے گھر سے ایک لڑکی آئی تھی لنڈزی نام ہے اس کا میری اور اس کی بہت اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ بہت جلد ہم دونوں باہر گئیں گھومنے پھرنے جائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم بھی اپنے لئے بوائے فرینڈ ڈھونڈ لو۔“

”اوہ میں تو جا رہی ہوں۔ تم نے میری بات کا یقین نہیں کرنا تو نہ کرو۔“

”ہاں ہاں جاؤ تمہاری اس بے کاری کی بات کا تو کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔“ میٹ نے پیچھے سے آواز لگائی۔

اگلے روز شام کے وقت لنڈزی میٹ سے ملنے آئی۔ میٹ نے جوہانا کی بھی اس سے ملاقات کروائی۔ لنڈزی دیکھنے میں تو بڑی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی لیکن نامعلوم کیوں جوہانا کو وہ بھی کچھ پراسرار لگی، اس نے میٹ سے تو کچھ نہیں کہا لیکن دل میں پریشان ہوتی رہی۔

بلی جیسے ہی زمین پر پاؤں رکھتی تو کسی انسان کے قدم رکھنے جیسی آواز پیدا ہوتی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ بلی ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ جوہانا آنکھیں جھپکنے لگی۔ وہ حیران تھی کہ ابھی تو وہ بلی وہیں تھی پھر اچانک کیسے غائب ہو گئی۔ اور پھر تو یہ سلسلہ روز کا چل نکلا روزانہ اسے بلی چلتی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔ اس روز بھی رات کے پہر جب سب سو رہے تھے تو جوہانا کو کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ آواز راہداری میں سے آ رہی تھی۔ جوہانا اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکا لیکن آج وہاں کوئی بلی نہ تھی۔ بلکہ کوئی لڑکی راہداری میں چلتی چلی جا رہی تھی۔ جوہانا کا سارا خون خشک ہو گیا وہ ڈر کے مارے واپس کمرے میں آ گئی اور دروازہ اچھی طرح بند کر لیا۔ وہ رات اس نے جاگتے ہوئے گزار دی۔

اگلے روز رات کے وقت پھر اسے اپنے کمرے کے باہر کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ یہ معاملہ حل کر کے ہی رہے گی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر جھانکا باہر وہی لڑکی اسے راہداری میں چلتی نظر آئی۔ وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے گلے میں سلور کا لاکٹ پہنا ہوا تھا۔ وہ اندھیرے میں چمک رہا تھا۔

اچانک ہی جوہانا کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ ایسا ہی لاکٹ تو لنڈزی نے بھی پہنا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ جوہانا جلدی سے واپس کمرے میں آئی اور جلدی جلدی لنڈزی کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ تین چار بار گھنٹی بجنے کے بعد لنڈزی نے فون اٹھا لیا۔ ”ہیلو۔ ہیلو لنڈزی میں جوہانا بات کر رہی ہوں۔“

”ہیلو جوہانا کیسی ہو۔ خیریت اتنی رات کو کیسے فون کر لیا۔“

جوہانا نے جھوٹ بولا۔ اتنی رات مجھے فون کرنے کا اسے کبھی بھانہ کچھ میں آیا۔ اسے اصل بات تو بتا نہیں سکتی تھی۔ ”اچھا؟ میں نے ایسا کہا۔“

”کمال ہے مجھے تو یاد نہیں۔“ ابھی وہ مزید کچھ بات کرتیں کہ پیچھے سے جوہانا کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ جوہانا کی چیخ نکل گئی اس نے گھوم کر دیکھا تو سامنے وہی لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں سلور کا لاکٹ چمک رہا تھا لیکن اس کی شکل بالکل بھی لنڈزی جیسی نہیں تھی۔

فون جوہانا کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ وہ لڑکی ساٹ چہرہ لئے جوہانا کو ہی گھور رہی تھی۔ جوہانا نے سوچا کہ اس سے جان بچانے کا کبھی ایک طریقہ ہے کہ یہاں سے بھاگ جائے اس نے اپنی پوری قوت جمع کی اور وہاں سے بھاگنے کے لئے قدم بڑھایا ہی تھا کہ سامنے لگی تصویر میں سے دو ہاتھ باہر نکلے اور اسے بھی تصویر میں سمجھ لیا۔ اب جوہانا بھی تصویر کا ایک حصہ بن گئی تھی۔

جوہانا کی چیخ و پکار سن کر میٹ اور مسٹر جنرل کمرے سے باہر نکل آئے۔ میٹ آگے آگے تھا۔ وہ جیسے ہی کمرے میں پہنچا۔ اسی تصویر میں سے دونوں ہاتھ باہر آئے اور اسے بھی اندر کھینچ لیا۔ دروازے پر کھڑے مسٹر جنرل نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اپنا ذہن تو ازان ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے۔

اس گھر کے آسیب نے جوہانا اور میٹ کو زندہ نگل لیا۔ اور مسٹر جنرل بھی ہمیشہ کے لئے پاگل ہو گئے۔ اس دن کے بعد سے اس گھر میں کوئی نہیں جاتا۔ عرصہ بیت گیا لیکن وہ گھر بند پڑا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہاں جوہانا اور میٹ کی رو حیں بسر کرتی ہیں۔ کسی میں بھی اس گھر میں جانے کی ہمت نہیں ہے۔ جوہانا کا خیال درست ہی ثابت ہوا تھا۔ ”اس گھر میں واقعی آسیب تھا۔“

”وہ دراصل تم نے کہا تھا کہ تم گھر پہنچ کر فون کر دو گی تو تم نے فون نہیں کیا تو میں نے خود کر لیا۔“



نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لہانے میں لپٹی اپنی نوعیت کی نقابیل یقین اور نقابیل فراموش جسم و جان کو انگشت بدنہاں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لہولہاں کھلتی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کرے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چمکھڑی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

”تم نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی اگر میرا دوست میری مدد نہ کرتا تو تم میری گردن کاٹ چکے ہوتے۔ اب اپنی گردن بچاؤ۔“

اڑوہا غار میں غائب ہو کر باہر جنگل میں غار کے منہ کے قریب ہی نکل آیا ناگو نے اڑوہا کو پھنکا کر اپنی طرف آتے دیکھا تو منہ ہی منہ میں منتر پڑھ پڑھ کر اڑوہا پر چھوٹے مارنے لگا۔ لیکن اس کا ایک بھی منتر کام نہیں کر رہا تھا۔ کسی منتر کا اڑوہا پر اثر نہیں ہو رہا تھا اڑوہا اس کے قریب سے قریب آ گیا تو ناگو نے آگ میں سے جلتی ہوئی لکڑی اڑوہا پر ماری لکڑی کی آگ اڑوہے کے قریب جاتے ہی بجھ گئی۔ ناگو نے دوسرا منتر پھونکا تو ایک بہت بڑا مگر چھ غار میں سے نکل کر اڑوہا کی طرف بڑھا اور اسے دو بوجنا چاہا۔ مگر اڑوہا بھی غافل نہیں تھا اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور ایک دم سے مگر چھ کی گردن کے گرد اپنا سارا بدن لپیٹ کر کسنا شروع کر دیا مگر چھ کا دم گھٹ گیا اور اس کی آنکھیں باہر کواہل پڑیں۔ ناگو نے جب اپنا ہر منتر بے کار دیکھا تو اٹھ دوڑا اڑوہا کے لئے اب وہ بڑا آسان شکار تھا۔

شریم نے اڑوہا سے کہا۔ ”اس ظالم انسان کو چھوڑنا نہیں اڑوہا بھائی۔“

تو اڑوہا نے کہا۔ ”پہ اب مجھ سے بچ کر نہیں

جاسکتا۔“ ساتھ ہی اڑوہے نے اپنے جڑے کھول کر زور سے سانس اندر کو کھینچا۔

ناگو اس وقت تازے درختوں میں پہنچ چکا تھا اڑوہا کے سانس نے اسے پہلے تو اسے وہیں کھڑا کر لیا۔ وہ آگے کو دوڑ رہا تھا اور اڑوہا کا سانس اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناگو اس جگہ کھڑا ناگئیں چلانے لگا۔ اڑوہا نے اور زور سے سانس کھینچا تو ناگو نے اڑوہا کی طرف آنا شروع کر دیا۔ قریب آتے آتے وہ اڑوہے کے منہ کے بالکل قریب آ گیا۔ ناگو کا جسم تیزی سے اڑوہا کے منہ کے اندر چلا گیا اور ناگو کی آخری چیخ بلند ہوئی اور پھر ناگو کی چیخ ہمیشہ کے لئے معدوم ہو گئی۔

شریم نے آگے بڑھ کر اڑوہا سے کہا۔ ”اڑوہا بانی تم نے دنیا کو ایک ظالم انسان سے نجات دلائی اب مجھے راج کماری کے پاس لے چلو۔ اسے میری مدد کی ضرورت ہوگی۔“

اڑوہا نے کہا۔ ”میرے چمن کے اوپر چڑھ کر بیٹھ جاؤ۔“ اڑوہا نے اپنا چمن نیچے کیا شریم اچھل کر اس کے سر کے اوپر بیٹھ گیا۔

تو اس کے ساتھ ہی اڑوہا نے پوری تیز رفتاری سے ریٹکنا شروع کیا چلتے چلتے وہ جنگل میں سین اس جگہ



پہنچ گیا جہاں وحشی راج کماری کو پکڑ کر واپس لا رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے اور نیر اچھا لہ رہے تھے۔

شریم نے اڑدھا سے کہا۔ ”راج کماری مصیبت میں ہے مجھے یہاں اتار دو۔ میں راج کماری کو ان سے چھڑا لوں گا۔“

اڑدھا نے شریم کی طرف دیکھتے ہوئے پھر وہی بات دہرائی۔ ”ایک بھائی کے ہوتے ہوئے ایک بھائی کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تم آرام سے دیکھو کہ میں ان وحشیوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔“ شریم کو اڑدھا نے ایک درخت کے پیچھے اتار دیا۔ اور خود اس راستے میں جا کر چمن اٹھائے بیٹھ گیا جدھر سے وحشیوں نے ابھی گزرنا تھا۔

وحشی خوشی سے جھومتے لہراتے شور مچاتے اچھلتے کودتے راج کماری کو پکڑ کر سردار کے پاس لے جا رہے تھے کہ اچانک جنگل ایک خوف ناک پھنکاری گرج سے دہل اٹھا۔ سارے کے سارے وحشی وہیں جم کر رہ گئے وہ دہشت زدہ تھے ایسی گرج انہوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ اڑدھا نے دوسری پھنکاری اور درخت کی اوٹ سے نکل کر ان وحشیوں کے سامنے آ کر لہرانے اور ان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ وحشیوں نے اڑدھا سے پرہیز کرنا چاہتے تھے۔ اڑدھا نے پھنکاری اس قدر گری تھی کہ نیزے اس کے منہ کے قریب جاتے ہی پھل کر بھاپ بن کر اڑ جاتے، کئی درختوں کو اڑدھا کی پھنکار نے آگ لگا دی۔ وحشیوں نے راج کماری کو چھوڑ دیا، اب اپنی جان بچانے کے لئے لہر لہر بھاگنے لگے۔ لیکن ماڑدھے نے ان کے سامنے راستے بند کر دیئے تھے۔ جنگل میں اب چاروں طرف آگ لگی ہوئی تھی۔

شریم نے لپک کر راج کماری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور کہا۔ ”گھبراؤ نہیں میں شریم ہوں۔“

”شریم بھائی تم..... جلدی سے اس طرف آ جاؤ۔“ شریم راج کماری کو لے کر آگ میں چلتے درختوں سے دور لے گیا۔

راج کماری کا رنگ زرد ہو رہا تھا اڑدھا کو دیکھ کر اس کا حلق زیادہ خشک ہو گیا۔

شریم نے کہا۔ ”فکر نہ کرو اب تم میرے ساتھ ایک خوف ناک جنگل کے سفر پر ہو۔ اس لئے بہادر بن کر حالات کا مقابلہ کرو میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ یہ اڑدھا ہمارا دوست ہے اور اس نے ہم دونوں کو سمندر کے طوفان سے نکال کر ہندوستان کے ساحل تک پہنچایا تھا۔“ راج کماری نے اڑدھا کے کتھنوں اور منہ سے آگ کے شعلے نکلنے دیکھے تو ششدر ہو کر رہ گئی۔

”کیا یہ اڑدھا ہمارا دوست ہے؟“

”ہاں، راج کماری کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ یہ کس دلیری سے ہمارے دشمنوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔“

اڑدھا نے تقریباً سارے وحشیوں کو جلا کر ختم کر دیا اس کے سانس سے نکلنے والی آگ اتنی زیادہ تباہ کن تھی کہ جس جنگل کے جسم کو آگ لگی اس کی ہڈیاں تک آگ میں جل کر رہ گئیں۔ سارے وحشیوں کو جلا کر اڑدھا نے شریم اور راج کماری سے کہا۔

”اب میں واپس اپنی سمندری دنیا میں جانا چاہتا ہوں اور اب میں تمہاری اور کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

راج کماری ڈر کر ایک درخت کے اوٹ میں ہو گئی۔ اصل میں وہ ڈر کر شریم کے پیچھے ہو جانا چاہتی تھی مگر شریم تو اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لئے مجبوراً اسے درخت کے پیچھے ہونا پڑا۔ شریم راج کماری کو درخت کے پیچھے جاتے دیکھا تو فحش کر کہا۔

”یہ بہت ڈرتی ہے اڑدھا بھائی۔“

اڑدھا نے کہا۔ ”ہر آدم زاد مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جائے گا۔ اب یہ بتاؤ شریم بھائی کہ میں تمہارے اور کیا کام آ سکتا ہوں۔“

شریم نے کہا۔ ”میں اسے لے کر یہاں سے سیدھا وسطی ہندوستان کی ریاست میں جاؤں گا راستہ بڑا دور ہے کیا تم ہمیں ہندوستان کے وسط میں پہنچا سکتے تاکہ ہمارا جنگل کا خطرناک راستہ توٹ جائے۔“

اڑدھا نے کہا۔ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے

شریم بھائی اور تمہیں چھوڑ کر مجھے واپس بھی آنا ہے کوشش کرنا ہوں کہ تمہیں زیادہ سے زیادہ منزل کے قریب پہنچا دوں۔ میرے سر کے اوپر بیٹھ جاؤ۔“ راج کماری کا تو اڑدھا کے پاس آتے ہوئے منہ کھلا جا رہا تھا۔

اور پھر اڑدھا کئی دریاؤں اور پہاڑوں جنگلوں سے گزر گیا بہت دور آگے جا کر اڑدھا راج کماری اور شریم کو ایک بہت بڑے دریا کے پار اتار دیا اور کہا۔ ”شریم بھائی اب اگر میں اور آگے گیا تو مجھے واپسی میں دیر ہو جائے گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس جگہ سے واپس چلا جاؤں تاکہ وقت پر سمندری ناگ بادشاہ کے دربار میں پہنچ سکوں۔“

شریم نے اڑدھا کو اجازت دے دی اور وہ واپس ہو گیا اڑدھا کے جانے کے بعد شریم نے راج کماری سے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہاں سے تمہاری ریاست کتنی دور ہے۔“

راج کماری نے اگر مرد دیکھا پھر زمین سے پتھر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ یہ دن کا علاقہ ہے۔ یہاں سے اوپر کی طرف سات سو گز پر ہماری ریاست ہے لیکن ابھی ہمیں بڑے خطرناک جنگلوں سے گزرنا پڑے گا۔“

شریم نے کہا۔ ”دنیا کا ایسا کوئی خطرناک جنگل نہیں جس میں سے میں نہ گزرا ہوں۔ راج کماری جی تم فکر نہ کرو میں تمہیں تمہارے محل میں ہی پہنچا کر دم لوں گا۔“ اور وہ دونوں دریا کے کنارے کنارے ٹھیل کی طرف روانہ ہو گئے دونوں جنگلوں میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔

☆.....☆.....☆

ناگنی نے ایک پرنگی جہاز کے مالک ڈریک کے مال پر اور جہاز پر فوکرسی کر لی تھی اور جہاز سمندر میں پہنچنے کی ایک بندرگاہ کی طرف سفر کر رہا تھا ناگنی کے ارے میں جہاز کے مالک ڈریک کو صرف اتنا ہی علم تھا کہ وہ ایک بے کار لڑکی ہے جسے اس نے ترس کھا کر اپنے جہاز پر فوکرسی کر رکھا تھا جہاز یاد بان کھولے ہوا میں اپنی منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا ناگنی کے دل میں بس

ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح وہ پرنگل سے اسپین پہنچ جائے اور شاہان کا سراغ لگائے۔

اچانک اس رات موسم بہت خراب ہو گیا طوفانی ہوائیں چلنے لگیں مگر ڈریک کا جہاز بڑا مضبوط تھا وہ طوفانی موجوں میں بھی سفر کرتا رہا۔ لیکن صبح ہوئی تو ایک قیامت اس جہاز کا انتظار کر رہی تھی جہاز کا ٹکڑ ٹکڑ کیا۔ اور اس کا سمت دکھانے والا آلہ طوفان کی نذر ہو گیا اب جہاز یہی کر سکتا تھا جس طرح بھی ہو سکے واپس چلا جائے ناگنی واپس نہیں جانا چاہتی تھی ڈریک نے اعلان کر دیا کہ جہاز واپس جائے گا۔

ناگنی نے کہا۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

ڈریک بولا۔ ”پھر تمہیں سمندر میں اترنا ہوگا کیونکہ میں تمہارے لئے اپنا جہاز نہیں کر سکتا۔“

ناگنی کو ڈریک پر بڑا غصہ آیا اور کہنے لگی۔ ”میں اتروں نہیں بلکہ اڑ جاؤں گی۔“ تو ڈریک نے زور سے ناگنی کے کندھے پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

”ڈراؤ کر ڈو دکھاؤ۔“

ناگنی نے کہا۔ ”میں اڑ کر واپس نہیں آؤں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم جہاز کو آگے نہیں لے جاؤ گے۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ یہاں سے اسپین کتنی دور ہے۔“

ڈریک یہیں سمجھ رہا تھا کہ ناگنی اس سے مذاق کر رہی ہے اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اسپین یہاں سے ایک ہزار میل مغرب کی طرف ہے اچھا تو اب اڑ کر ڈو دکھاؤ۔“

ناگنی نے ایک گہرا سانس لیا اس کے ساتھ ہی وہ سفید رنگ کا باز بن گئی اور پروں کو پھر پھڑا کر جہاز کے عرشے پر سے اڑ گئی ڈریک اور دوسرے ملازم منہ کھلے اسے دیکھتے ہی رہ گئے ناگنی نے اڑتے اڑتے جہاز کے اوپر ایک گول چکر لگایا۔ اور پھر ایک غوطہ لگا کر جیسے جہاز کے ملاحوں کو سلامی دی اور سمندر پر مغرب کی طرف اڑنا شروع کر دیا یہ وہ منظر تھا جو سمندری ملاحوں نے کبھی نہ دیکھا تھا ناگنی سمندر سے کافی بلندی پر اڑی چلی جا رہی تھی



اس کا اپنا اندازہ بھی تھا کہ وہ مغرب کی طرف اڑ رہی ہے  
جدھر اکبٹن ہے۔

اڑتے اڑتے اسے شام ہو گئی تو آسمان پر ایک  
بار پھر کالی گھٹائیں اُڑ آئی اور بڑی تیز ہوائیں چلنے لگیں  
تھوڑی ہی دیر میں آندھی نے طوفان کی شکل اختیار کر لی  
ہوا کے تھیزوں نے ناگنی کو سمندر کے اوپر پھینک دیا اس  
کے پر بھیگ گئے اب وہ بازمین کرئیں اڑ سکتی تھی اس نے  
فوراً سانپ کی شکل بنائی اور سمندری لہروں پر تیرنا شروع  
کر دیا بڑی بڑی لہروں میں تیر کی طرح تیرتی چلی جا رہی  
تھی سمندر میں آ کر اسے سمت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا  
جونہی وہ سمندر میں آئی اس کے پرانے دوست سامی شیش  
ناگ یعنی چومند والے بڑے اڑوہ نے اس کی بوسگھ  
لی تھی وہ بھی سمندر میں ہی تھا بوکے تعاقب میں وہ ناگنی  
کے پاس آ کر سمندر سے باہر نکل آیا ناگنی نے اپنے  
پرانے دوست شیش ناگ کو دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔

شیش ناگ نے ناگنی کو اپنے سر پر بیٹھالیا  
اور کہا۔ ”مجھے تمہارا بھائی شریم ملا تھا۔“

ناگنی نے چونک کر پوچھا۔ ”کہاں.....؟“ اس  
کے بعد شیش ناگ نے اسے ساری کہانی بیان کر دی اس  
نے ناگنی کو یہ بھی بتایا کہ شریم سمندری طوفان میں پھنس  
گیا تھا اور اس نے اسے نکال کر ہندوستان کے ساحل  
پر پہنچا دیا ہے۔

”کیا راج کماری اس کے ساتھ تھی۔“ ناگنی  
نے پوچھا۔

اڑوہانے کہا۔ ”ہاں وہ اس کے ساتھ تھی اب وہ  
دونوں ہندوستان کے جنگلوں میں سفر کر رہے  
ہیں۔“ اڑوہانے ناگنی کو یہ بھی بتایا کہ ”شریم اور راج  
کماری کو اس کے باپ کی ریاست میں پہنچانے کے  
بعد اکبٹن میں شاہان کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا ناگنی  
نے پوچھا۔

”کیا شریم نے شاہان کے بارے میں کوئی اور  
بھی بات کی تھی؟“

”نہیں بس اتنا کہا تھا کہ اسے شاہان کی کوئی

خبر نہیں ہے۔“ ناگنی نے اڑوہانے اکبٹن کے ساحل کے  
بارے میں پوچھا۔

اڑوہا کو اکبٹن کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔  
ساری رات دونوں پرانے دوست سمندر میں سفر  
کرتے رہے۔ دن نکلا تو انہیں دور ایک پہاڑی سمندر  
سے ابھری ہوئی دکھائی دی اس پہاڑی کے اوپر ایک پرانا  
محل سا بنا تھا جس کے گول گول کنبہ بھی تھے ناگنی نے  
اڑوہانے پوچھا۔ ”یہ پر اسرار محل کس کا ہے؟“

اڑوہانے کہا۔ ”وہ کبھی ادھر نہیں آیا خدا جانے  
کس کا محل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دیران ہوگا کیونکہ اس  
پہاڑی پر کوئی انسان نہیں رہ سکتا۔“

”تمہارا خیال درست نکلتا ہے۔“  
وہ پہاڑی پر پہنچ گئے اڑوہا کو وہاں بھی جانا تھا  
کیونکہ وہ اپنے علاقے سے ہزاروں میل دور نکل آیا تھا  
اس نے ناگنی سے واپس جانے کی اجازت مانگی تو ناگنی  
نے بڑی خوشی سے اجازت دے دی اور کہا۔

”اچھا خدا حافظ پھر ملیں گے۔“ اڑوہا ناگنی  
کو سلام کر کے پھر سے سمندر میں اتر گیا۔

اس کی پہاڑی کے پاس ناگنی اکیلی رہ گئی وہ  
ابھی تک سانپ کی شکل میں تھی اس کے دل میں خیال آیا  
کہ وہ پھر سے انسان بن جائے مگر یہ سوچ کس نے ارادہ  
بدل دیا۔ کہ اسے سانپ کی شکل میں ہی اوپر والے محل  
کا جائزہ لینا چاہئے کہ اس محل میں کون کون سے لوگ رہتے  
ہیں ناگنی نے اوپر جاتی بیڑھیاں چڑھتی شروع کر دی۔

وہ بیڑھوں کے ساتھ بنی ہوئی ہے بے حد پختہ  
پتھر کی دیوار پر چڑھتی ہوئی اوپر چلی جا رہی تھی جب وہ  
پہاڑی کا پورا چکر کاٹ چکی تو سامنے محل کا وہ ہی دروازہ  
آ گیا جس کے اندر شاہان جا کر نقاب پوش جاوہر گروں کی  
قید میں پھنس گیا تھا۔

ناگنی دروازے پر دیک کر چڑھ گئی دروازہ بند تھا  
اور کوئی سوراخ بھی نہیں تھا جس کی مدد سے وہ محل کے اندر  
داخل ہو سکتی محل کے آخری منزل کافی اونچی تھی ناگنی نے  
سوچا کہ پہلی منزل سے ہی محل میں داخل ہونا چاہئے۔ وہ

دروازے سے اتر کر نیچے آ گئی۔ نقاب پوش کا جہاز  
در میں اب نہیں کھڑا تھا وہ کہیں چلا گیا تھا اس نے  
نے آواز سنی یہ آواز دروازہ کھلنے کی تھی جیسے اندر سے  
دروازہ کھول رہا ہوں، وہ جلدی سے ایک خشک  
زمین کے پیچھے چھپ گئی۔

محل کا بڑا دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا اور اندر  
وہ نقاب پوش ایک تابوت کو لے کر باہر نکلے اس قسم  
کی تابوت میں لاش رکھی ہوتی ہے ناگنی نے سوچا شاید یہ  
پوش اس خطے میں رہتے ہیں اور کسی مردے کو سمندر  
تھکنے جا رہے ہیں وہ انہیں غور سے دیکھنے لگی نقاب  
پوش کی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر جانے والی گول  
سیاں چڑھنے لگے ناگنی نے محل کے اندر جانے کی کوئی  
گنجائش نہ کی بلکہ یہ سوچا کہ پہلے ان لوگوں کے بارے میں  
لوم کرنا چاہئے کہ یہ کون ہیں اور تابوت اٹھا کر کہاں لے  
جائے ہیں۔

نقاب پوش محل کی سب سے اوپر والی منزل  
گئے یہاں پہنچ کر انہوں نے تابوت کو گنبد کے نیچے سیاہ  
لڑکے بڑے چوڑے پر رکھا اور واپس چلے گئے ناگنی  
تابوت کی لاش سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی بلکہ وہ ان نقاب  
پوش کا پتہ چلانا چاہتی تھی کہ وہ کون لوگ ہیں اور دروازہ  
بند کر کے اس خطرناک اور دیران جزیرے میں کیا  
رہے ہیں اس محل کا راز کیا ہے؟

نقاب پوش آگے آگے جا رہے تھے اور ناگنی  
اس کی شکل میں رہتی ہوئی ان کے پیچھے پیچھے جا رہی  
تھی محل کے دروازے میں سے گزر کر یہ لوگ محل کے باغ  
آ گئے یہاں دیواروں پر لمبی سیلیں چڑھی ہوئی تھیں وہ  
ایک ڈیوڑھی میں سے نکل کر سرنگ سے باہر نکل آئے  
ان کے پیچھے پیچھے تھی۔

دونوں نقاب پوش تہ خانے میں آ گئے یہی وہ تہہ  
تھا جس کے کنوئیں میں شاہان کئی روز سے گرا ہوا تھا  
باہر نکلنے کا اسے راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کنوئیں کے پاس ایک چوڑا تھا اس چوڑے پر  
یہ نقاب پوش اس تابوت کو اٹھا کر لے گئے تھے جس

کے اندر عمارہ بے ہوش تھی اور جسے شاہان نے اکبٹن  
پہنچایا تھا ناگنی کو بھی کچھ خبر نہیں تھی کہ شاہان کنوئیں میں پڑا  
ہے نقاب پوش چوڑے پر کوئی منتر پڑھ کر اگر تھی جلا کر  
واپس چلے گئے۔

اس کے ساتھ ہی ناگنی نے محسوس کیا کہ وہاں  
شاہان کی خوشبو آ رہی ہے وہ چونکا ہو گئی ادھر کنوئیں میں  
گرے ہوئے شاہان کو بھی ناگنی کی بو محسوس ہوئی وہ  
سر جھٹک کر ہوشیار ہو کر پتہ کیا وہ اپنی پوری آواز سے بولا۔

”اوپر کون ہے ناگنی کیا تم ہو؟“

ناگنی نے شاہان کی آواز سنی تو جلدی سے کنوئیں کی  
منڈیر پر آ کر اپنا سر نیچے کر کے جھانکا۔ اندھیرے میں  
اسے شاہان پتھروں پر پے بس و مجبوری کی حالت میں پڑا  
اسے صاف نظر آ گیا۔ اس نے اوپر سے ہی آواز دی۔

”شاہان بھائی میں ہونا گئی تم یہاں کیا  
کر رہے ہو؟“  
شاہان نے کہا۔ ”وہ جو میں اس قسم کے کنوئیں میں  
گرنے کے بعد کڑک رہا ہوں یعنی یہاں سے نکلنے کی  
کوشش کر رہا ہوں اور ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہوا۔“  
ناگنی نے کہا۔ ”فکر نہ کرو میں تمہاری  
مدد کروں گی۔“ ناگنی نے ایک دم سے شکل اختیار کی کنوئیں  
میں ایک بار پھر جھک کر انسانی آواز میں شاہان کو کھلی دی  
اور کہا۔

”میں اپنا آپ ری بن کر نیچے پھینک رہی ہوں  
اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کرنا۔“ ناگنی نے گہرا  
سانس لیا وہ اس دفعہ ایک لمبا اور سرخ سانپ بن گئی جو ری  
جتنا موتا تھا اس نے خود کو کنوئیں کے باہر رکھا اور باقی سارا  
دھڑکی کی طرح کنوئیں کے اندر لٹکا دیا۔

شاہان نے ناگنی کی دم کو جلدی سے پکڑ لیا اور اوپر  
چڑھنا شروع کر دیا شاہان جب کنوئیں سے باہر آیا تو اس  
نے خدا کا شکر ادا کیا دونوں نے ایک دوسرے کو جلدی  
جلدی اپنی داستان سادی ناگنی نے شاہان کو بتایا۔

”شریم راج کماری کو لے کر ہندوستان کے  
جنگلوں میں سفر کر رہا ہے یہ بات مجھے اڑوہانے بتائی تھی

اور خیال یہ ہے کہ وہ وہاں سے اسٹین آنے کا ارادہ رکھتا ہے۔“

مشاہد نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں شریعہ کی مدد کرنی چاہئے کیونکہ وہ اکیلا ہے۔“

نانسی نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔“

نظر نہیں آ رہا تھا ناگنی چونکہ سانس کی شکل میں تھی۔ اس لئے وہ اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی اس نے دیکھا کہ سانسے پتھر کی بڑی مضبوط دیوار آن گری ہے اور وہ میڑھیوں پر قید ہو کر رہ گئے تھے۔ اس نے شاہان سے کہا ان لوگوں کو شاید یہ چل گیا ہے۔

”جادوگر مجھے معاف کر دے۔ میں تو اس محل کی گردنے آ گیا تھا میں بے قصور ہوں۔“ شاہان چاہتا تھا کہ آپ کو جادوگر کے حوالے کر دے تاکہ نامی کی جان بچے اور اس کے بعد وہ سوچ کر اس پر اسرار محل سے نکلنے کی کوشش کریں گے۔

گردن پر ڈس دیا ابھی وہ نقاب پوش سیکینڈے جی نہ جایا تھا کہ سانپ اچھل کر دوسرے نقاب پوش کی گردن پر گرا اور اس کی گردن پر بھی ڈس لیا اس سانپ کا زہر بہت تیز تھا، دوڑوں نقاب پوش زمین پر گرے اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر دونوں کے جسم پھٹ گئے۔

ناگنی شاہان کی جیب سے نکل کر باہر آگئی اور اس

پھر ناگنی کچھ سوچ کر بولی۔ ”مگر غصہ میرا خیال ہے کہ مجھے انسان کی شکل میں نہیں جانا چاہئے۔ میں سانپ بن کر تمہارے ساتھ جاتی ہوں۔“ ناگنی سانپ بن گئی چھوٹا سانپ اور ایک کبوتر آنکھوں والا بڑا ہی زہریلا سانپ، شاہان نے ناگنی کو اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا ناگنی نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اگر خطرہ ہو تو وہ اسے کسی طرح زمین پر چھوڑ دے۔

شاہان نے تہہ خانے سے نکل کر محل کی اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر ایک نقاب پوش پہرے دے رہا تھا ناگنی نے شاہان کی جیب میں سے سر نکال کر کہا۔

”شاہان تم مجھے اسی جگہ چھوڑ دو میں اس پہرے دار کو راستے سے ہٹاؤں۔“

ناگنی سانپ کی شکل میں شاہان کی جیب سے نکل کر سیڑھی کی دیوار پر رینگتی ہوئی دروازے کے پاس چلی گئی نقاب پوش پہرے دار کے ہاتھ میں تلوار تھی اور وہ ہل کر پہرے دے رہا تھا کیونکہ وہ سامنے بارہ دری تھی جس کے اندر عمارہ کا تابوت رکھا تھا نقاب پوش پہرے دار نے سانپ کو نہیں دیکھا تھا وہ پہرے دے رہا تھا۔

رات کا آخری پہرہ تھا آسان پرستاروں کی چمک چمکی پر زریں تھی کیونکہ چمک ہونے والی تھی ناگنی آخری سیڑھی پر سے رینگ کر سامنے والی دیوار کی طرف جانے لگی تو نقاب پوش کی نظر اس پر پڑ گئی اس نے بجلی کی تیزی کے ساتھ جھٹک کر سانپ پر تلوار پھینک دی۔

ناگنی کا خیال کیا بلکہ یقین تھا کہ وہ سامنے والی دیوار پر پہنچ جائے گی اس دیوار سے وہ اس پہرے دار پر حملہ کرنا چاہتی تھی مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ایک ہزار سال بعد ناگنی پر ایسی آفت دوسری بار پڑ گئی تھی۔

جسم کے ٹکڑے ہو جائیں اور میں مر جاؤں تو اسے ہمالیہ پہاڑ کی ترانی میں ناگ مندر کے تالاب میں لے جا کر ڈال دینا تو میرا شرم و بارہ زندہ ہو جائے گا۔

ناگنی نے بے ہوش ہوتے ہوئے ایک عقل مند کی بات کی کہ جب جسم پر تلوار پڑی اور جسم دو ٹکڑے ہو گیا تو اس نے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو نیڑے جیوں پر لٹھ کا دیا تاکہ وہ واپس سیدھا شاہان کے پاس پہنچ جائے کیونکہ خطرہ تھا کہ نقاب پوش پہرے دار اس کے جسم پر تلوار مار مار کر قیدہ بندہ نہ کرے ایسی حالت میں ناگنی کا پھر سے زندہ ہونا بڑا مشکل تھا۔

شاہان سیڑھیوں پر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور پہرے دار کو دیکھنے لگا ناگنی اسے ڈسے گی اور وہ مر جائے گا لیکن شاہان نے دیکھا کہ نقاب پوش پہرے دار نے زور سے تلوار چمکی اور اس کے ساتھ ہی پہرے دار کی بجائے سانپ کے دو ٹکڑے لڑھکتے ہوئے اس کے قدموں میں آئے گئے شاہان کی تو جان ہی نکل گئی یہ ناگنی کے جسم کے ٹکڑے تھے یہ کیا ہو گیا کیسے ہو گیا شاہان کا دماغ چمکانے لگا اس نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سمجھا لیا اور جلدی سے ناگنی کے جسم کے دو ٹکڑے ٹکڑے جو سانپ کی شکل میں تھے اٹھائے اور رومال میں لپیٹ کر جیب میں رکھ لئے اور اوپر چڑھنے لگا۔

اب وہ نقاب پوش پہرے دار سے سب سے پہلے ناگنی کے قتل کا انتقام لینا چاہتا تھا وہ اوپر چل کی چوٹ پر آ گیا پہرے دار نقاب پوش نے شاہان کو اپنے سامنے دیکھا تو تلوار اٹھا کر اس پر حملہ کر دیا یہ بھی اچھا ہوا تھا کہ اس نے چیخ نہیں ماری تھی ورنہ سارے نقاب پوش ہوشیار ہو جاتے اور پھر عمارہ کو وہاں سے نکال لے ہا مشکل ہو جاتا۔

شاہان نے بڑے آرام سے نقاب پوش پہرے دار کے ہاتھ سے تلوار چھین کر اسے اپنے ہاتھ میں تمام کیا نقاب پوش نے خنجر نکال لیا اور ایک کر شاہان کے سینے میں گھونپ دیا شاہان نے خنجر چھین کر محل سے نیچے ٹھہریں مارتے ہوئے سمندر میں پھینک دیا شاہان نے نقاب پوش

بے دار کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کیونکہ اب خطرہ تھا کہ وہ لڑ کر اپنے ساتھیوں کو بلا سکتا تھا نقاب پوش نے شاہان گردن کو بوج کر دیا نا شروع کر دیا۔

شاہان کو بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ یہ تو ایسے ہی بات تھی گوئی آدمی پتھر کے ستون کو دوڑوں ہاتھوں سے پکڑ کر شروع کر دے۔ شاہان نے نقاب پوش کو نیچے گرا کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اب وہ آواز نہیں نکال رہا تھا شاہان نے اس کا نقاب اتار دیا۔ وہ کانپ گیا اس ناگنہ نقاب تھی تاکہ کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا ہاتھوں میں گہرے گڑھے تھے ان گڑھوں میں ٹوٹے چھوٹے ڈیلے حرکت کر رہے تھے۔ شاہان نے بے دار کے منہ میں پتھر اٹھوٹھوٹ دیا۔ تاکہ آواز پیدا نہ پھر اس نے خنجر سے پہرے دار کی دوڑوں میں نکال کر باہر پھینک دیں اس کے بعد شاہان نے نقاب پوش کی ہڈی رگ کاٹ ڈالی اس کے جسم سے خون کی لہلا پانی باہر نکلنے لگا اسے سانپ کی بات یاد آگئی کہ یہ بڑی مخلوق تھی شاید اس لئے ان کی رگوں میں رگ کا پانی گردش کر رہا تھا نقاب پوش پہرے دار کی جان بچ گئی تھی۔

شاہان کا جوش انتقام ابھی بھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا اس پہرے دار کی لاش کو اٹھا کر محل سے نیچے سمندری لاش میں پھینک دی تو کیلی چنانوں پر گرتے ہی لاش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سمندر میں گر پڑے۔ شاہان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تھا اس کے بہترین دوست ساتھی ناگنی کی لاش کی شکل میں اس کے جسم کے دو ٹکڑے اس کی جیب میں تھے سامنے بارہ دری میں عمارہ کا تابوت تھا۔

شاہان نے آگے بڑھ کر تابوت کو کھولا اس کے اندر بے ہوش بڑی تھی شاہان عمارہ کے بے ہوش جسم کو اٹھا کر کھڑے پڑا اور سیڑھیاں اتر کر محل کی پہلی سیڑھی پر گیا یہاں خاموشی تھی رات کا چھپلا پہرے ہونے کی سبب شاید نقاب پوش سو رہے تھے۔ شاہان کے لئے یہ موقع تھا وہ اپنے ہاتھ میں شاہان تخت پیش کی حالت میں تھا اپنے فیصلہ کر رہا تھا کہ جو کوئی بھی اس کے سامنے آیا وہ

اسے اڑا کر رکھ دے گا۔ چاہے عمارہ اور ناگنی کی زندگیاں خطرے میں کیوں نہ پڑ جائیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اسے محل کی ڈیوڑھی تنک کوئی نہ ملا ورنہ یہ بات ناگنی اور عمارہ کے لئے سخت خطرناک ہو سکتی تھی ڈیوڑھی میں ایک لمبے چل رہا تھا اس کی روشنی میں شاہان نے دیکھا۔

ایک نقاب پوش کو پہرے دیتے ہوئے جو تخت کے پاس کھڑا تھا وہیں لمبا نیزہ پکڑے پہرے دے رہا تھا۔ شاہان نے بے ہوش عمارہ کو دیوار کے ساتھ زمین پر اندھیرے میں لٹا دیا اور خود دیوار کے سائے میں آگے بڑھا نقاب پوش کو آہٹ سی محسوس ہوئی اس نے نیزہ سیدھا کر دیا اور پوچھا کون ہے شاہان نے اسی زبان میں کہا۔ تمہارا باپ اصل میں شاہان تخت غضب ناک ہو چکا تھا ناگنی کے قتل ہو جانے پر اسے اس قدر دکھ ہوا تھا کہ وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا نقاب پوش نے جب یہ لفظ سنے تو نیزہ لہراتا اسے حملہ کرنے کے انداز میں جھکا تا آگے بڑھا۔ شاہان اندھیرے سے باہر نکل آیا اس نے کہا۔

”آؤ میرے شکار میں تمہاری گردن توڑ کر اس کی گیند بنادوں گا۔“

”پہرے دار نے چلا کر کہا۔“ کون ہو تم بد بخت جو موت کو آوازیں دے رہا ہے۔“

شاہان نے کہا۔ ”میں خود موت ہوں تمہاری۔“ اور شاہان نے چلا جھٹک لگا کر نقاب پوش کی کمر کے گرد دوڑوں ہاتھ ڈال کر اسے اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ اس کی کمر کی ہڈی کڑکڑا کے چھ سات جگہوں سے ٹوٹ گئی اور وہ شاہان کے بازوؤں میں یوں جھومنے لگا جیسے کوئی سے لپکتی ہوئی کوئی ٹھری ہو۔ شاہان نے اسے زمین پر لٹا دیا اور نیزہ اس کے سینے میں گاڑ دیا۔

پھر وہ عمارہ کو اٹھا کر محل کی ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا۔ باہر سمندر اس کے سامنے کافی نیچے ٹھہریں مار رہا تھا دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا بادبانی جہاز وہاں سے خدا جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

شاہان نے پہاڑی سے اترنا شروع کر دیا



چکر کھاتی گول سڑک پر سے ہو کر وہ سمندر کے کنارے چٹانوں کے پاس آیا تو اسے ایک کشتی دکھائی دی جسے ریت میں کھینچ کر ایک پتھر سے باندھا گیا تھا شاہان نے عمارہ کو کشتی میں لٹا دیا اور وہی کو ہاتھ کے ایک جھکے سے ہی توڑ ڈالا کشتی سمیٹ کر اس نے سمندر میں ڈالی اور چوچلا نے لگا پھاڑ کے ارد گرد سمندر میں بڑی بڑی لہریں اٹھ رہی تھیں مگر سمندر آگے جا کر پرسکون ہو گیا تھا شاہان کشتی کو چلا رہا تھا اس کے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کچھ دور تک اسے پہاڑی کے اوپر محل کا سنہری گنبد دکھائی دیتا رہا پھر وہ پہاڑی سمیت نظروں سے اوجھل ہو گیا شاہان کی کشتی اب کھلے سمندر میں تھی وہ سورج کے حساب سے مغرب کی طرف کشتی چلا رہا تھا کیونکہ اندلس کا ملک وہاں سے مغرب کی طرف ہی تھا۔ اس کے سامنے اب دو اہم کام تھے ایک تو عمارہ کو اندلس میں اس کے ماں باپ کے پاس پہنچانا تھا۔ اور دوسرا جو سب سے بڑا کام تھا جس کے بارے میں شاہان بہت زیادہ پریشان تھا۔ وہ ناگنی کو لے کر ہمالیہ کی چوٹی پر موجود جیل پر جانے کا تھا جہاں ناگنی کو صندل کی لکڑی کی صندوقچی میں بند کر کے جیل کے عظیم انسان ناگ مندر کے تالاب میں ڈالنا تھا۔

شاہان نے عمارہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس کے منہ پر پانی کے بار بار جھینے مارے آخر وہ ہوش میں آ گئی۔ اس نے چونک کر شاہان کو دیکھا اور پوچھا۔

”شاہان بھائی ہم کہاں ہیں۔“ شاہان نے اسے ساری کہانی بیان کی اور پھر جب کے اندر سے ناگنی کے جسم کے دونوں گلوے نکل کر دکھائے، عمارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ناگنی کی لاش اس سے نہ دیکھی گئی۔

”اب اس کا کیا بنے گا شاہان بھائی؟“ عمارہ نے پوچھا۔

شاہان نے کہا۔ ”میں جہیں تمہارے گھر چھوڑ کر ناگنی کی لاش لے کر ہمالیہ کی طرف نکل جاؤں گا وہاں اس کا علاج ہوگا اور خدا نے جاپا تو اسے پھر سے زندگی مل جائے گی۔“

کشتی نامعلوم سمندر میں چل رہی تھی اب لہریں

اسے اپنے آپ مغرب کی طرف بہائے لئے جاری تھی شاہان کو سب سے زیادہ اب اس بات کی پریشانی تھی کہ عمارہ کے کھانے اور پینے کا کیا بندوبست ہوگا اور کچھ نہیں تو کم از کم اسے پینے کے لئے پانی تو ملنا چاہئے مگر اس بڑے سمندر میں بھی پینے کے لئے پانی کا ایک قطرہ تک نہیں تھا اس لئے کہ سمندر کا پانی کڑوا ہوتا ہے اگر انسان پی لے تو اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔

دو پہر کو عمارہ نے کہا۔ ”اسے سخت پیاس لگی ہے۔ شاہان اسے کیا جواب دیتا وہاں پانی کہاں سے لاتا آسان پر بندہ تک دکھائی نہ دیتا تھا چھلیاں بھی کشتی کے قریب بھی نظر نہیں آتی تھیں شاہان نے کہا۔

”عمارہ بہن پانی کے لئے جہیں تھوڑا صبر کرنا پڑے گا شاید کوئی جزیرہ آ جائے اور وہاں پانی ملے ساتھ ساتھ ہمیں کھانے کو بھی سمجھل جائے۔“

لیکن جزیرہ تو نہ ملا وہاں دور شاہان کو ایک چٹان کی سمندر میں ابھری ہوئی دکھائی دی۔

شاہان نے کہا۔ ”شاید یہ کوئی پہاڑی ہے جو سمندر سے باہر نکل آئی ہے اس قسم کے پہاڑ سمندر کے نیچے اکٹڑ ملتے ہیں جن کی چوٹیاں سمندر سے باہر نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔

دو پہر ڈھل رہی تھی عمارہ کا پیاس کے مارے برا حال ہو رہا تھا کہ شاہان نے اس چٹان کے ساتھ کشتی لگا دی شاہان اور عمارہ کشتی سے اتر آئے یہ چٹان کافی بڑی تھی اور اس کے ارد گرد کافی بڑے بڑے پتھر بکھرے ہوئے تھے شاہان نے عمارہ کو ایک طرف بیٹھا اور خود اوپر ادرہ ادرہ جا کر پانی کی تلاش کرنے لگا عمارہ کی خوش قسمتی تھی کہ ایک جگہ شاہان کو چٹان کے اندر سے قطرہ قطرہ پانی پتھروں میں جمع ہو رہا تھا وہاں ایک چھوٹا سا چشمہ بن گیا تھا پانی بیٹھا تھا عمارہ نے اپنی پیاس بجھائی اور خدا کا شکر ادا کیا شاہان نے کہا کہ اس جگہ ہمیں رات میں آرام کرنا چاہئے عمارہ کو بھوک بھی لگ رہی تھی وہ بولی۔

”یہاں رکنے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم سمندر میں ہی نکل چلیں شاید آدھی رات کو کسی جزیرے پر پہنچ

شاہان نے کہا۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔“ عمارہ کشتی میں بیٹھ گئی شاہان کشتی کو چٹان سے دور لے جانے لگا تھا کہ اچانک اس کی نظر دور اس طرف سمندر میں لپکتا جہر سورج غروب ہو رہا تھا اور سمندر سرخ رہا تھا ادرہ ادرہ شاہان کو ایک کشتی چٹان کی طرف آتی نظر آئی یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں شاہان نے جیسے ہی اپنے باپ سے سوال کیا عمارہ ادرہ ہی دیکھ رہی تھی سورج کی رخی روشنی میں انہیں کشتی میں تین چار آدمیوں کے دکھائی دے رہے تھے۔

شاہان نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ یہ خوف ناک آدمی ہوں تم اس چٹان کے پیچھے پتھروں کی اوٹ میں چلی جاؤ۔“ شاہان کشتی کو چٹان کے پیچھے پتھروں کی اوٹ میں لپکتا جہر خود بھی عمارہ کے ساتھ ایک اونچے پتھر کے پیچھے چپ گیا۔ اور انے والی کشتی کو دیکھنے لگا۔

کشتی آہستہ آہستہ سمندر میں سفر کرتی چٹان کے باپ آ رہی تھی اب وہ بڑی آسانی سے دیکھ رہے تھے کہ کشتی میں تین ملاح سروں پر سرخ رومال باندھے کھڑے ان کے ہاتھ میں جگر جھجھ اور ایک آدمی کشتی میں کھائے بیٹھا تھا شاہان نے کہا کہ معاملہ خطرناک لگ رہا ہے عمارہ نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”کیا ہم بھاگ چلیں۔“

کشتی چٹان کے پاس آ کر رک گئی تینوں ڈاکو کی نظر آ رہے تھے، کشتی میں ایک شخص بندھا پڑا تھا، ان نے ہماری بھرم کر لی تھی چہرے والے قیدی کی آنکھوں کو ایک ملاح نے کہا۔

”جاؤ اور اس چٹان پر بھوکے پیاسے رہ کر موت کا مار کرو۔ تمہاری بھئی سزا ہے کہ تم سسک سسک کرو۔“ اور پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے قیدی کو چٹان کی کشتی میں پیشہ کرواہیں روانہ ہو گئے۔

قیدی نے ایک نظر سمندری چٹان کو اوپر سے نیچے دیکھا پھر سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ کیونکہ یہاں اسے موت صاف نظر آ رہی تھی جب ڈاکو ملاحوں کی کشتی

سمندر میں کافی دور نکل گئی تو شاہان نے عمارہ کو ساتھ لیا اور جلاوطن قیدی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا ایک بار تو قیدی چونک کر پیچھے ہو گیا اور گرتے گرتے بجھا اسے کبھی یہ خیال نہیں آ سکتا تھا کہ اس قسم کی دیران جگہ پر بھی ایک آدمی اور ایک عورت اسے مل سکتے تھے۔ اس نے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا۔

”تم..... تم کون لوگ ہو۔“ وہ ہسپانوی زبان بول رہا تھا عمارہ چونکہ ہسپانوی جانتی تھی اس لئے وہ بڑی خوش ہوئی کہ اسے اپنے وطن کا آدمی مل گیا ہے اس نے بھی ہسپانوی زبان میں کہا کہ وہ اور شاہان بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچے ہیں اور وہ آئین اپنے ماں باپ کے پاس جارہی ہے جو میڈرڈ میں تجارت کرتے ہیں۔ شاہان بھی یہ زبان سمجھتا تھا جلاوطن قیدی عمارہ سے مل کر بہت خوش ہوا۔

شاہان نے پوچھا۔ ”دوست تم کون ہوں تمہارا جرم کیا ہے اور یہ لوگ کون ہیں جو تمہیں یہاں مرنے کے لئے چھوڑ گئے ہیں؟“

جلاوطن قیدی بولا۔ ”میرا نام پیڈرو ہے میں ایک تجارتی جہاز کا کپتان ہوں یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ایک گنٹام جزیرہ ہے اس جزیرے پر میرا مال سے بھرا ہوا جہاز کھڑا ہے اور اس جہاز پر بحری ڈاکوؤں نے قبضہ کر لیا ہے انہوں نے میرے ساتوں کے سات ملاحوں کو مرنے والا دیا ہے اور مجھے مرنے کے لئے اس چٹان پر چھوڑ گئے ہیں۔“

شاہان نے پوچھا۔ ”بحری ڈاکوؤں کا جہاز کہاں ہے۔“

پیڈرو نے کہا۔ ”ان کا جہاز بھی اس جزیرے پر ہے وہ آج رات شاید وہاں پر رکیں گے اور کل میرے جہاز کا سارا سامان اپنے جہاز پر لا کر میرے جہاز کو آگ لگا کر چلے جائیں گے۔“

عمارہ بولی۔ ”شاہان بھائی ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے۔“

کپتان ہنس پڑا۔ ”تم لوگ خود میری طرح یہاں

پھنس گئے ہوتے میری کیا مدد کر سکو گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم آپس میں اچھی اچھی باتیں کر کے خدا کو یاد کریں اور صومٹ کا انتظار کریں۔“

شاہان مسکرایا۔ ”ہم جلاوطن نہیں ہیں کپتان ہمارے پاس ایک کشتی بھی ہے اور ہم تمہاری مدد بھی کر سکتے ہیں۔“

”کشتی بھی ہے کہاں ہے؟“ کپتان نے حیرانی سے پوچھا۔

”چٹان کے دوسری طرف کھڑی ہے۔“ شاہان نے اس کے جواب میں کپتان نے شاہان اور عمارہ کو گور سے دیکھا اور کہا۔

”تم لوگ یہاں کیسے آ گئے۔۔۔۔۔؟“

شاہان نے کہا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے مگر میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ میں عمارہ کو اس کے ماں باپ کے پاس انتہائی شہر چھوڑنے جا رہا ہوں ہمارا جہاز طوفان میں غرق ہو گیا تھا اور ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر اس چٹان پر پہنچ گئے۔“

کپتان کہنے لگا۔ ”یہ تو ٹھیک ہے مگر ہم دونوں مل کر خوشخوار سمندری ڈاکوؤں کا مقابلہ کیسے کریں گے ان کے جہاز پر دو توپیں بھی لگی ہوئی ہیں اور وہ پچاس ڈاکو ہیں ہر ایک کے پاس تیز دھار والے تیز اور تلواریں ہیں کپتان کے پاس تو ہر وقت بارود ہے پھر اہواپتول رہتا ہے۔“

شاہان ایک بار پھر مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”فکر نہ کرو خدا ہماری مدد کرے گا ہم اسی وقت یہاں سے چلے چلیں گے تاکہ رات ہونے تک جزیرے پر پہنچ جائیں۔“

”کیا تم جزیرے تک ہمیں سمندری راستہ بتا سکتے ہو۔“

”کیوں نہیں میں نے اس سمندر میں بہت سفر کیا ہے۔“

”تو پھر ہمارے ساتھ آؤ۔“ شاہان نے کپتان کو ساتھ لیا اور چٹان کے دوسری طرف لے جا کر کشتی دکھائی جسے ایک پتھر کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔

کپتان نے کہا۔ ”ہمارے پاس ہتھیار بھی نہیں

ہے ہم نیچے اتنے خوشخوار ڈاکوؤں کا کیسے مقابلہ کریں گے ہمیں ایک بار پھر اچھی طرح سوچ لینا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم تینوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ مجھے اس عورت کے مرنے کا بڑا افسوس ہوگا۔“ کپتان نے عمارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شاہان نے کہا۔ ”یہ سارا کام تم مجھ

چھوڑ دو کپتان۔“

”مگر تم اکیسے کیا کرو گے۔“

شاہان نے کہا۔ ”یہ تمہیں وہاں جا کر معلوم ہو جائے گا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔“

کپتان نے سر جھٹک دیا جیسے اسے شاہان کی بات پر محروم نہ ہو، مجبوراً وہ کشتی میں سوار ہو گیا شاہان نے کشتی کو سمندر میں ڈال دیا اور کشتی کا رخ کپتان کی ہدایت کے مطابق جزیرے کی طرف کر دیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ ان کی کشتی ایک چھوٹے سے گناہ اور ویران مگر سرسبز جزیرے کے قریب پہنچ گئی۔ کپتان بڑا ہی ماہر سمندری ملاح تھا وہ کشتی کو جزیرے کی پیچھے کی طرف لے آیا تھا تاکہ ڈاکوؤں کی اس پر نگاہ نہ پڑے سنہری دھوپ میں جزیرے کے درخت چمک رہے تھے سمندر کی ہوا ان کی شاخوں کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی جزیرے کا یہ ساحل بالکل ویران تھا نہ کوئی کشتی دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی آدمی نظر آ رہا تھا۔

کپتان نے کشتی کو ایک طرف جزیرے کی

جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑا کر دیا اور اسے اچھی طرح سے

باندھ دیا شاہان نے آہستہ سے کہا۔

”اس کشتی کی اب ہمیں ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ ہم واپس تمہارے جہاز پر جائیں گے۔“ کپتان پچھلی سی ہنسی بڑا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم باتو دو بوانے ہو یا پھر خواب میں باتیں کر رہے ہو۔“ شاہان بھی ہنس دیا۔

شاہان نے کہا۔ ”ہاں میں سچ سچ دیوانہ ہوں۔“

عمارہ بولی۔ ”اب آگے بھی چلو گے کہ یہاں

باتیں کرتے ہی رہ جاؤ گے۔“

شاہان نے کپتان سے کہا۔ ”تمہارا جہاز کس

طرف تھا کپتان نے بتایا کہ اس کا جہاز سمندری ڈاکوؤں کے جہاز کے ساتھ دوسری طرف کھڑا ہے۔“

شاہان نے کہا۔ ”ہمیں جزیرے کی دوسری

طرف جانا ہوگا۔“

”کیا تم نے یہ جزیرہ پہلے ہی دیکھا ہے۔“

”ہاں دوسرے دیکھا ہے مگر یہاں آج پہلی بار اس

طرف آیا ہوں۔ میں اس کے جنگلوں سے واقف نہیں

ہوں۔“

شاہان نے کہا۔ ”ہم جنگل میں سے نکل کر بالکل

اصل کے سامنے مغرب کی طرف بڑھیں گے جہاں

ہمارا جہاز کھڑا ہے۔“

عمارہ بولی۔ ”یہ راستہ زیادہ لمبا نہیں پڑے گا۔“

کپتان نے کہا۔ ”نہیں کیونکہ یہ جزیرہ زیادہ بڑا

اصل ہے اس کی کولانی زیادہ سے زیادہ چار میل ہے اس

باب سے ہمیں دو میل کا سفر طے کرنا ہوگا۔“

عمارہ نے کہا۔ ”رات ہونے سے پہلے پہلے ہمیں

ان پہنچ جانا چاہئے۔“

خیر عمارہ یہ تینوں جزیرے کے ساحل کے ساتھ

شمال مشرق کی طرف چل پڑے جزیرہ ہر اچھا تھا درختوں

مکھڑوں والی تیلیں چڑھی ہوئی تھیں یہاں جنگلی انگو بہت

اور ناریل کے درخت بھی کافی تھے عمارہ نے جنگلی

دھڑوں سے اپنا پیٹ بھرا اور زمین پر گرے ہوئے ناریل

کھانے لگا پانی پیاس بجھائی وہ آگے بڑھتے رہے تھے اور سورج

اب ہو رہا تھا جزیرے پر رات کے سائے چھانے لگے

آگے جا کر ساحل مغرب کی طرف گھوم گیا یہاں

دردی چٹانیں ساحل پر دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں

بڑے اور گہرے سبز رنگ کی چٹانیں تھیں جن پر کہیں

نیل جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں ابھی تک وہ ساحل کی ریت

پر رہے تھے جہاز نہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شاہان نے کپتان سے پوچھا۔ ”جہاز دکھائی

نہیں دے رہے۔“

کپتان نے سمندر کی طرف نگاہ بھا کر کہا۔ ”میرا

خیال ہے کہ ہمیں کچھ دور اور چلنا ہوگا ہو سکتا ہے کہ ایک

میل کا دور سفر باقی ہو۔“ وہ چلتے چلے جا رہے تھے اسی

طرح انہیں سفر کرتے کرتے رات ہو گئی۔

جہاز کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا عمارہ بے

حد تھک گئی آخر وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔ ”اب مجھ سے اور چلنا

نہیں جاتا۔“

شاہان نے کپتان سے کہا۔ ”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا

کہ تم عمارہ کے پاس بیٹھو اور میں آگے جا کر جہازوں کا پتا

کرو کیونکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سمندری ڈاکو کوچ کرنے

کی تیاری کر رہے ہوں ایسی صورت میں وہ تمہارے جہاز

کو آگ لگا دیں گے۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔“

”نہیں میں عمارہ کو اس ویران جزیرے کے جنگل

میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ شاہان نے کپتان

اور عمارہ کو پیچھے ایک جگہ جزیرے کے ساحل کے پاس

چٹان کی اوٹ میں چھوڑا اور خود آگے روانہ ہو گیا۔

رات کے وقت جزیرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا

اور ایسا خاموش اور سنسان تھا کہ دیکھ کر ڈر لگتا تھا شاہان کافی

دور آگے نکل گیا جزیرے کا ساحل ایک بار پھر گھوم گیا

یہاں پہنچ کر شاہان کو پہلی بار سمندر میں کھڑے دو جہازوں

کے خاکے دکھائی دیے۔ جن میں سے ایک جہاز میں

روشنی ہو رہی تھی شاہان کو بڑی خوشی ہوئی آخر وہ اپنی منزل

پر پہنچ گیا تھا۔ دوسرے جہاز کا صرف کالا کالا سایہ سا دکھائی

دے رہا تھا۔

شاہان تیز تیز چلنے لگا جب وہ جہازوں کے قریب

پہنچا تو جنگل کی طرف گھوم گیا یہاں درختوں کے درمیان

سے گزر کر وہ جنگل کے آخری کنارے پر آ کر کرک گیا

آگے ریت کا ساحل شروع ہوتا تھا پھر سمندر تھا۔ اور سمندر

میں دو جہاز کھڑے تھے۔

کنارے پر بیٹھے ڈاکو گھیس ہانک رہے تھے کوئی

لینا ہوا تھا اور کوئی کرتب دکھا رہا تھا اور ریت پر قلا بازی

لگا رہا تھا ان کے درمیان آگ جل رہی تھی جس پر وہ ایک

سالم بکرا بھون رہے تھے شاہان کو ان کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی دونوں جہازوں میں سے ایک مال بردار تھا اور اس کا مالک کپتان تھا دوسرا جہاز سمندری ڈاکوؤں کا تھا۔ شاہان غور کرنے لگا کہ جملہ کس طریقے سے اور کس طرح سے کیا جائے شاہان نے اندازہ لگایا کہ ڈاکو پچاس سے زیادہ ہے شاہان کو اس وقت ناگہانی بہت یاد آئی۔ جو وہ کھڑے ہو کر اس کی جیب میں رومال میں لپیٹی پڑی تھی اور جیسے دو مہینے کے اندر اندر ہمالیہ کے عظیم ناگ مندر میں لے کر جانا تھا۔

شاہان نے سوچا کہ شاید ابھی ڈاکوؤں نے دوسرے جہاز کا سامان اپنے جہاز پر نہیں لاد لیا تھا ہوسکتا تھا مال لاد لیا ہو اور اب سفر کرنے کے لئے صبح کا انتظار کر رہے ہوں۔ اس وقت اگر ناگہانی ہوتی تو ڈاکو جہاز کے اوپر جا کر پتہ لگا سکتی تھی کہ مال لاد لیا جا چکا ہے کہ نہیں۔ شاہان کو اتنی دور سے اندر سے میں کچھ پیشہ نہیں لگ رہا تھا شاہان واپس ہوا تا کہ کپتان کو جا کر خبر کر دے دوسری طرف شاہان کے جاتے ہی کپتان نے عمارہ سے کہا۔

”تم یہاں آرام کرو میں تمہارے لئے پانی کا پتہ کرتا ہوں۔“

عمارہ نے کہا۔ ”نہیں کپتان بھائی تم مت جاؤ مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔“

کپتان نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”ڈرنے کی بھلا کیا ضرورت ہے اس جزیرے پر تو کوئی بھی نہیں ہے اور پھر مجھے بھی سخت پیاس لگی ہے کہ میں بس ابھی آیا تھا۔“

عمارہ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اکیلے رہے لیکن کپتان کچھ ضدی اور نادان شخص تھا وہ عمارہ کو اکیلا چھوڑ کر جنگل میں پانی کی تلاش میں چلا گیا عمارہ کو ڈر لگنے لگا کیونکہ وہاں گھپ اندر جہاز تھا عمارہ بے چاری ایک پتھر کے پیچھے ہو کر سہی بھی بیٹھی تھی عمارہ نے شاہان کو یاد کیا کاش وہ جلد واپس آجائے۔ اتفاق سے دو سمندری ڈاکو بھی ادر پانی کی تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ پانی کا کھوج لگاتے ان چٹانوں کی طرف آگئے جس کے قریب ہی عمارہ چھپی ہوئی تھی۔

عمارہ نے بھی ستاروں کی ہلکی روشنی میں انہیں دیکھ لیا تھا اس کا سارا جسم خوف سے ٹھنڈا پڑ گیا وہ کپتان یا شاہان کو آواز دہی نہ دے سکتی تھی خطرہ تھا کہ ڈاکو اس کی طرف اس کی طرف نہ آجائیں۔ مگر ڈاکوؤں نے عمارہ کو اندر سے میں بھی چٹان کے پیچھے چھپے دیکھ لیا تھا وہ اسی جگہ رک گئے اور پھر رینگ رینگ کر عمارہ کی طرف بڑھنے لگے۔ عمارہ نے خبر پٹی تھی ڈاکو اس کے سامنے غائب ہو گئے تھے وہ یہ بھی کہ شاید وہ چلے گئے مگر اسے اپنا خبر تھی کہ دونوں سمندری ڈاکو اس کے پیچھے رینگتے ہوئے آ رہے ہیں۔

اچانک ایک ڈاکو اچھل کر عمارہ کے اوپر گر اور اس نے عمارہ کا منہ اپنے ہاتھ سے بند کر دیا دوسرے نے عمارہ کی گردن میں کپڑا ڈال کر کسنا شروع کر دیا عمارہ کا دم گھٹ گیا اس کی آنکھوں کے ارد گرد تارے ناچنے لگے اور وہ بے ہوش ہو گئی سمندری ڈاکوؤں نے عمارہ کو اٹھایا اور جنگل میں غائب ہو گئے اسحق کپتان کو چاہئے تھا کہ وہ عمارہ کو اکیلا چھوڑ کر نہ جاتا۔

شاہان واپس آیا تو عمارہ غائب تھی وہ بڑا پریشان ہوا اونچی آواز بھی نہیں نکال سکتا تھا ادر ادر اندر سے میں تلاش کیا مگر وہاں عمارہ ہوتی تو اسے ملتی اسے تو سمندری ڈاکو سیدھا اپنے جہاز پر لے گئے تھے اور اپنے سردار کے سامنے پیش کر دیا تھا عمارہ بے ہوش تھی سردار نے عمارہ کو غور سے دیکھا اور بڑا حیران ہوا کہ یہ عورت اس سنسان اور ویران جزیرے میں کہاں سے آئی اس نے غراتے ہوئے کہا یہاں ضرور اس کا کوئی ساتھی بھی ہوگا یہ عورت اکیلی اس جزیرے پر نہیں آ سکتی اس کا لباس بتاتا ہے کہ یہ شہر کی عورت ہے جنگل میں ہے جاؤں جہاں سے یہ عورت اٹھائی ہے وہاں اس کے ساتھی کو تلاش کرو اور اس کا سر کاٹ کر میرے سامنے پیش کرو۔“

”جو حکم سر کر اور دونوں سمندری ڈاکو خنجر لے کر واپس جنگل میں اس چٹان کی طرف چل پڑے۔ جہاں سے انہیں عمارہ لگی تھی دوسری طرف شاہان واپس آ گیا کپتان پریشانی کی حالت میں اسے ملا اور سارا

سنایا۔

شاہان نے قدرے غصے سے کہا۔ ”تمہیں کس کا کہا تھا کہ اسے اکیلے چھوڑ کر چلے جاؤ ضرور سمندری ڈاکو اسے پکڑ کر لے گئے ہوں گے۔“ کپتان نے ہنسوں سے ہونے کہا۔

”دوست شاہان میں اپنی غلطی مانتا ہوں مجھے لگ کر وہ ڈاکو اب عمارہ کو تلاش کرتے ہیں۔“

شاہان بولا۔ ”میں تمہارا اور سمندری ڈاکوؤں کا لڑکھ آیا ہوں ضرور عمارہ کو ڈاکو ان جہازوں کی طرف لے گئے ہوں گے۔“

کپتان بولا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس جزیرے کی جنگلی اسے اٹھا کر لے گیا ہوں، کیونکہ رات کے سمندری ڈاکو اس جنگل میں آنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“

شاہان سوچ میں پڑ گیا اور پھر کہنے لگا۔ ”تمہارا دل بھی درست ہو سکتا ہے لیکن میں دیر نہیں کرنی چاہئے آگے چلو۔“

اتنے میں انہیں پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی گھٹے پتوں پر چل رہا ہو۔

شاہان نے کپتان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور دیا۔

جیسے اسے پیٹھ پیٹ جانے کو کہہ رہا ہوں۔

کپتان وہیں گھاس پر بیٹھ گیا شاہان بھی ایک لڑی کے پیچھے چھپ گیا جزیرے کے اوپر چونکہ لڑی لکھ آیا تھا اس لئے چاندنی میں جھاڑیاں اور درخت اب نظر آ رہے تھے ان کے سامنے ایک چھوٹا سا کھلا میدان تھا جہاں جھاڑیوں کے جھنڈے تھے سامنے درختوں سے وہی دو سمندری ڈاکو ادر ادر تھکے احتیاط سے بڑھتے ہوئے باہر نکلے شاہان نے کپتان کے کان میں کچھ کہا۔

”تم نے سمندری ڈاکوؤں کو دیکھا ہوا ہے کیا یہ وہی لڑی جنگلی لوگ ہیں۔“

چاندنی میں کپتان نے انہیں غور سے دیکھا اور کہا۔ ”یہی سمندری ڈاکو ہیں۔“

شاہان بولا۔ ”یہی لوگ عمارہ کو لے گئے ہیں۔ عمارہ کو اذیت دے کر انہوں نے اس سے ہمارے بارے میں پوچھ لیا ہوگا اور اب یہ ہمیں یہاں پکڑنے آئے ہیں۔“

کپتان نے کہا۔ ”کہ اب کیا کریں ہم بہتے ہیں اور ان کے پاس خنجر ہیں۔“

شاہان نے آہستہ سے کپتان کا کندھا دبا کر کہا۔ ”اب یہ ہوگا کہ میں تمہیں ایک تماشہ دکھاؤں گا۔ تم یہاں آرام سے بیٹھ کر تماشہ دیکھو۔“

کپتان کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ شاہان کا مطلب کیا ہے اور وہ کس قسم کا تماشہ دکھانا چاہتا ہے شاید وہ مذاق کر رہا ہے مگر یہ مذاق کرنے کا وقت نہیں تھا۔

کپتان نے کہا۔ ”کیا تم مذاق کر رہے ہو۔“ لیکن شاہان آگے چاڑھا تھا وہ جھاڑیوں میں سے رینگتا ہوا سامنے والی چھوٹی سی جگہ میں آ گیا۔ ابھی تک وہ گھاس پر ہی رینگ رہا تھا چاندنی رات میں کپتان اسے گھاس پر رینگتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سمندری ڈاکو ابھی آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ شاہان کو تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی کہ ڈاکوؤں پر چھپ کر دیکھتا ہو جی ڈاکو ذرا قریب آئے شاہان اٹھ کر سامنے آ گیا ڈاکو ایک دم جھمکے کہ جس شکار کو وہ تلاش کرتے پھر رہے تھے وہ بھی ہے دونوں ڈاکو خنجر لہراتے ہوئے شاہان پر ٹوٹ پڑے وہ شاہان کو بڑا آسان شکار سمجھ رہے تھے اور بات بھی ایسی ہی تھی کیونکہ شاہان اکیلا اور نہ تھا ڈاکو وہ تھے اور خنجر ان کے ہاتھوں میں تھے۔

جس وقت ڈاکوؤں نے شاہان پر حملہ کیا تو کپتان کا دل ڈوب گیا اسے یقین تھا کہ شاہان ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں میں ہو چکا ہے اور اب اسے شاہان کی لاش اسی جنگل میں ڈاکوؤں کے جانے کے بعد دفن کرنی پڑے گی اسے شاہان سے بڑا افس ہو گیا تھا اور کپتان نہیں چاہتا تھا کہ اپنے دوست کی لاش گدھوں اور درندوں کے حوالے کرے اور واپس چلا جائے جھاڑی کے پیچھے چھپا کپتان بڑی بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ ڈاکوؤں نے شاہان کو نیچے



گرایا ہوا ہے اس پر خنجر کے وار کر رہے ہیں شاہان چاہتا تھا کہ ڈاکو اپنی حسرت نکال لیں مرنے کے بعد اس کی روجوں کو بچھتا دانہ رہے کہ انہوں نے شاہان پر وار نہیں کئے تھے ڈاکو اب کچھ کچھ حیران سے ہونے لگے تھے کیونکہ انہوں نے شاہان پر اتنے خنجر مارے تھے اس کا تو قیہ ہی ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہاں معاملہ بالکل الٹ تھا۔

شاہان بڑے آرام سے نیچے بڑا مسکرا رہا تھا جب دونوں ڈاکو تک گئے اور خنجر ان کے ہاتھوں کو زخمی کرتے ہوئے ٹوٹ گئے تو شاہان نے دونوں کے ہاتھ پکڑ لئے اور پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر اس نے دونوں کی گردنیں پکڑ کر پوری طاقت سے ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرائیے تھا کی آواز آئی اور دونوں کی کھوپڑیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں اور دماغ باہر نکل آئے شاہان اس کی لاشیں وہیں چھوڑ کر کپتان کی طرف واپس مڑا۔

کپتان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ایسا منظر اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا کہ شاہان کے اندر اس قدر طاقت ہوگی اسے معلوم نہیں تھا ابھی تک وہ یہی سمجھا تھا کہ شاہان نے نیچے پڑے پڑے ڈاکوؤں کے وار بچائے تھے اور پھر اپنی جسمانی طاقت کے بل بوتے پر دونوں کے سر ٹکرائیے ہلاک کر دیا تھا شاہان آیا تو کپتان نے کہا تمہارے جسم میں ایک ریبوٹ جیسی طاقت کہاں سے آگئی تم تو ایک دبے پتلے نوجوان ہو۔ شاہان۔

شاہان بھی سمجھ گیا کہ کپتان یہی سمجھ رہا ہے کہ اس نے خنجروں کے وار بچائے ہیں شاہان ہنس دیا اور صرف اتنا کہا۔

”وہ اس قسم کی لڑائیوں کا بڑا ماہر ہے اب آگے نکلو ہمیں دن نکلنے سے پہلے پہلے ڈاکوؤں کے جہاز پر پہنچ کر عمارہ کو ہر دانا ہے اگر وہ چلے گئے تو بڑی مشکل ہو جائے گی.....“ اور وہ دونوں جزیروں کے تاریک جنگل میں سمندری طرف بڑھنے لگے۔ جہاں سمندری ڈاکوؤں کا جہاز کھڑا تھا۔

سانے ہی ڈاکوؤں کا جہاز سمندر میں کھڑا تھا۔

اس کے ساتھ ہی کپتان کا تجارتی جہاز بھی تھا۔ چاندنی رات میں دونوں جہاز ساتھ ساتھ کھڑے صاف نظر آ رہے تھے شاہان اور کپتان درختوں کے پیچھے ان جہازوں کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں خاموشی تھی۔ شاید سارے ڈاکو سو رہے تھے شاہان نے کہا۔

”ہمیں اسی وقت حملہ کر دینا چاہئے۔“ کپتان بولا۔ ”حملے سے تمہاری کیا مراد ہے۔“

”یعنی ہم دونوں نیچے ان لوگوں والے ڈاکوؤں پر حملہ کریں۔“ شاہان نے کہا۔ ”بہت سی ایسی باتیں ابھی تم دیکھو گے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم مجھ سے کوئی سوال نہ کرو اور خاموشی سے دیکھتے جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں اور صرف ایسا کرو کہ جو میں کہوں وہ چپ چاپ کرتے جاؤ۔“ شاہان نے ایک نظر سے دونوں ڈاکوؤں کا جائزہ لیا۔

اسے یقین تھا کہ عمارہ کو ڈاکوؤں نے اپنے جہاز میں ہی رکھا ہوگا شاہان سے ایک غلطی ہوئی تھی اسے چاہئے تھا کہ دونوں ڈاکوؤں کو ہلاک کرنے سے پہلے پوچھ لیتا کہ عمارہ جہاز میں کس جگہ پر ہے پھر اسے خیال آیا کہ ہو سکتا تھا کہ عمارہ ان ڈاکوؤں کے قبضے میں نہ ہوگا۔

اسے کوئی درد نہ اٹھا کر لے گیا ہو لیکن اگر درد نہ اٹھا کر لے جاتا تو وہ ضرور رشور مچاتی اور کپتان اس کی چیخوں کی آوازیں سن سکتا تھا اس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں نے پہلے کسی طریقے سے عمارہ کو بے ہوش کیا ہوگا اور پھر اسے اٹھا کر جہاز پر لے گئے ہوں گے شاہان نے کپتان سے کہا۔

”تم اسی جگہ ٹھہرو میں ڈاکوؤں کے جہاز کی طرف جا رہا ہوں۔“ کپتان نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”کیا تم اکیلے جاؤ گے۔“ شاہان نے کہا۔ ”ہاں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو۔“

کپتان نے کہا۔ ”تم اتنے سارے ڈاکوؤں میں کیسے زندہ رہو گے۔“

شاہان نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”میری لگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے تم یہاں سے مت ہٹیں واپس اسی جگہ آؤں گا۔“ کپتان جب چاپ سا لڑا اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ شاہان درختوں سے نکل کر سمندر کی ساحل کی طرف گیا کپتان نے دیکھا پچھلی چاندنی شاہان دوسری طرف سے ہو کر جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا بڑی دور تک وہ شاہان کو دکھائی دیتا رہا اور پھر رات اندھیرے اور چاندنی میں گم ہو گیا کپتان نے اوپر کی طرف دیکھا ایک خاموشی اور اندھیرا تھا اور کچھ

نہیں تھا جزیروں کے ساحل کی طرف سے سمندری ہوا بھی تھی جنگل اس کے پیچھے سناٹا تھا اگر کوئی اس کے پاس سے نکل کر درندہ اس پر حملہ کر دیتا تو اس کے پاس ہلہ کرنے کے لئے کوئی معمولی سا جاقو بھی نہیں ہوتا ابھی تک یہی ثابت ہوا تھا کہ اس جزیروں میں کوئی درندہ نہیں ہے کپتان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے جہاز کو دیکھ رہا تھا جس میں اس کا لاکھوں روپے کا سامان بھرا ہوا اور جواب ڈاکوؤں کے قبضے میں تھا شاہان کی باتوں سے زیادہ اعتبار نہیں تھا اعتبار کرتا بھی کیسے بھلا ایک پتلا نوجوان اتنے ڈاکوؤں کا اکیلے کیسے مقابلہ کر سکتا تھا۔ وہ بس خاموشی سے اس ڈرامے کو دیکھتے رہا تھا جو شاہان اسے دکھا رہا تھا۔

دونوں جہازوں پر موت کی خاموشی طاری تھی ان اوپر سے ہو کر سمندر کی لہروں کے ساتھ ساتھ لڑوں کی طرف جا رہا تھا رات اتنی سناٹ تھی کہ ہلکی گونج کے باوجود وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا ان جہاز کے بادبان لپٹے ہوئے تھے اور لنگر گرے گئے تھے۔

شاہان بڑی احتیاط سے چپ چاپ کر آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ عمارہ ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی ڈاکو اسے نقصان پہنچا سکتے تھے شاہان کی جیب میں لاش کی لاش کے دو ٹکڑے شکل میں رکھی ہوئی تھی جب بھی کا خیال اپنے ساتھی کی لاش کی طرف جاتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا شرم اس کے پاس نہیں تھا وہ راج

کماری کو لے کر ہندوستان کے جنگلوں میں سفر کر رہا تھا اسے بھی ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی کہ نانگی کے ساتھ کیا بھیانک حادثہ گزر چکا ہے۔

شاہان کو کپتان نے دور سے ہی بتا دیا تھا کہ اس کا جہاز کون سا ہے وہ ڈاکوؤں کے جہاز کے پہلو میں آ گیا وہ سامنے سے جہاز میں سوار ہونا نہیں چاہتا تھا تا کہ خاموشی ہی خاموشی میں عمارہ تک پہنچ جائے اس کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ سمندر میں سے ہو کر جہاز کی دوسری طرف آ جائے وہاں کوئی کشتی بھی نہ تھی شاہان نے سمندر میں آہستہ سے چھلانگ لگا دی سمندر کی بڑی بڑی لہریں دور دور سے آ کر ساحل سے ٹکر رہیں چلی جاتی تھیں جب ایک لہر واپس جانے والی تھی تو شاہان سمندر میں اتر آیا لہر اسے اپنے ساتھ دور تک لے گئی یہاں سے شاہان واپس تیرتا ہوا رات کی خاموشی میں جہاز کے قریب آ گیا لنگر کا رسہ آدھا سمندر میں تھا اور باقی آدھا اوپر جہاز کے عرشے کے جنگل کی طرف جا رہا تھا شاہان تیرتا ہوا اس کے پاس آ گیا پھر وہ رے پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

شاہان بی کی چال سے اوپر جا رہا تھا بس اسے ایک ہی ڈر تھا کہ اگر ڈاکوؤں نے اسے دیکھ لیا پکڑ لیا تو ہو سکتا ہے وہ عمارہ کو قتل کر دیں گے کیونکہ وہ شاہان کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے ہو سکتا ہے کہ طیش میں آ کر وہ اپنی ناکامی کا بدلہ عمارہ کو ہلاک کر کے لینے کی کوشش کریں اگر عمارہ وہاں نہ ہوتی تو یا شاہان کو خیال نہ ہوتا کہ عمارہ وہاں ہو سکتی ہے تو وہ بے دھڑک ڈاکوؤں پر جا کر حملہ کر دیتا مگر اب ایسا نہیں تھا اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھنا پڑ رہا تھا۔

شاہان نے جہاز کے عرشے پر سر نکال کر دیکھا عرش پر ایک ڈاکو پہرہ دے رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا سمجھی وہ اٹھ کر چلنے پھرنے لگا اور سمجھی بیٹھ کر اونگھنے لگ جاتا اس کے ہاتھ میں ایک تنگی لتاویں جس وقت پہرے دار نے اونگھنا شروع کیا۔ اسی وقت شاہان جلدی سے جنگل بھلا گیا کر

عرشے پر آگیا اور جھک کر دے پاؤ بھاگ کر جہاز کے بڑے ہوا دان کے پاس آ کر رک گیا اور نیچے ہو کر بیٹھ گیا کیونکہ اس مندر سے پہرے دار نے اب اٹھ کر بیڑیوں کے دروازے کے آگے چلنا پھر شروع کر دیا تھا۔ پہرے دار کو خبر بھی نہ ہوئی کہ شاہان اس کے جہاز پر پہنچ چکا ہے۔ اب اس کے سامنے نیچے جانے کا مرحلہ تھا شاہان کے دماغ میں ایک ترکیب آئی اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ اس پہرے دار ڈاکو کا حلیہ بدل کر نیچے جائے اس طرح سے کچھ دیر تک اور خاص طور پر رات کے اندھیرے میں کوئی راسے پھان سنکے گا یہ سوچ کر شاہان نے ہوا دان کی دوسری طرف آ کر بڑے بڑے سچے پڑے تھے وہاں سے آگے ٹھسکا شروع کر دیا اور پہرے دار کی عقب میں آگیا خدا جانے پہرے دار کو اس کی موت نے آواز دی تھی اس نے سچ سچ شاہان کے قدموں کی آواز سن لی تھی کہ وہ ایک دم سے رکا گردن گھما کر ان رسوں کے نیچے کی طرف دیکھا جہاں شاہان چھپا ہوا تھا اور تلواریں اس طرف آگیا شاہان بھی توجہ دیتا تھا کہ کسی طرح سے وہ دروازے سے کچھ دور ہٹ جائے۔

شاہان ایک طرف اندھیرے میں ہو گیا ڈاکو جونہی اس کی طرف اندھیرے میں آیا اس کی گردن پر جیسے کوئی بھاری شے آ کر گئی۔ اور وہ منہ کے بل رسوں پر گر پڑا اس کے بعد اس پہرے دار کو اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ شاہان نے کافی زور سے مکا مارا تھا۔ اور اسے مکا لگتے ہی گردن کی بڑی ٹونے کی آواز بھی آتی تھی یہی وجہ تھی کہ شاہان نے پہرے دار کے جسم کو لاش سمجھ لیا اور اسے پکڑ کر اندھیرے میں لے گیا وہاں لے جا کر اس کے کپڑے اتار کر خود پہنے اور سر پر لال رومال باندھا اپنے بالوں کو بکیر دیا اور ہاتھ میں تلوار پکڑ لی شاہان کا رنگ گندمی تھا جیسے قدیم مصر کے لوگ کا ہوا کرتا تھا اس لئے وہ بڑی آسانی سے ڈاکو لگ رہا تھا۔ پھر ڈاکو کی لاش کو اسے رسی کے پتھوں کے درمیان جو بھونسا کنواں بن آیا تھا وہاں پھینک دیا تھا کیونکہ سمندر میں لاش پھینکنے سے آواز پیدا ہوتی اور ڈاکو

خبردار ہو سکتے تھے۔

شاہان ڈاکو کے حلیے میں بیڑیوں کے پاس آ کر پہرے دینے لگا تاہم کی لاش کے دونوں ٹکڑے رومال میں لپیٹ کر اس نے اپنی کمر کے گرد باندھ رکھا تھا اس نے بیڑیوں میں جھک کر دیکھا کوئی اوپر آ رہا تھا شاہان جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور چل پھر کر پہرے دینے لگا دل میں وہ آنے والے لوگوں پر ہاتھ کر اس سخت کو بھی اوپر آنے کے لئے یہی وقت رہا تھا کیونکہ اس وقت رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی آنے والا بھی ایک ڈاکو ہی تھا جو شاید بیڑی کی گرمی سے تنگ آ کر اوپر کھڑا ہوا میں سوئے آگیا تھا۔ شاہان نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ کہ کہیں اس کی آواز پر ڈاکو کوئی شک نہ ہو جائے ویسے بھی وہ آنے والے ڈاکو سے دور رہنے کی کوشش کر رہا تھا آنے والا ڈاکو بھی ایک ہی تھا۔ آتے ہی اس نے شاہان سے کہا۔ ”کیوں دوست مزہ میرے سو روپے دے رہے ہو ناں۔“ شاہان کی بلا جانے کہ یہ کیسے سو روپے تھے جو وہ آقا کو اس سے یا اس پہرے دار سے لینا چاہتا تھا جس کی لاش رسوں کے درمیان پڑی تھی۔

اس نے معمولی سی ہوں آں کر دی۔ اس پر تو جیسے غیبی ڈاکو کو خدسا یا غرا کر لولا۔

”یعنی تم کمرے ہو میں ابھی یہ منجر تمہارے دل کے آ رہا کر دوں گا بلو سو روپے دو گے یا نہیں۔ بلو۔“

کجنت ڈاکو کا بارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔ یہ تو سارے کے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا شاہان نے کہا۔

”دو کا ضرور دوں گا۔“

شاہان نے یہ جملہ اس لئے جلدی سے ادا کر دیا تھا کہ اس کا منہ بند ہو جائے گا اور یہ پرے ہٹ کر کھڑا ہو جائے گا لیکن اس بد نصیب کی بھی موت اسے بار بار آوازیں دے رہی تھی اس نے چونک کر کہا۔ ”تمہاری آواز کیوں بدل گئی ہے تم کون ہو؟“ اور پھر شاہان نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔

شاہان نے چونکہ ڈاکو کو لاش پہن رکھا تھا اس لئے وہ ذرا آہستہ سے چل رہا تھا لیکن وہ چونکہ بھی

تھا کہ کسی پر اس کا راز نہ کھل جائے آئے سامنے جو کھڑی کی چھوٹی چھوٹی کوشڑیاں بنی تھیں وہ چار پانچ ہی تھیں ان میں خاموشی تھی ڈاکوؤں نے شاید ان کوشڑیوں میں بھی لوٹ کا مال رکھا ہو تھا ڈاکو شاید نیچے والی منزل کے عرشے پر ہوا دان کی ٹھنڈی ہوا کے نیچے سو رہے تھے کیونکہ وہاں کی اتنی تیزی ہوتی جتنی جہاز کے اوپر ہوتی ہے شاہان اس جگہ کی تلاش میں تھا۔ جہاں ان ڈاکوؤں نے عمارہ کو قید کر رکھا تھا وہ جگہ یا تو کوئی کوشڑی یا چٹائی منزل کا گودام ہو ہی ہو سکتا تھا۔

شاہان نے فیصلہ کیا کہ پہلے جلدی جلدی ان کوشڑیوں کی تلاشی لی جائے ایک کوشڑی کے دروازے کو اس نے آہستہ سے اندر کی طرف دھکا دیا دروازہ تھوڑی سی چڑھا ہٹ کے ساتھ کھل گیا اندر اندھیرا تھا شاہان نے اندر جا کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

کوشڑی میں کوئی انسان نہ تھا۔ صرف بڑے بڑے ٹاٹ کے بنڈل تھے اسی طرح دوسری کوشڑی میں بھی لوٹ مار کا سامان پڑا تھا۔ تیسری کوشڑی کا دروازہ باہر سے بند تھا شاہان کے دل میں شک ہوا کہ شاید اس کوشڑی میں ڈاکوؤں نے عمارہ کو قید کر کے باہر سے تالا لگا دیا ہو گا تالا کھولنا اس کے لئے کوئی شکل کام نہیں تھا اس نے تالے کو ہاتھ میں پکڑ کر آہستہ سے جھٹکا دیا تالے قبضے اور کھڑی سمیت اکھڑ کر شاہان کے ہاتھ میں آگیا وہ کوشڑی میں آگیا اندھیرے میں بھی اندر رکھے ہوئے مسافروں کے لوٹے ہوئے صندوق اور ریشمی کپڑوں کے تھان اور چاندی کے گلدان گلاب پاش اور پینک پڑے تھے عمارہ یہاں بھی نہیں تھی۔

شاہان اب چھٹی کوشڑی کی طرف بڑھ گیا وہ تیسری کوشڑی سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک ڈاکو تلواریں لٹکائے بھاٹی لپٹا اس کی طرف آگیا۔ اور شاہان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر راز داری سے بولا۔ چوری کرنا تھی دوست تو مجھے بھی ساتھ ملا لیتے اب تمہیں مجھے بھی حصہ دینا ہو گا۔ نہیں تو میں ابھی سر دار کو آواز دے کر بلا لیتا ہوں اور دوسرے لمحے تمہاری گردن کے بغیر لاش سمندر میں

مچھلیاں کھا رہی ہوں گی۔“

شاہان نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے ساتھ اندر آؤ۔“ اور شاہان اس تیسرے بد نصیب ڈاکو کو لے کر کوشڑی میں آگیا یہ وہ ڈاکو تھے جنہوں نے نہ جانے کتنے لوگوں کا سامان لوٹ کر ان کے اور ان کے بال بچوں کو ہلاک کیا ہو گا۔ ان پر کوئی بھی رحم نہیں کھا سکتا تھا کوشڑی کے اندر آتے ہی شاہان نے دروازہ بند کر دیا اور کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ وہ لڑکی کہاں ہے جو جنگل سے ملی تھی۔“ ڈاکو نے کہا۔ ”کیا تمہیں نہیں معلوم۔ تمہاری آواز ہمارے دوستوں کی طرح نہیں ہے تم ہم کون ہو۔ اس نے پھر وہی حرکت کی جو اس سے پہلے اس کا ڈاکو بھائی کر چکا تھا۔

اندھیرے میں شاہان نے ڈاکو کی گردن کا نشانہ لے لیا تھا ڈاکو نے تو اپنی تلوار پوری طاقت سے دبا کر بڑے ماری اور تلوار شاہان کی گردن سے ٹکرا کر ٹیڑھی ہو گئی تھی لیکن شاہان نے اس طرف دھیان نہ دیا اور بڑے سکون کے ساتھ شررگ کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اور پھر شاہان نے فوراً اس کا کام تمام کر دیا۔

بہر حال شاہان سمجھ گیا کہ عمارہ دوسری منزل میں نہیں ہے اب پہلی منزل کا گودام ہی دیکھنا رہ گیا تھا شاہان اس قسم کے پرانے یاد دہانی جہازوں میں بہت سفر کر چکا تھا وہ جانتا تھا کہ کون سا راستہ کدھر کدھر جاتا ہے۔ وہ بڑی آسانی سے جہاز کی چٹائی منزل پر آگیا۔ یہاں ایک جانب وہ ڈیک تھا۔ جہاں ڈاکو سوئے ہوئے تھے اور خراٹے بھر رہے تھے دوسری جانب گودام تھا گودام کا دروازہ بند تھا اور باہر موٹا سا تالا لگا تھا۔ شاہان نے تالے کو اکھاڑ ڈالا کیونکہ ٹونے سے آواز پیدا ہونے کا خطرہ تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھول کر شاہان اندر چلا گیا۔ مگر یہاں بھی اندھیرا تھا پر شاہان کی نظر اس اندھیرے میں بھی دیکھ لیا کرتی تھی گودام میں مختلف قسم کے کاٹ کپڑا پڑا تھا۔ کونے میں ایک پرانا سا پینک دکھائی دیا۔ جس پر کوئی اونڈھے منہ پڑا ہوا تھا شاہان لپک کر پینک کے پاس گیا یہ عمارہ تھی اس کے بال بکھرے ہوئے تھے جسم پسینے سے تر ہوا تھا۔ اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ شاہان

نے آہستہ سے اسے بیدار کیا۔

عمارہ نے آنکھیں کھول کر شاہان کو دیکھا اور اس کے ویران چہرے پر خوشی کی لہر پھیل گئی شاہان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ بولنا نہیں میرے ساتھ آؤ۔ عمارہ پہلے تو ڈاکوؤں کے لباس میں شاہان کو پہچان نہ سکی لیکن جب وہ اس پر جھکا تو وہ اس کی آنکھوں کی چمک کو فوراً پہچان گئی وہ ہلکے پر سے اٹھی اور شاہان کے پیچھے چلتی گودام سے باہر آگئی ڈاکو سو رہے تھے ان کے خزانوں کی آوازیں اب چھت سے نکل کر نیچے آرہی تھی شاہان عمارہ کو ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھ کر جہاز کی دوسری منزل کے تنگ راستے میں سے گزرنے لگا اچانک ایک کوشٹری کا دروازہ کھلا اور اندر سے جہاز کا سردار کسی کو گالیاں بکتا باہر نکلا۔

اس کی نظر جو عمارہ پر پڑی تو تلوار نکال کر گرجا۔ ”تم کو یہ کون انوا کر کے لے جا رہا ہے۔“ اس نے شاہان کو اپنا ہی ڈاکو سمجھا تھا۔ جو سردار کی امانت میں خیانت کر کے اسے انوا کر کے لے جا رہا تھا سردار نے تلوار کا بھر پور وار کیا۔ تلوار شاہان کے سر پہ لگی اور ٹیڑھی ہو گئی سردار نے اپنی تلوار کو اور پھر شاہان کو جھرت سے دیکھا۔

”تم نے سر پر لوہے کا توباندھ رکھا ہے۔“ ”اب تیری موت آگئی ہے۔“ اور سردار نے شاہان کی گردن پر تلوار کا دوسرا وار کیا اس بار سردار کی تلوار کے دنگلے ہو گئے اس نے خنجر نکال کر خوش قسمتی کی بات یہ ہوئی تھی کہ سردار نے ابھی تک اپنے ساتھیوں کو آواز نہیں دی تھی اگر وہ دوسرے ڈاکوؤں کو بھی بلا لیتا تو عمارہ کا مارا جانا یقینی تھا۔

شاہان نے سوچا کہ جتنی جلدی ہو سکے اس سردار کو ہلاک کر دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو نہ بلا سکے۔ بس جب سردار نے خنجر نکالا تو شاہان نے ایک بازو اٹھا کر اپنا بھرپور ہاتھ سردار کی گردن پر مارا سردار کی گردن ایک دم ٹیڑھی ہو گئی اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی وہ دھڑام سے گر پڑا اور شاہان نے اسے عمارہ سے کہا۔ ”جلدی سے اسے تھمیت کر اندر لے چلو۔“

”دونوں مل کر سردار کی لاش کو تھمیت کر اس کے کیمین میں لے گئے لاش کو کیمین میں بند کر کے دونوں تیزی سے باورچی خانے کی طرف گئے وہاں مٹی کے تیل کا ڈرم بڑا تھا۔

شاہان نے نیچے عرشے سے اوپر آنے والا راستہ بند کر دیا پھر اس نے مٹی کا تیل سارے راستے میں پھیلا دیا اور دو پتھروں کو لگا کر ایک کپڑے کے ٹکڑے کو آگ لگا گئی اور وہ جلتا ہوا ٹکڑا آگ پر ڈال دیا۔

شاہان نے عمارہ کو ساتھ لیا اور جہاز کے لنگر پر سے اتر کر ساتھ والے تجارتی جہاز پر عمارہ کو چڑھایا اور خود کپتان کو لینے ساحل سے جنگل کی طرف بھاگا کپتان نے بھی شاہان کو دیکھ لیا تھا۔ وہ سمجھا کہ شاید کوئی گزربز ہو گئی ہے شاہان یوں بھاگا چلا آ رہا ہے قریب آ کر شاہان نے کہا جلدی سے اپنے جہاز پر آؤ کپتان بھی اپنے جہاز کی طرف دوڑ پڑا۔ اس وقت ڈاکوؤں کے جہاز پر سے کہیں کہیں سے دھواں اٹھنے لگا تھا جب یہ لوگ اپنے جہاز پر پہنچے تو ڈاکوؤں کے جہاز کے اوپر والے دروازے میں سے آگ کا ایک شعلہ بھڑک کر باہر نکل آیا۔ ڈاکو اندر بند ہو گئے تھے وہ شور مچا رہے تھے اور دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

کپتان نے شاہان کے ساتھ مل کر اپنے جہاز کا لنگر اٹھایا اور بادبان کھول دیئے پچھلے پہر کی ہوا چلنے لگی تھی، ہوائے بادبانوں کو پھلادیا اور جہاز چلنے لگا دوسرے جہاز کے ڈاکوؤں نے دروازہ توڑ دیا تھا اور جلتے ہوئے جہاز میں سے سمندر میں چھلٹیں مار رہے تھے اور کپتان کے جہاز کی طرف آنے کی کوشش کر رہے تھے مگر سمندر کی لہریں انہیں قریب نہیں آنے دے رہی تھیں۔ ویسے بھی کپتان کے جہاز کی رفتار کچھ تیز ہو گئی تھی بہت جلد ڈاکوؤں کے جہاز کو آگ نے اپنے شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا تھا اس کے بادبان پھڑکنے لگے جیسے سمندر میں آتش بازی چل رہی ہو۔

شاہان عمارہ اور کپتان اپنے جہاز کے عرشے

پر کھڑے اس جلتے ہوئے جہاز کا نظارہ کر رہے تھے بحری ڈاکو جزیرے کی ساحل کی طرف تیرتے ہوئے جا رہے تھے کئی ایک اندری جل کر سیاہ ہو گئے تھے کپتان نے کہا۔ ”ان لوگوں کو خدا نے ظلم کی سزا دی ہے اب یہاں جزیرے پر ہی اپنی باقی زندگی بسر کریں گے۔ کیونکہ اس طرف شاید ہی کوئی جہاز آتا ہے۔“

شاہان نے کہا۔ ”ہاں..... ظلم کا بدلہ مل کر ہی رہتا ہے۔ اس لئے انسان کو چاہیے کہ وہ کسی پر ظلم نہ کرے۔“

عمارہ بڑی خوش تھی کہ اب وہ اپنے وطن جاسکے گی شاہان نے کپتان سے پوچھا۔

”اس مقام سے اسپین کی بندرگاہ کا قافلہ کتنی دور ہے۔ اور انہیں وہاں تک پہنچنے میں کتنے دن لگ جائیں گے۔“ کپتان نے شاہان کو بتایا۔

”اگر ہوا ٹھیک چلتی رہی اور راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا تو وہ پندرہ دنوں کے بعد اسپین پہنچ جائے گی۔“ جہاز میں کئی ماہ کا خوراک اور پانی موجود تھا۔

شاہان نے ناگنی کے جسم کو ایک صندوقچی میں بند کر کے جہاز میں اپنے کیمین میں رکھ دیا اور جہاز نے اسپین کی طرف اپنا لمبا سفر شروع کر دیا سمندری سفر آرام سے کٹ گیا۔

جہاز سولہویں دن اسپین کی بندرگاہ پر جا کر رگ

بھی بہت تیز تھی جہاز کا کپتان بڑا افس کھ اور خوش اخلاق تھا وہ شاہان کا دوست بن گیا۔

شاہان نے اسے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے ہندوستان جا رہا ہے جہاز افریقہ، مدغاسکر اور برما سے ہوتا ہوا ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر جا کر ٹھہر گیا یہی شاہان کی پہلی منزل تھی کالی کٹ اتر کر شاہان نے ایک رہیت ہوٹل میں قیام کیا اس کے پاس ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی جس میں ناگنی کی لاش پڑی تھی اور ایک چھوٹی ڈلی سونے کی تھی یہ ڈلی اس نے بازار میں جا کر فروخت کر دی جو رقم ملی اس کی مدد سے وہ ہمالیہ کے پہاڑوں کو جاتے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

سات دن بعد شاہان ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچا جہاں سے ہمالیہ پہاڑ کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ آج سے سو برس پہلے نہ موٹر گاڑیاں تھیں نہ بیس تھیں مسافر کچروں وغیرہ پر اپیدل سفر کرتے تھے شاہان نے ناگنی کے لاش کے ٹکڑے صندوقچی میں سے نکال کر دوبارہ رومال میں ڈالے اپنی کمر کے گرد باندھ دیا اسی خیال سے کہ کہیں صندوقچی گم نہ ہو جائے جمیل ناگ مندر وہاں سے کافی دور بلند پہاڑیوں میں تھی وہاں تک جانے والا راستہ بڑا خطرناک تھا اور تنگ گھاٹیوں نو کیلی چٹانوں خطرناک چڑھائیوں اور برفانی علاقوں سے ہو کر گزرتا تھا شاہان کو ان سارے خطروں کا مقابلہ کرنا تھا۔ اور وہ اس کے لئے تیار تھا۔

قصبے میں ایک رات بسر کرنے کے بعد دوسرے روز وہ ایک چھوٹے سے مندر میں پہنچا وہ ناگنی کے بارے میں یہاں سے کسی بچاری سے پوری معلومات حاصل کر لینا چاہتا تھا ان علاقوں میں وہ ہزار سال پہلے آیا تھا مگر تب سے کہ اب تک زمانہ بدل گیا تھا پہلے والا مندر ڈھس چکا تھا اور اس کی جگہ دوسرا ناگ مندر بن گیا تھا بچاری تو شاہان کو نہ ملا البتہ وہاں سے ایک بوڑھا سادھو مل گیا۔

جب شاہان نے اسے بتایا کہ وہ مسلمان سیاح ہے اور ناگ مندر کی سیر کرنا چاہتا تھا ہے تو سادھو نے کہا۔





## صحرا گرد

ناصر محمود فرہاد - فیصل آباد

اس سے پہلے کہ گولی نوجوان تک پہنچتی اس نے ایک عجیب درد ناک کراہ سنی اس غیر انسانی آواز نے نوجوان کو کرب و اذیت میں مبتلا کر کے دھلا کر رکھ دیا اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی اور پھر.....

لفظ لفظ اور سطر سطر..... خوف و ہراس کے گرداب میں..... غوطہ زن..... دل گرفتہ کہانی

آسمان کو چھوتے مینار ایک محو کن منظر پیش کر رہے تھے لیکن میرا ذہن ماحول کے اس سحر کو پوری طرح محسوس نہیں کر رہا تھا کیونکہ وہ تو کئی برس پہلے پیش آنے والے واقعات کو دہرائے میں مصروف تھا۔ وہ واقعات جو کانی عرصہ میرے لیے ایک ڈراؤنا خواب بنے رہے۔ وہ واقعات جن کا میں ایک حصہ تھا مگر مجھے نہ جانے کیوں ان پر آج بھی یقین نہیں آتا کہ میں نے یہ سب کچھ اپنی

ہوس کی ہولناکیوں میں کھڑا ان واقعات کو یاد کر رہا تھا جسے اگر میں آپ سے بیان کروں تو آپ اسے میرے دماغ کا خلل سمجھیں گے۔ کوئی بھی سننے والا اس پر یقین کرنے کو کبھی تیار نہ ہوگا جو کچھ میرے ساتھ پیش آیا۔ یہاں اس ہالکونی سے سمندر کی ٹھانیں مارتی لہروں کا دھیمہ شور صاف سنائی دے رہا تھا اور چودھویں کے چاند کی روشنی میں قاہرہ شہر کی مسجدوں کے

جا کر دیکھتا ہوں کہ یہ گھڑسوار کون ہے؟“ راج کماری کو اونچی جھاڑیوں کے درمیان چھوڑ کر شریم کے کچے راستے پر آ کر جدھر سے گھوڑوں کی آوازیں آتی تھی ادھر کو چلنے لگا۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلا ہوگا کہ تین گھڑسوار بڑی تیزی سے گھوڑے دوڑاتے آئے اور جہاں راج کماری چھپی تھی وہاں سے قریب ہی درختوں کے نیچے جا کر رک گئے۔

گھوڑوں سے اتر کر انہوں نے ایک بڑا سا تھملا کھول لیا اور اس میں سے چیزیں نکال نکال کر دیکھنے لگے شریم واپس مڑ کر ان گھڑسواروں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور تھیلے میں کیا دیکھ رہے ہیں؟

قریب جا کر شریم نے دیکھا کہ ان لوگوں نے تھیلے میں سے ایک انسانی سر باہر نکال رکھا تھا اور پھر سے اس کی آنکھیں کھرج کر نکال رہے تھے شریم ان لوگوں کے ظلم پر کانپ اٹھا۔

کس قدر پتھروں لوگ تھے یہ خدا جانے کس کا سر کاٹ کر لے آئے تھے اور اب اس کی آنکھیں نکال رہے تھے شریم نے غور سے دیکھا۔

سر کی عورت کا تھا کیونکہ سر پر لمبے لمبے بال بھی تھے شریم کے دیکھتے دیکھتے انہوں نے عورت کے کٹے ہوئے سر کی دونوں آنکھیں نکال کر پھینک دیں اور تھیلے میں مار کر بس پڑے وہ بڑے ہی خوش ہو رہے تھے یہ تینوں قاتل تھے ان کی باتوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی عورت کا ابھی ابھی سر قلم کر کے لائے ہیں اتنے میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔

تینوں قاتل ہوشیار ہو گئے ایک نے دو درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اس کئے سرداری عورت کا خاوند ہے، آنے دو۔“ دوسرے قاتل نے تلوار نکال کر کہا۔

”اس کا بھی سر کاٹ کر اس کی بیوی کے سر کے ساتھ لے جا کر فروخت کر دیں گے اور دیکھتے ہی دیکھتے عورت کا خاوند تلوار لہراتا وہاں آن پہنچا۔

(جاری ہے)

”بیٹا میں تمہاری ہمت کی قدر کرتا ہوں لیکن تم مسلمان سیاح کی حیثیت سے وہاں نہیں جاسکو گے۔“

”پھر میں کیا کرو۔“

”میں کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ناگ مندر میں صرف ہندو لوگ ہی جاسکتے ہیں۔“ اس کے ساتھ شاہان کے دماغ میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ وہ ایک ہندو جوگی بن کر وہاں کا سفر کرے پھر تو کوئی اس پر شک نہیں کرے گا اور وہ بھی پورے اطمینان سے اپنا مشن بھی پورا کر لے گا۔ شاہان وہاں سے واپس سرانے میں آ گیا اسی روز شام کو اس نے سر منڈ والیا جسم کو موٹے سیاہ کپڑوں میں چھپایا ہاتھ میں ترشول لیا ہندو جوگی کا روپ بدل کر ناگ مندر کے لیے اور خطرناک پہاڑی سفر پر روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

اب شریم کی سننے۔

شریم راج کماری کو لے کر اس کے باپ کی ریاست کے قریب پہنچ گیا تھا وہ ایک جنگل کی پگڑی سے گزر رہا تھا۔ راج کماری ایک تیل گاڑی میں سوار تھی یہ تیل گاڑی شریم اور راج کماری نے راستے میں ایک دیہاتی سے لے لی تھی راج کماری تیل گاڑی چلا رہی تھی شریم اس کے ساتھ بیٹھا تھا شام کا وقت تھا جنگل میں اندھیرا ہو رہا تھا ایک دریا جنگل کے ساتھ درختوں سے دور ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا راج کماری اور شریم باتیں کرتے جا رہے تھے انہوں نے جنگل میں گھوڑوں کے ہنہانے کی آواز سنیں نہ کہا۔

”خاموش تیل گاڑی کو درختوں کے نیچے کرلو۔“ ان کا خیال تھا کہ وہ یہ کچا راستہ چھوڑ دے تاکہ جو گھڑسوار ادھر آ رہے ہیں وہ آگے نہ گزر جائے۔

راج کماری نے تیل گاڑی سڑک سے اتار کر گئے درختوں میں جھاڑیوں کی اوٹ میں کرنی تیل بڑے آرام سے گھاس کھانے لگا راج کماری کو لے کر شریم جھاڑیوں کے پاس آ کر بیٹھا۔

”تم ان جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھی رہو، میں آگے

آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا۔

مجھے آج ایک لمبے عرصے بعد دوبارہ قاہرہ شہر میں آنے کا اتفاق ہوا۔ میں تو شاید اپنے بیٹے وقت کی کلک کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے یہاں دوبارہ نہ آتا مگر حالات مجھے یہاں پہنچ لائے۔ مجھے یہاں کچھ کاروباری معاملات سمجھانے تھے۔ میرے جو حالات آج ہیں وہ اس وقت نہیں تھے۔ آج تو میرے بالوں میں سفیدی اتر چکی ہے اور روگوں میں بھی برف نے بسیرا کر لیا ہے مگر اس وقت میں نو جوان اور توانائیوں سے بھر پور تھا۔ مصر کے ریگ زار میرے قدموں کے نیچے تھے اور نظریں بلند ہر امون کی چوٹیوں پر۔

میں ایک فرانسیسی کمپنی میں ملازم تھا جس کا کام قدیم مصری فراغیہ کے مقابلے کی تلاش تھا۔ میں اس کمپنی میں صرف پیسے کی خاطر شامل نہیں ہوا تھا بلکہ یہ میرا جنون تھا۔ مصری تاریخ میرے لیے ایک نشے کی حیثیت رکھتی تھی۔ میں تاریخ کے ان نگاہی اوراق کو اپنی آنکھوں اور ہاتھوں سے محسوس کرنا اور پڑھنا چاہتا تھا۔ صحرا میری زندگی کا خواب تھا جہاں میں ان دفن شدہ ڈھانچوں کو بے آرام کرنے کے لیے پھر رہا تھا۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ یہ کمپنی جس کے لیے میں کام کر رہا تھا میرے اس نشے، اس جنون کو پورا نہیں کر سکتی اس لیے بعض اوقات میں اکیلا ہی صحرا گردی پر آمادہ ہو جاتا۔ جہاں کسی آثار قدیمہ کی ہینک پڑتی تو خود ہی اکیلا اس کی طرف چل پڑتا۔

بہر حال میں اس تفصیل سے آپ کو پور نہیں کروں گا کہ میں یہ کیسے کرتا بس اتنا بتاؤں گا کہ میرا جنون مجھے ایسے میڑھے میڑھے صحرائی راستوں پر لے گیا جو قافلوں کی آمد و رفت کے مروجہ راستوں سے بہت دور تھے۔ میری عمر اس وقت بمشکل بیس بائیس سال ہوئی۔ اس عمر میں انسان کسی رکاوٹ، کسی مشکل کی پرواہ نہیں کرتا اور دنیا اسے ایک لذیذ شیریں پھل کی طرح نظر آتی ہے۔ یہی ان دنوں میرا حال تھا لیکن مجھے تجربے نے وہ سکھایا جو ڈیڑھا ڈیڑھ کلینک نے سکھا تھا یعنی

”مشرق مشرق ہے۔“

انہی دنوں میرا سامنا مصر کے اس فسون سے ہوا جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے مگر اس کی حقیقت کی تہہ تک پہنچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ میں نے اس فسون کو چشم خود دیکھا ہے۔ میں تو اسے جادو ہی کہوں گا جس پر کوئی ایسا شخص یقین نہیں کرے گا جو دنیا کو عقل و دانش کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اس چیز کو بیان نہیں کیا جاسکتا وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ یہی وہ چیز ہے جو آج میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں اور مجھے یہ بتانے میں خوشی ہو رہی ہے کیونکہ میں ان کو بتا رہا ہوں جو اس کو سمجھ سکتے ہیں۔

آج میرے سارے بال سفید ہو چکے ہیں لیکن اس وقت ایک بھی بال سفید نہ تھا اور میں ایک تھکا دینے والے دن کے اختتام پر عرب بدوؤں کے ایک قبیلے میں پہنچا۔ میں سارا دن تپتے ریگ زاروں میں پیدل چلتا رہا تھا میری منزل کوئی اور تھی مگر جہنم کی آگ برساتے سورج کے نیچے صحرا کی تپتی ریت پر سفر کرتے ہوئے میں اپنا رستہ کھو چکا تھا۔ میں اکیلا سفر کر رہا تھا۔ دن بھر صحرا کی ریت پر اس بے رحم سورج کے گرم و گرم پر میں شام کو اس نخلستان میں پہنچ گیا تھا۔

وہ بدو عرب تھے ایک ایسا قبیلہ جس کی خانہ بدوشوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہ تھی مگر آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عرب فطرتاً بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور یہ قبیلہ بھی ایسا ہی تھا۔ اس قبیلے کے شیخ کے خیمے کا دروازہ ہر مسافر کے لیے کھلا تھا۔ میں آگے بڑھا اور قبیلے کے سردار شیخ سعید محمد کو سلام کیا جس نے روایتی گرم جوش سے میرا استقبال کیا۔ نہادو کہ جب میں تازہ دم ہو گیا تو دہنے کے بھنے ہوئے لذیذ گرم گوشت سے میری دعوت کی گئی۔ اس کے بعد خوشبودار تھوے کی چٹکیوں نے میری ساری تھکان اتار دی۔ شیخ سعید میرے سفر کی روداد پوری دل چسپی سے سن رہا۔ مصر میں ایک عرصے کی صحرا گردی نے مجھے عربی زبان بڑی اچھی طرح سکھا دی تھی اور اب تو میں اسے اہل زبان کی طرح ہی بولتا

تھا۔ جب رات کی خنکی اترنے لگی تو شیخ نے میرے لیے ایک علیحدہ خیمہ نصب کروا دیا۔

یہ صحرا کی مہمان نوازی تھی۔ ایک نیرہ شیخ کے خیمے کے باہر ریت میں گڑا رہتا جو اس بات کا اعلان تھا کہ جو کوئی بھی مہمان کو گزند پہنچانے کی کوشش کرے گا پہلے اسے شیخ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ شاید آپ جانتے ہوں کہ مصر کے ریگ زاروں میں شام کا دھند لگا کیسے اترتا ہے۔ ابھی آسمان صاف اور چمک دار ہے اور اگلے ہی لمحے وہ پورا تاریکی رنگ میں نہا جاتا ہے اور پھر فوراً ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور ستارے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ خنکی ہنسی رات اپنی بھرپور جوانی اور نشے سمیت اتر آتی ہے۔ اس رات بھی اس دور دراز تنہا صحرا میں رات اترنے کا یہ سحر انگیز اور دل کش نظارہ میری پوری توجہ سمیٹے ہوئے تھا اور خاشاکی کی زبان میں روح سے باتیں کر رہا تھا۔

میرا خیمہ مہمان نوازی کی روایات کے مطابق قبیلے کی سرحد پر نصب کیا گیا تھا جس کا پردہ اٹھا ہوا تھا اور میں اس سحر انگیز رات کی شوخ جوانی کو اپنی آنکھوں میں اترتے محسوس کر رہا تھا۔ اس چھوٹے سے نخلستان کے چار یا پانچ بھجور کے درخت نظر آ رہے تھے جن سے پرے دور دور تک ریت کا آہنی قلعین بچھا ہوا تھا جو دور تک جا کر افق سے مل جاتا تھا۔ کچھ اونچے نیچے ٹیلے نظر آ رہے تھے جن پر ہزاروں لاکھوں بچکونوں کی مانند جھلکاتے، جھٹماتے ستارے عجیب نشہ کر رہے تھے۔ یہ ان خانہ بدوش بدوؤں کے لیے شاید معمول کی بات تھی مگر میں پوری طرح اس کے سحر کا شکار تھا۔

لیٹے لیٹے اچانک میں اٹھ کر بیٹھ گیا رات سے میری توجہ ہٹ گئی کیونکہ مجھے دور ایک ٹیلے کے اوپر کچھ پھل محسوس ہوئی۔ میں اسے غور سے دیکھنے لگا کچھ ہی دیر بعد میں سمجھ گیا کہ وہ کوئی شخص ہے جو ٹیلے سے نیچے اتر رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا وہ آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔ اس کی چال میں ایک عجیب سی لڑکھانہ تھی۔ جب وہ ادھر سے ادھر لہراتا ہوا چلتا تو اس چاندنی رات

میں عجیب سا نظارہ بنتا۔ وہ ایک لمبی پھٹی پرانی عمارتیں ملیوں تھا اور یوں چل رہا تھا جیسے بہت کمزور اور لاغر ہو۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا وہ گہرے گندمی رنگ کا ایک ادھیر غرض تھا۔ غرضی چہرہ اور زرد آنکھیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا خیموں کی طرف ہی آ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاؤں لگا جیسے بڑا ڈکا ہر کتا اس کی آمد سے باخبر ہو گیا ہو۔ انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کو گھیر لیا۔ میں نے ایسا نظارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ لاغر بوڑھا ان کتوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی سے ڈرانے لگا مگر کتے تعداد میں زیادہ تھے اور چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ بوڑھا ایک طرف ہٹتا ہوا میرے خیمے کی طرف آیا اور پھر صحن دروازے پر پہنچ کر ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ گر گیا۔ میں اٹھ کر خیمے کے باہر لپکا۔ اس اثناء میں کئی دوسرے لوگ بھی اپنے خیموں سے نکل کر اس کی طرف بڑھے مگر میں سب سے پہلے وہاں پہنچا اور بوڑھے کی گری ہوئی لاٹھی اٹھا کر کتوں کو ڈرا دھمکا کر وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد میں جھکا اور اچھی بوڑھے کا سر قہر اس اوپر اٹھا کر اس کو سہارا دیا۔ ایک ہلکی سی آواز اس کے حلق سے نکلی اور اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ ٹھنڈے پانی سے بھری ہوئی مٹی کی ایک صراحی خیمے کے دروازے کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ میں فوراً صراحی تک پہنچا اور اسے اپنے قریب کھینچ لیا۔ پیالے میں پانی ڈالا اور بوڑھے کے منہ میں پکانے لگا۔

بھوم میرے ارد گرد بالکل خاموش کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ بوڑھے نے خاموش نیم داگنا ہوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔ پانی پینے کے بعد بوڑھا میرے بازوؤں کا سہارا لیتا ہوا دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے کو یوں اٹھنے دیکھ کر ارد گرد کھڑے عرب بدو میرے بارے میں داد و تحسین کے نعرے بلند کرنے لگے جو میں عربی زبان اچھی طرح جاننے کے باوجود بھی سمجھ نہیں سکا کیونکہ یہ الفاظ میرے لیے اجنبی تھے۔ عین اسی وقت شیخ سعید محمد وہاں پہنچ گیا اور بھوم کو چیرتا ہوا

آگے آیا چیتھڑوں میں لمبوں بوڑھے شخص کو احترم سے سلام کیا اور اس سے حال احوال پوچھنے لگا۔ اس شخص نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنا سر ہلایا اور دوبارہ پانی کی مصراحتی کی طرف اشارہ کیا اور اشارے سے ہی کھانے کا مطالبہ کیا۔

جلد ہی اس کے لیے کھانا آگیا۔ وہ بار بار بے صبری سے غٹاٹ پانی پی رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے آس پاس کھڑے عربوں پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے ہاتھ سے اپنی پھونڈوں، اپنے لمبوں اور سینے کو چھو کر مجھے سلام کیا اور ایک طرف چل پڑا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے ایک بھی لفظ نہیں بولا تھا۔ قبیلے کے کتے ایک دفعہ پھر بھونکنا شروع ہو گئے۔ سب لوگ چپ چاپ کھڑے اس شخص کو جانتا دیکھ رہے تھے جو جلد ہی صحرائی اندھیری وسعتوں میں گم ہو گیا۔ جب سارے لوگ پلٹ کر اپنے نیموں میں جانے لگے تو شیخ سعید محمد نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نہایت سیدھے اور متاثر کن الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اس کے اس اجنبی مہمان کی خاطر مہارت اور دیکھ بھال کی۔ یہ بدوی شیخ شریک طرح بہادر اور عورت کی طرح نرم دل تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔

اچانک ہمیں دور صحرائی اس مجبول بوڑھے آدمی کے تعاقب میں بھاگنے والے کتوں کی غرائشیں سنائی دیں اور پھر فوراً ہی غرائشیں گیدڑوں کی چیخوں میں بدل گئیں۔ ایسی کرب ناک اور ہولناک چیخیں میں نے صحرائی وحشتوں میں پہلے ہی نہیں سنی تھیں پھر اچانک یہ آوازیں بھی محکم نہیں محروم کتے واپس نہیں آئے۔ میں نے شیخ کو مخاطب کرنا چاہا اور دیکھا مگر وہ شاید جا چکا تھا اس لیے میں بھی اس واقعے پر سوچتا اور حیران ہوتا ہوا واپس اپنے خیمے میں داخل ہو گیا۔ لیٹتے ہی نیند کے جھوکے آنے لگے مگر میرا ذہن اس پہلی آنکھوں والے آوارہ گرد سیالی کے گرد گھوم رہا تھا پھر خیمے کے نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں کتنی دیر سویا کچھ اندازہ نہیں مگر جب آنکھ کھلی تو صحرائی ٹھنڈی

انگلیاں صحرائی کے سینے کو گدگداری تھیں۔ جھپٹنے کی روشنی خیمے میں پھیل چکی تھی اور کوئی چیز خیمے کے پردے کو کھرچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے۔ اپنا رپو لیا اور اٹھایا اور لپک کر خیمے کے دروازے کا پردہ اٹھایا اور باہر جھانکا۔ ایک سایہ سانچے کے پیچھے کھسکا محسوس ہوا۔ میں نے سمجھا یہ پڑاؤ کا کوئی کتا ہوگا جو کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں یہاں بھٹک رہا تھا۔ میں مطمئن ہو کر واپس مڑنے ہی والا تھا کہ اسی وقت صبح کے سنائے میں ایک ہلکی سی آواز سنی۔ چونک کر ادھر ادھر دیکھا تو محسوس ہوا کہ صبح کے اس دھندلکے میں کچھ دور مشرق کی جانب ایک تہا سایہ کھڑا تھا۔ ان دنوں جوانی کی طاقت کا نشہ تھا۔ بیس بائیس سال کی عمر میں سب ہی بہادر ہوا کرتے ہیں۔ اپنا لبادہ شانوں پر اوڑھتے ہوئے میں اس سائے کی طرف بڑھا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا جب اس سائے نے ایک ہاتھ سے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں فوراً پہچان گیا کہ یہ وہی پراسرار اجنبی تھا جو رات میرے خیمے کے سامنے کرا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس سے پوچھا کہ کیا اس نے مجھے بیدار کیا ہے۔ اس نے کچھ بولنے کی بجائے صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس کی خاموشی عجیب سی لگی مگر میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا تھا۔ اب اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور مڑ کر پڑاؤ سے دور ایک طرف چلنے لگا۔ میں بھی بنا سوچے سمجھے اس کے پیچھے چل پڑا۔ اگرچہ معمول کے مطابق پڑاؤ کے گرد محاطوں کا پہرہ تھا مگر اس وقت حیرت انگیز طور پر کوئی محافظ ہمارے سامنے نہ آیا۔ پڑاؤ سے کچھ دور جا کر وہ بوڑھا کارا اور میری طرف مڑا۔ اس نے اپنی خیمہ انگشت سے ایک دفعہ پڑاؤ اور پھر میری طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد اس شاہراہ کی طرف اشارہ کیا جو دریائے نیل کے کنارے تک جاتی تھی۔ اس کی اس حرکت سے میں نے اندازہ لگایا کہ

یا تو وہ کوٹکا ہے یا پھر خاموش رہتا پسند کرتا ہے اس لیے میں پوچھنے لگا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ میں پڑاؤ کو چھوڑ کر اس طرف چلا جاؤں۔“

میری بات سن کر اس کی عجیب اور زرد آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”فورا؟۔۔۔۔۔“ میں نے پھر پوچھا۔ دوبارہ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”کیوں؟۔۔۔۔۔“ میں نے زچ سا ہو کر پوچھا۔

اس نے ایک بار پھر مجھے خاموشی کی زبان میں سمجھانے کی جو کوشش اس کا مطلب تھا کہ مجھے اس پڑاؤ میں جان کا خطرہ ہے اور مجھے سورج طلوع ہونے سے پہلے ان بدوؤں سے دور چلے جانا چاہیے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس اجنبی کی سنجیدگی کا کیا عالم تھا مگر میں نے اسے پاگل ہی سمجھا۔ میں نے اپنا سر جھکا اور ناگواری ہاتھ ہلاتے ہوئے مڑنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت میں نے اس کی عجیب آنکھوں میں عجیب سی افسردگی دیکھی جس سے میں متاثر ہونے لگیں۔ رہا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا، مڑا اور صحرائی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ میں نے جو راستہ چنا تھا وہ آگ کی طرف جاتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی خیمے میں جا کر دوبارہ سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا دوں پہاڑیوں کے پیچھے سے سورج آگ برساتا طلوع ہو رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ گونگے بوڑھے سے صبح سویرے ملاقات مجھے ایک خواب کی طرح محسوس ہو رہی تھی میں سوچنے لگا کہ شاید یہ خواب ہی تھا مگر مجھے اس پر زیادہ غور و فکر کرنے کی مہلت نہ ملی کیونکہ اچانک ہی خیمے کے باہر ایک عجیب اور پرشوری پہل شروع ہو گئی تھی۔

میں نے فوراً باہر جا کر مصورت حال جاننے کی کوشش کی۔ جو کچھ میں نے باہر دیکھا اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں اپنی جگہ جم سا گیا اور ساکت اس کی طرف دیکھنے لگا کیا آپ جانتے ہیں سموم کیا ہے؟۔۔۔۔۔ صحرائی لوگ اس سے بخوبی واقف ہیں اس

روز یہ میرے سامنے تھا۔ اپنی صحرائی زندگی میں میں نے اس کے متعلق سنا بہت تھا مگر آج میرا واسطہ اس سے پڑ ہی گیا تھا۔ یہ طوفان اس قدر شدید تھا کہ ریت کی ایک بلند دیواری تن گئی تھی اتنی بلند کہ سورج اس کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ یہ دیواری تن ویرانی کی سورج کی روشنی اس میں سے کوئی راہ نہ پاری تھی اور دن میں رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

ریت کے اس طوفان میں مجھے اپنا دم گھٹنا محسوس ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ چونکہ مجھے پہلے بھی اس طوفان سے واسطہ نہ پڑا تھا اس لیے اس سے بچاؤ کی احتیاطی تدابیر مجھے معلوم نہ تھیں میں یونہی ہولنوں کی طرح کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا مگر مجھے احساس ہوا کہ یہ عرب بدو اس صحرائی طوفان کے لیے پہلے سے تیار تھے کیونکہ ان کے گھوڑے، اونٹ اور گدھے ایک محفوظ جگہ پر مضبوط ری سے باندھ دیے گئے تھے۔ خود انہوں نے سر اور منہ اپنے رومالوں سے ڈھانپ رکھے تھے اور ادھر ادھر بھاگ کر ایک دوسرے کی مدد کر رہے تھے۔ اڑتی ریت میری آنکھوں کو اندھا کر رہی تھی۔ مجھے سانس لینا بھی دشوار تھا کیونکہ میں اپنے حلق میں ریت بھرتی محسوس کر رہا تھا۔ ان عرب بدوؤں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے سر اور منہ پر کپڑا لپیٹ لیا اور کھجور کے ایک درخت کے پیچھے دبک گیا۔ اس وقت میں سوچنے لگا کہ شاید یہی وہ خطرہ تھا جس سے مجھے اس گونگے بوڑھے نے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی اور میں اس کی بات مان کر اس سے بچ سکتا تھا۔ اگر میں اس کی بات مان کر سورج نکلنے سے پہلے یہ قبیلہ چھوڑ کر دریائے نیل کی طرف نکل جاتا تو اس وقت کسی گاؤں میں پناہ حاصل کر چکا ہوتا۔ مگر پھر میں سمجھ گیا کہ یہ طوفان ایک چھوٹا خطرہ تھا شاید اصلی خطرہ ابھی کہیں آگے تھا کیونکہ کچھ ہی دیر میں طوفان گزر گیا اور پڑاؤ میں موجود ہر شخص اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

طوفان گزر جانے کے بعد پڑاؤ کو دوبارہ ترتیب



## بہترین دعا

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دعائیں کیں۔ ہم ان میں سے کوئی بھی یاد نہ رکھ سکے۔ ہم نے کہا: ”حضور! آپ نے اتنی دعائیں کی ہیں کہ ہمیں کچھ بھی یاد نہ رہا۔“

آپ نے فرمایا: ”میں کیا تمہیں وہ دعا نہ بتا دوں جو تمام دعاؤں کی جامع ہو۔ تم یہ کہا کرو۔“

”اے اللہ! ہم تجھ سے وہ تمام اچھی چیزیں مانگتے ہیں جو تیرے نبی کریمؐ نے تجھ سے مانگیں اور ان تمام برائیوں سے پناہ مانگتے ہیں جن سے تیرے نبی کریمؐ نے پناہ مانگی۔ تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ اور کوئی اور حرکت و طاقت تیری رضا کے بغیر نہیں ہوتی۔“

(محمد بن ابی بکر - سنن ابی داؤد)

ہوا خوری کے لیے باہر نکلا تو میرے قدم مجھے اس جگہ تک لے گئے۔ زیادہ تر عورتیں پانی بھر کر جا چکی تھیں۔ چند ایک پانی سے بھرے گھڑے اپنے سر یا کولے پر ٹکائے واپسی کا ارادہ کر رہی تھیں ان میں سیکینہ بھی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے قدم سست ہو گئے۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا تو وہ پہلے تو جھکی پھر گئی اور اپنا گھڑا اس نے چشمے کے کنارے پر رکھ دیا۔ دوسری عورتیں آگے نکل چکی تھیں انہوں نے سیکینہ کے رکنے کی کوئی پرواہ نہ کی اور چلی گئیں۔ یہ میرے لیے بہتر تھا۔ میں سیکینہ کے قریب پہنچا تو وہ کھڑی مجھے دیکھتی رہی مگر بولی کچھ نہیں۔

”تمہارا نام سیکینہ ہے نا۔۔۔؟“ میں نے جانتے بوجھے اس کا نام پوچھا۔ جواب میں اس نے بجائے کچھ کہنے کے صرف اثبات سر ہلا دیا۔

”کیا تم کو مگی ہو۔۔۔ بولی نہیں ہو۔؟“ میں

پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ لہو کی گردش جسم کی حرارت کو بڑھانے لگی کیونکہ باریک نقاب کے پیچھے اس کی روشن آنکھیں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ وہ بدوی حور گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور بخیتی کا چوٹی پیالہ میرے قریب رکھ دیا۔ میری بے باک نگاہیں اس کے نقاب زدہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں مگر اس کی لامبی سیاہ پلکیں اس کے رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں وہ مجھ سے ٹکا نہیں ملا رہی تھی۔ وہ کچھ بے تاب اور مضطرب سی تھی اور جلدی میں بھی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید وہ میری موجودگی سے بے چین تھی۔ بنا کچھ بولے پل بھر بعد وہ اٹھی اور جانے کے لیے مڑی تو میں نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

کسی وحشت زدہ رہتی کی طرح اس نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور پھر ہاتھ چڑا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ تو چلی گئی مگر میری روح بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔ میں کافی دیر تک لینا اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ کھانے پینے کا ہوش بھی نہ تھا۔ صرف اس کی آنکھوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ جوانی کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جوانی ہوتی ہی بے اصول ہے جب درختوں پر پھل پکتے ہیں تو ان کو توڑنا گناہ نہیں سمجھا جاتا۔ یہ صحرائی بدوی لڑکیاں اس عمر میں جوان ہو جاتی ہیں جب شہروں میں رہنے والی لڑکیاں ابھی بچیاں ہی ہوتی ہیں اور سیکینہ جس کی مخور نگاہیں مردوں کی روح تک اتر جائیں وہ ابھی صرف سترہ برس کی تھی مگر صحرا کی کھلی فضاؤں نے اسے مکمل جوان بنا دیا تھا۔ دوسری کنیزوں سے مجھے اس کا نام معلوم ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ وہ شیخ سعید محمد کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔

یہ عرب قبیلہ بہار کے آغاز سے یہاں اس نخلستان میں خیمہ زن تھا۔ یہاں سمجھوروں کے اچھے خاصے درخت تھے اور ان درختوں کے بیج ایک قدرتی چشمہ بھی تھا جہاں غروب آفتاب کے وقت قبیلے کی عورتیں نقاب اوڑھے اور اپنے سروں پر گھڑے اٹھائے پانی بھرنے آیا کرتی تھیں۔ اس روز شام کے وقت میں

میں کتے بھونکنے لگے تو مجھے وہ بوڑھا کوٹکا اجنبی یاد آ گیا جس نے مجھے یہ جگہ چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر مجھے اپنے جسم کا انگ انگ ٹوٹا محسوس ہوا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا اور پھر جانے کب سو گیا مگر اگلی صبح جب آنکھ کھلی تو میرا جسم تپ رہا تھا مجھے بخار ہو چکا تھا۔

شیخ سعید محمد خود میری خیریت دریافت کرنے آیا اور اس نے حکم دیا کہ میری تمار درباری اچھے طریقے سے کی جائے۔ میں صحرا میں سفر کرنے کے دوران اپنے ساتھ دواؤں کا انتظام ضرور رکھتا تھا جو آج میرے کام آ رہا تھا۔ شیخ سعید محمد کے غلام اور کنیزیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد میری خبر گیری کر رہے تھے مگر اس کے باوجود بخار اترنے میں تین دن لگ گئے۔ میں اس دوران میں اپنے خیمے میں ہی آرام کرتا رہا۔ شیخ سعید محمد کی کنیزیں میرے لیے کھانا اور تھوہ وغیرہ لے کر آتیں۔ ان کے چہروں پر باریک رشتی نقاب ہوتے مگر ہر ایک اپنے خشن اور جوانی سے علیحدہ علیحدہ پہچانی جاتی مگر وہ نہ آئی جس کا مجھے انتظار تھا اور جس کی غیر موجودگی مجھے واقعی بیمار بنا رہی تھی۔ جس کی سیاہ غزال آنکھیں میرے خوابوں کا محور بن چکی تھیں۔ وہ سیاہ آنکھیں جو میرے خوابوں میں ستاروں کی طرح چمکتیں۔ میں اپنے خیمے کے دروازے پر اس کے چھوٹے چھوٹے برہنہ پاؤں کی آہٹ کا منتظر رہا مگر بے سود۔ چوتھے روز جھپٹے کا عالم تھا اور میں بستر پر لیٹا اسی کے متعلق سوچ رہا تھا کہ وہ آگئی۔ اس کے ہاتھوں میں بخیتی کا ایک پیالہ تھا جو شیخ سعید محمد نے بطور خاص دے کر گوشت سے بھرا کر میرے لیے بھجوائی تھی۔ وہ خیمے کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس کے پیچھے ڈوبے سورج کی کرنیں اس کے دل کش اور سمور کن سراپے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ سورج کی یہ کرنیں اس کے پاؤں تک لہا دے میں اس کے جسم کا ہر ایک زاویہ، ہر ایک خط نمایاں کر رہی تھیں۔ میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنے بھول گیا اور پھر اس قدر تیزی سے دھڑکنے لگا کہ جیسے ابھی

دیا جانے لگا۔ ہر چیز کو واپس اپنی مقررہ جگہ لے جایا گیا۔ میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا، کپڑے جھاڑے، منہ سے رومال ہٹایا اور اپنے خیمے کی طرف دیکھنے لگا جو ہوا کے زور سے اکٹھڑ چکا تھا۔ شیخ کے آدمی اب اسے دوبارہ نصب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیخ سعید محمد کے خیمے سے باہر آئی تھی اور ایک ریت آلود غالیچہ جھاڑنے لگی۔ اس کا لباس کچھ زیادہ قیمتی نہ تھا مگر اس کے گلے میں بڑا چاندی کا ہار سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا اور اس کی چمک میری آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ سر کے بال گندھے ہوئے تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں چاندی کی ہی بازب تھی جو اس کے ہر حرکت پر چمک چمک جاتی۔ آنکھیں دہن، اٹھتی ہوئی ناک، چمکتی ہوئی غزال آنکھیں، بھری بھری جوانی اور جوانی کا اٹھتا ہوا جو بن۔ میں کسی سمور کی طرح بے خود کھڑا اس کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سانس رگ گیا ہو۔

اسی وقت دھوپ میں اس کی آنکھیں چمکیں اور مجھے یوں لگا جیسے پراسرار تارکیوں کے دو تالاب ہیں جن میں مجھے اپنا آپ جھلملتا نظر آ رہا تھا۔ اس نے شاید میری نظروں کی بے باکی کو محسوس کر لیا تھا اور نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں بے خودی کے عالم میں اپنی طرف متوجہ پا کر اس عرب دوشیزہ کے چہرے پر جیا کی لالی نمودار ہوئی اور اس نے فوراً نقاب کا ایک سرا پہنچ کر اپنے چہرے کو ڈھک لیا پھر وہ مڑی اور بھاگ کر خیمے کے اندر گم ہو گئی۔

ایک نظر صرف ایک نظر اس نے میری طرف دیکھا تھا مگر محبت کے یونانی دیوتا کیو پڈ کا تیر بھی ان نظروں کے سامنے کند تھا۔ جب وہ چلی گئی تو مجھے تھکاوٹ محسوس ہونے لگی اس لیے میں واپس اپنے خیمے میں آ گیا جو اس وقت تک دوبارہ نصب کر دیا گیا تھا اور اس کی تمام اشیاء بھی اپنی مقررہ جگہ پر رکھ دی گئی تھیں۔ میں باقی کا سارا دن وہاں لیٹا ان دو سیاہ آنکھوں کے متعلق سوچتا رہا مگر شام ڈھلنے کے بعد جب صحرا

نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا تو اس بار بھی اس کا سر نفی میں ہلا۔ اس کی اس حرکت پر میں ہلکھلا کر ہنس پڑا تو وہ بھی ہنسے لگی۔ پھر جیسے اس جتنے کے کنارے جلتے گجڑے بج گئے ہوں وہ ایک دم بولی۔ ”تمہارا کیا نام ہے؟“

میں نے اپنا نام بتایا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی کیونکہ میرے نام کا تلفظ ادا کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔ میں نے اس کو اپنا نام بولنا سکھایا۔ کتنا بیٹھا لگ رہا تھا اس کے شیریں لبوں سے میرا نام۔ یہیں سے ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ چشمہ خیموں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن ہماری ملاقاتوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ سیکڑے روز سب سے آخر میں پانی بھرنے آئی اسی وقت میں بھی ٹھیلے ٹھیلے وہاں پہنچ جاتا۔ میں دھیرے دھیرے اس پر اپنے دل کا حال کھول رہا تھا مگر وہ ابھی تک خوف زدہ ہرنی کی مانند ایک فاصلہ رکھے ہوئے تھی۔ سیکڑے کا بھائی اور شیخ سعید محمد کا بیٹا اس قبیلے کا بہترین شہسوار تھا۔ اس کے پاس سفید رنگ کی ایک شاندار گھوڑی تھی جس کا نام اس نے شب دیز رکھا تھا۔ وہ اس گھوڑی کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ یہ گھوڑی بھی بہت خاص اٹلس، اس نے دوڑ کے کئی مقابلے جیتے تھے۔ اس صحرا میں اس کے مقابلے کا کوئی اور جانور نہیں تھا۔ میں نے ایک منصوبے کے تحت روزانہ سیکڑے سے اس گھوڑی کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔ یہ موضوع سیکڑے کے لیے بھی دل پسند تھا وہ بھی اپنے بھائی ک اس گھوڑی پر بہت فخر کرتی تھی۔ اس موضوع کا یہ فائدہ ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ چلنے لگی، اس کی جھجک ختم ہونے لگی اور وہ مجھ سے بے تکلف ہو گئی۔ اب وہ بے دریغ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتاتی تھی۔ میرے اس منصوبے کو مکمل ہونے میں دو ہفتے لگ گئے۔

اس شام میں نے سیکڑے کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو وہ ایک دم پریشان سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے امید اور شہادت ایک ساتھ جھلکنے لگے اور وہ پوچھنے لگی۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟۔۔۔۔۔“

”انسان کا ارادہ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے اور اگر

تم میرا ساتھ دو تو میرے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو وہ کچھ مطمئن سی ہو گئی اور میرا بازو دھامتے ہوئے بولی۔

”میں تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے پانی سے بھر گھڑا اٹھایا اسے اپنے کولہے پر رکھا اور مسکراتے ہوئے واپس چل دی۔

☆.....☆.....☆

اس رات پوچھنے سے ایک گھنٹہ قبل میں نے شب دیز نامی اس گھوڑی کی اونٹ کے بالوں سے بنی رسی کاٹ دی اور چپ چاپ اس کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔ اس کام میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ وہ پہرے دار جو اس رات پڑاؤ کے پہرے پر تھے مدھوش پڑے تھے۔ انہیں اپنی کوئی خبر نہ تھی۔ سیکڑے نے اپنا کام بخوبی سرانجام دیا تھا۔ معمول کے مطابق اس رات پہرے داروں کے لیے شراب کے جو جام بھیجے گئے تھے ان میں سیکڑے نے نہایت ہوشیاری سے اسے بے رنگ محلول کے چند قطرے ٹپکا دیے تھے جو میں نے اسے اپنی ادویات کی پوٹی سے نکال کر دیا تھا۔ یہ چند قطرے انہیں صبح تک سلائے کے لیے کافی تھے۔ پہرے داروں کے علاوہ پڑاؤ کی گمرانی پر کتنے بھی موجود تھے مگر اب وہ اس پڑاؤ میں میری موجودگی سے اس حد تک عادی ہو چکے تھے کہ رات کو بھی مجھے دیکھ کر نہیں بھونکتے تھے۔ میں نے جلدی جلدی اس سفید گھوڑی پر زین کسی، ضروری سامان خرچین میں رکھا اور پڑاؤ سے ایک ڈیڑھ میل دور نکل کر ایک ٹیلے کی اونٹ میں رک گیا۔ چاروں طرف خاموش ریت پھیلتی ہوئی تھی۔ میں شب دیز کے پہلو میں کھڑا تھا اور میرے کان کسی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ میں پوری طرح چوکنا تھا اور میری توجہ چاروں طرف تھی۔ میں ان عرب بدوؤں کو اچھی طرح جانتا تھا جو اپنی خون آشامی اور کینہ پروری کے لیے دنیا بھر میں مشہور اور بے مثال تھے۔ ان سے بچ کر نکلنا بہت مہارت کا کام تھا۔ مجھے ابھی تک بہت آگے نکل جانا چاہیے تھے مگر مجھے کسی کا انتظار تھا جس نے میری خاطر اپنی زندگی داؤ

پر لگا دی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ بے آواز بھاگتی ہوئی ایک ٹیلے کے پیچھے سے نمودار ہوئی اور آتے ہی میری ہاتھوں میں سا گئی۔ جب صبح کے سورج کی پہلی کرن صحرا کی ریت پر چنکی اس وقت تک شب دیز ہمیں لے کر پڑاؤ سے کافی دور نکل چکی تھی مگر اب بھی وہ جگہ جہاں میں پناہ لینا چاہتا تھا ہم سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ وہ چوکنا تھا اور وہ سفید گھوڑی اپنی پوری رفتار سے ابھی بھی بکشت بھاگے چلی جا رہی تھی۔ ریت اس کے سون کے نیچے دھول کی مانند اڑ رہی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اونٹ ریگستان کا جہاز ہے۔ اور وہ ریت میں زیادہ اچھے طریقے سے سفر کر سکتا ہے۔ یہ درست ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ گھوڑا ریت پر بھی اونٹ سے زیادہ تیز رفتاری سے سفر کر سکتا ہے۔ اونٹ کی رفتار زیادہ تیز نہیں ہوتی ہاں وہ زیادہ لمبے عرصے تک سفر کر سکتا ہے اور اس وقت میرا مسئلہ فاصلے کا نہیں وقت کا تھا اس لیے یہ گھوڑی ہی ہمیں ہماری منزل تک پہنچا سکتی تھی۔ مجھے صحرائی راستوں کا بخوبی علم تھا اور ان راستوں پر مجھے کئی ایسی خفیہ جگہوں کا پتہ تھا جو ہمیں چھپا سکتی تھیں۔ ایک بار میں قاہرہ پہنچ جاتا تو پھر کوئی خطرہ نہ تھا۔

دور ریت کے پتھوں بچ ایک بہت بڑی سیاہ رنگ کی چٹان نظر آرہی تھی جو ایک قدرتی دیوار کی مانند کھڑی تھی۔ اس چٹان میں جگہ جگہ عماروں کے دہانے تھے۔ میرا خیال تھا کہ یہ قبل از تاریخ کے مقابر ہیں۔ یہ علاقہ بالکل خیر تھا کہیں ہیرائی نظر نہیں آرہی تھی۔ چاروں طرف دیرانی اور خوف پھیلا ہوا تھا اور ان کے ساتھ فکا کی وہ خوشبو جس کو مصر کی بیچان کہا جاتا ہے۔ سیکڑے زین پر میرے آگے بیٹھی تھی۔ اس نے منہ موڑ کر میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ تھک چکی ہے اور اب اسے تھوڑا آرام دے گا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے اپنے تعاقب کے کوئی آثار نظر نہ آرہے تھے۔ میں اس وقت رکنا نہیں

چاہتا تھا۔ وقت کا شمار میری آنکھوں پر تھا ایک لمحہ قیمتی تھا۔ خطرہ کسی بھی وقت سر پہنچ سکتا تھا مگر سیکڑے کی حالت دیکھتے ہوئے میں نے گھوڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور اس سیاہ چٹان کے پاس پہنچ کر میں نے اسے روک دیا۔

ہم دونوں نیچے اترا آئے۔ میں نے ایک بڑے سے کالے پتھر کی اونٹ میں ایک غالیچہ بٹھا دیا۔ میں نے سیکڑے کو اس پر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ چھانچل سے نکال کر پانی پلایا۔ روٹی اور محجور ہمارا ناشتہ تھا مگر روٹی، محجوروں اور پانی نے مل کر ایک عجیب نشہ کر دیا اور جب اس نشے میں سیکڑے کے شیریں لبوں کا لکڑی شال ہوا تو یوں لگا کہ صحرا میں نہیں بلکہ میٹھے گلابوں کے باغیچے میں ہیں۔ کچھ دیر کے لیے ہم دونوں سب کچھ بھول گئے مگر جلد ہی سورج کی تپش ہمیں حقیقت کی دنیا میں پہنچا لائی۔ میں نے ریشمی بازوؤں کا حصار دھیرے سے کھولا اور کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی کچھ نہ کچھ تو غیر معمولی ضرور تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے مڑ کر چٹان کی طرف دیکھا تو میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ میں آج بھی اس لمحے کو یاد کر کے خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ میں ایک جیسے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا اور وہ چٹان کے بلند سرے پر کھڑا تھا۔ وہ جو مجھ سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتا تھا وہ ہمیں دیکھ رہا تھا۔ میں نے مڑ کر سیکڑے کی طرف دیکھا وہ غالیچے پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔

پھر وہ گونگا بوڑھا نیچے اترنے لگا اگرچہ وہ بوڑھا آدمی تھا مگر اس سیدی مشکل چٹان پر سے نیچے کسی پہاڑی بکرے کی طرح قلائیں بھرتا چلا آ رہا تھا۔ میں نے فوراً سیکڑے کو متوجہ کیا تو وہ اٹھ کر اپنا لباس درست کرنے لگی۔ اس دوران میں اس بوڑھے نے چٹان سے اتر کر ریت کی پٹی کو عبور کیا اور میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ کیا آپ نے کبھی کسی وفادار کتے کی آنکھوں میں وہ ملامت بھری چمک دیکھی ہے جس کو اس کے مالک نے بلاوجہ مارا ہو۔ یہی چمک اس بوڑھے کی زرد آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ میں ان کی تاب نہ لا سکا

کچھ بول نہ پایا۔ بولنا مشکل ہو رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنی انگلی سے افق کی طرف اشارہ کیا جہاں صبح کی روشنی کے ساتھ کچھ سیاہ ہولے برآمد ہو رہے تھے۔ اس طرف دیکھتے ہی میں کانپ کر رہ گیا اور گھٹنوں کے بل سیکینے کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ میں اپنے آپ کو لاچار اور بے بس محسوس کر رہا تھا۔ میرے جوش کا پاگل پن مجھے چھوڑ گیا تھا۔ اس کالی چٹان کے سائے میں رک کر میں نے اتنا وقت ضائع کر دیا تھا کہ تعاقب کرنے والے موت کا ہگل بجاتے ہمارے سروں پر آن موجود ہوئے تھے۔ اب بھاگنے کا وقت باقی نہیں بچا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں سیکینے کو اس ہولناک جگہ پر مرنے کے لیے لے آیا تھا اور اب وہ آدمی جو غیر انسانی راستوں کا مسافر تھا ہگلوں کی طرح فحشوں غاں کرتے ہوئے اشاروں سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس وقت میرا دماغ مکمل ماؤف ہوا جا رہا تھا اور سیکینے کا جسم خوف سے بری طرح کچکپا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ چپک گئی میں اس کی آنکھوں میں جھپٹتی وہ بے چارگی بھی نہیں بھول سکتا جو میں نے اس وقت دیکھی۔

بے رنگ صحرائی چٹکیاں اپنے بالوں سے نکل کر ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔ اب وہ سیاہ ہولے افق سے نکل کر سورج کی روشنی میں آگئے تھے اور ہر لمحہ میری وحشت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ لوگ جلد ہی ہم تک پہنچ جائیں گے۔ وہ گونگا بوڑھا عجیب انداز میں کھڑا مجھے گھور رہا تھا اور سیکینے اس کو دیکھ کر خوف سے سکرے جا رہی تھی۔ بوڑھے نے پہلے آنے والے عربوں کی طرف اور پھر اپنے پیچھے چٹان کے عقب میں اشارہ کیا۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، بھاگنے کا وقت بھی گزر چکا تھا اور میں سمجھتا تھا کہ سفید گھوڑی باوجود تیز رفتار ہونے کے شاید دو انسانوں کے بوجھ کے ساتھ ان عربوں کے گھوڑوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اب آنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی صاف سنائی دے رہی تھیں اور ہمیں بھاگنے کی بجائے کسی جھپٹے کی جگہ کی تلاش تھی جو یہاں مل نہیں سکتی تھی۔ میں اپنی

سستی کو نئے لگا جس کی وجہ سے حملہ آور ہمارے سروں پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب بھی اگر ہم نے جلدی چھیننے کی کوئی جگہ تلاش نہ کی تو پکڑا جانا یقینی تھا۔ تعاقب کرنے والے چار تھے جن کی سربراہی شیخ سعید محمد کر رہا تھا۔ اب وہ تقریباً پانچ سو گز دور رہ گئے تھے۔ جب اس مجنون بوڑھے نے میرے بازو کو پکڑ کر مجھ کو اتار تو میرے حواس میرے قابو میں آئے۔ اس کی آنکھوں میں وحشی سی چمک تھی اور چہرے پر ہتھی اثرات تھے کہ جلدی کرو۔ اس کی نگاہوں کا مطلب مجھے ہونے میں نے سیکینے کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔ ”جلدی چٹان کے اوپر چلو یہ آدمی نہیں کہیں چھپا دے گا۔“

وہ چلائی۔ ”نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب مجھ میں اور ہمت نہیں۔“ اس کی بات سن کر میں نے اسے اپنی گود میں اٹھالیا اور اس بوڑھے کے پیچھے لپکا۔ فاصلہ جو نظر آتا تھا وہ اس سے زیادہ تھا۔ چٹان پر چڑھائی بھی مشکل تھی۔ میرے راہ نمائے ہاتھ بوڑھا کہ میری مدد کی۔ میں اس پھسلن زدہ چٹان چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا اور سیکینے کو بھی سنہال رہا تھا۔ اس کا خوف اس جگہ کی بیابانی اور تعاقب کرنے والوں کی وجہ سے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ وہ اس صحرائی بوڑھے سے بھی بہت زیادہ ڈری ہوئی تھی بلکہ خوف سے پاگل ہوئی جا رہی تھی اور بری طرح زور دے رہی تھی۔ وہ بوڑھا کھوڑی دور اوپر چٹان میں موجود ایک چھوٹے سے غار کے سامنے رک گیا جو اونچائی میں پندرہ یا سولہ انچ سے زیادہ نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہوا میں اپنے ہاتھ چلانے لگا۔ اس کا لبادہ ہوا میں اڑ رہا تھا اور آنکھیں گول گول گھوم رہی تھیں۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ ہم اس غار کے اندر رینگ جائیں۔ خوف سے کھپتی کسمپاسی سیکینے میری گرفت سے لگی اور چٹان پر تین چار قدم نیچے پھسل گئی۔ وہ یہ غار دیکھ کر ڈر گئی اور چلائی۔

”نہیں اس جگہ نہیں۔۔۔۔۔ یہ بوڑھا ہمیں دھوکہ دے رہا ہے۔۔۔۔۔ اس جگہ نہیں۔“

اس دوران میں گھڑ سوار وہاں آن پہنچے تھے۔ چٹان کے دامن میں سعید محمد گھوڑے سے نیچے اتار آیا اور

اب ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی بندوق سیدھی کی شست باندھی نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ حالانکہ یہ عرصہ پہلے کی بات ہے مگر یوں لگتا ہے جیسے آج ہی کی بات ہو اس نے میری دنیا بدل دی۔ ہمارے نیچے چٹانی بھول بھلیوں میں قسمت کی دیوی شیخ کی کہنی کے پاس کھڑی تھی۔ ٹریگر کھینچنے کی ہلکی سی آواز بھی سنائی دی اور پھر اس ریتلے سانے میں فائر کی آواز گونجی فوراً ہی ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ میں نے سیکینے کو نیچے پھینٹ دیکھا وہ میرے قدموں کے پاس گر گئی اور اس کا ہوا ان سیاہ چٹانوں پر بہنے لگا جن پر وہ کچھ دیر پہلے لیٹی ہوئی تھی۔

میری دنیا میری نگاہوں کے سامنے تاریک ہونے لگی یوں لگا جیسے میرا پورا جسم مغلول ہو رہا ہو۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے سیکینے کے بے جان ہوتے جسم کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ کالی چٹانوں پر سرخ لہو اور سیکینے کی آنکھوں میں محبت کی ککھ دیکھ کر میں خود بھی اس کے قریب ہی تقریباً ڈھے گیا۔ اس سے اپنی آخری ہنگامی میرے سینے پر لی۔ اس وقت مجھے سورج کی گرمی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ایک دفعہ پھر میں نے شیخ سعید محمد کی بندوق کو ڈھونڈنے کی آواز سنی مگر اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے صرف ایک اور گولی کا انتظار تھا مگر اس گولے کو بڑھے نے مجھے سیکینے کے مردہ جسم سے تقریباً نوچ کر علیحدہ کیا اور اس تاریک غار کے اندر کھینچ لیا۔

میرا سکتہ ٹوٹ گیا اور میں چیخ اٹھا۔ اب عرب بدو چٹان کی ڈھلان پر چڑھ رہے تھے وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ پچاس گز دور تھے۔ مجھے شیخ سعید محمد کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا اور بوڑھا مجھے اپنی پوری قوت کے ساتھ کھینٹ رہا تھا۔ میں غار کے اندر جانا نہیں چاہتا تھا اس لیے سیکینے کے مردہ جسم کو اپنے بازوؤں میں سیپنے وہیں بھاگا اور بدوؤں کو اپنے قریب آتے دیکھتا رہا۔ اچانک اس گولے کو بڑھے کی مزاحمت رک گئی۔ اس نے مجھے بچانے کی اپنی پوری کوشش کی تھی مگر موت شیخ سعید محمد کی صورت میں اب میرے سر پر آن پہنچی تھی۔

اگر میں غلط نہیں تھا تو بوڑھا اب اپنی جان بچا رہا تھا۔ مگر کا ذکر بغیر جادو کے مکمل ہی نہیں ہوتا۔ یہ کہانی بھی مصر کے رینگ زاروں میں لکھی جا رہی تھی تو پھر اس میں جادو کہاں تھا شاید جادو یہی تھا کہ سیکینے نے اپنی جان دے کر میرے جھلی، مٹلی اور جسمانی پیار کو سچے پیار میں بدل دیا تھا اور اب میں اس کے لیے جان بھی دینے کو تیار تھا مگر یہاں ایک اور جادو بھی تھا جو اس لمحے میرے ارد گرد پنپ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ شیخ سعید محمد کی گولی مجھ تک پہنچی میں نے ایک عجیب سی دردناک کراہ سنی۔ یہ آہ میرے عقب سے آئی تھی ایسی آواز میں نے پہلے بھی نہیں سنی تھی۔ اس غیر انسانی آواز نے میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ میں نے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے دیکھا تو چٹان کی چوٹی پر وہ بوڑھا اپنے بازو پر بندے کے پر کی طرح پھیلانے کھڑا تھا۔ ایک بار پھر اس کے حلق سے وہ غیر انسانی کراہ بلند ہوئی۔ یہ تو کسی انسان سے نہ کسی جانور سے مشابہہ تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی اور اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں ایک عجیب سی شان پیدا ہو چکی تھی۔ وہ مکمل طور پر بدلا نظر آ رہا تھا۔

تیسری بار پھر اس نے وہ غیر انسانی چیخ بلند کی اور پھر چٹان میں سے چھوٹے چھوٹے غاروں میں سے ایک میں سے ایک گیدڑ نے اپنا سر باہر نکالا۔ عموماً گیدڑ دن کی روشنی پسند نہیں کرتے وہ ایک شبینہ جانور ہے دوسرے جانداروں سے کئی کترانے والا مگر اس وقت دن کی روشنی میں جب سورج پوری طرح چمک رہا تھا ایک عجیب حیرت مجھے گھیر رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا گیدڑ، دوسرے کے بعد تیسرا، چوتھا، پانچواں پھر پتہ نہیں وہ پانچواں، پانچ سو میں کتنی جلدی بدلا اور پھر شاید وہ پانچ ہزار بن گئے۔ چٹان میں سے ہر سو رخ سے گیدڑ نکل رہا تھا اور وہ ایک غول کی شکل اختیار کرتے جا رہے تھے۔ میری حیرت ایک طرف رہ گئی اور مجھے خوف نے آن گھیر لیا۔ میں اپنا غم اور دکھ بھول گیا۔

یہ صحرا اب ریت کا نہیں بلکہ گیدڑوں کا صحرا بن





کی شروعات پر انہوں کی یادداشتیں ہی ہے۔ اس کی زندگی کا اختتام ہونے والا تھا۔ اور موت سے قبل وہ جی بھر کر انہوں سے بات چیت کر لینا چاہتا تھا۔ چند دنوں کے بعد بڑی عید تھی۔

قربانی کا دن..... وہ قربانی کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ جانور کی نہیں..... بلکہ اپنی قربانی..... ماں کی آنکھوں کا آپریشن..... چھوٹی بہن کی شادی اور اکلوتی بچی کو اچھے اسکول میں داخل کروانا تھا۔ وہ پردیس آنے کے بعد یہاں کی رنگینوں میں کھوکھور اپنے مقصد کو بیکسر بھلا چکا تھا۔ مقصد کی یاد اب آئی جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے جسم میں موجود خون کی مقدار تیزی کے ساتھ کم ہو رہی ہے۔ بیماری کا کوئی علاج نہیں تب اسے مقصد یاد آیا اس کی تمام جمع پونجی شراب نوشی اور عیاشیوں کی نذر ہو چکی تھی۔ زندگی کے دن کم تھے۔ اس لئے اس نے غلط راستے کا انتخاب کیا۔ اور سائی کیساتھ مل کر بہت بڑے صنعت کار کی اکلوتی لڑکی کو خواہ کیا۔ تاوان کے طور پر اچھی خاصی رقم ہاتھ آئی۔

لیکن بد قسمتی سے صنعت کار کی لڑکی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ تاوان لینے کے باوجود لڑکی کے ناپلنے کے بعد صنعت کار نے تمام شہر کی پولیس کو ان دونوں کے پیچھے لگا دیا۔ ان دونوں کے لئے شہر میں رہنا دشوار ہو گیا۔ اور مجبوراً انہوں نے دور دراز کے جزیرے سویلی کا رخ کیا۔

تویر جزیرے پر آنے سے قبل تاوان سے حاصل کردہ رقم اپنی ماں اور بہن کو بھجوا چکا تھا۔ یوں اس کی قربانی مکمل ہو گئی تھی۔ رقم تقریباً پچاس لاکھ کے نگ بھگ تھی۔ اتنی رقم اس کے قصاص کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔

سائی لیو نے اسٹیر کو جزیرے کے ویران ساحل کے کنارے سوک دیا۔ اور نیچے ہاتھ لٹک کر تریب دینے لگا۔

تویر نے تنہی دی نگاہوں سے جزیرے کا جائزہ لیا۔ ارد گرد در در تک سرسبز درختوں کا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ انسان کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن درختوں کے درمیان چند بکے اور جدید گھروں کا سلسلہ پیچھے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں کچی سڑک بھی دکھائی دیتی تھی۔ آسمان پر

گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور بوند باندی کا آغاز ہونے والا تھا۔ اسٹیر کو لنگر انداز کرنے کے بعد سائی نے تویر سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”جناب کیا آپ آسیب پر یقین رکھتے ہیں۔ اگر نہیں رکھتے تو یقین کر لیجیے یہاں متعدد موجود ہیں۔“

تویر چھلانگ لگا کر اسٹیر سے نیچے اترا آیا۔ اور سائی کے پیچھے جزیرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”ان باتوں پر یقین کرنا بے وقوفی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ جسے میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ میرے خیال میں سب سے بڑا آسیب تو انسان خود ہے۔“ سائی لیو سکرارتے ہوئے بولا۔

”کچھ دیر آپ کو آسیب دیکھنے کا اتفاق ہونے والا ہے۔ آپ حیرت زدہ ہونے کے لئے تیار ہو جائیے۔“

تویر افسردہ لہجے میں بھٹکا ہوا۔

”میں موت کی صورت میں آسیب دیکھنے کے بعد بلاشبہ حیرت زدہ ہو چکا ہوں مزید عجائبات اب باقی نہیں ہیں۔“

ساحل سمندر کی سفید ریت سے آگے درختوں کے گھنے سلسلے کے درمیان یکے راستے کا آغاز ہوا۔ ہوا میں خشکی طاری ہونے لگی تھی۔ سمندر کی طرف بجلی چمک رہی تھی حالانکہ دوپہر تین بجے کا عمل تھا۔ لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ دونوں نے یکے راستے پر آگے بڑھنا شروع کر دیا سائی لیو دوبارہ بولا۔

”سویلی میں راتیں جاگتی ہیں۔ اور دن سوتے ہیں کچھ عرصہ قبل جب میرا یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا تب میں نے دن کے وقت جزیرے کے درمیان میں واقع سویلی جزیرے کا تفصیلی معائنہ کیا۔ شہر زیادہ بڑا نہیں تھا..... مکان مضبوط کٹڑیوں سے تیار کردہ تھے۔ صرف چرچ کی عمارت سینٹ سے بنی تھی۔ سویلی کی عوام اپنے گھروں میں خوابیدہ تھی۔ اور میں تمام شہر میں گھومتے پھرنے کے بعد واپس اپنے اسٹیر کی طرف آ گیا۔“ تویر نے پوچھا۔

”کیا تمہارا رات کے وقت دوبارہ شہر میں جانے

اتفاق ہوا۔“ سائی لیو انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”کبھی بھی نہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ یہاں کے ایک بہت خطرناک ہیں۔ انسانی گوشت کھانا ان کی شہرت میں شامل ہے۔ وہ خون پینے کے بھی عادی ہیں۔“

گرجا تک چرچا ہٹ کی آواز کے ساتھ ایک چگاڑا تیزی کے ساتھ اڑتی ہوئی تویر کے سر کے پاس سے گزر کر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ سائی لیو سکرارتے ہوئے بولا۔

”مجھے اس خون پینے والے جانور پر ہندے سے نفرت ہے۔ جزیرے پر ان کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے۔“ تویر نے پوچھا۔

”کیا ہم ان آدم خوروں کے درمیان اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں گے۔ ہمارا جزیرے پر رہنے کا ارادہ طاقت پزیری تو نہیں۔“ سائی لیو بولا۔

”آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے چند دن قبل جزیرے کے سرکردہ افراد سے میری بات چیت ہو چکی ہے۔ انہوں نے ہر دن کے لئے ایک صحت مند انسان کی ضرورت کا اظہار کیا ہے جس کا وہ خون پی سکیں۔“

سویلی جزیرے سے کچھ ہٹ کر دنا آئیر لینڈ واقع ہے۔ وہاں انسانوں کی کثرت ہے۔ یہ آئر لینڈ ایسے خطرناک پتھریوں کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ جنہیں موڈی کاریاں لاحق ہیں۔ وہ دنا آئیر لینڈ میں سمپری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہاں ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ ان میں سے ایک دو کو یہاں لانا میرے لئے مشکل نہیں۔“ سائی لیو خاموش ہو گیا۔

تویر نے پوچھا۔ ”سویلی تک آنے کا راستہ نہایت دشوار گزار بھول بھلیوں پر مشتمل ہے۔ کیا تم روزانہ ان پیچیدگیوں کو عبور کر کے دنا آئیر لینڈ پر جانے کے بعد واپس آ پاؤ گے۔“ سائی لیو نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔

”وہاں تک جانے کے محفوظ ترین راستے سے میں آ گا ہوں۔ دنا آئیر لینڈ درحقیقت ان پہاڑی پیچیدگیوں سے کافی پہلے واقع ہے۔ اس لئے مجھے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔“

درختوں کے وسیع و عریض سلسلے کا اختتام ہوا۔ اردو رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے۔ وہاں متعدد دو کمروں پر مشتمل کٹڑی کے مکان لائن درلان دور تک چلے گئے تھے۔ ان کے دروازے بند تھے۔ سائی لیو کے کہنے کے مطابق سویلی جزیرے کے رہائشی اندر آرام فرماتے تھے کچھ آگے جا کر جزیرے کے اکلوتے چرچ کے آثار نمودار ہوئے۔ کچی دیواروں اور چھت سے ترتیب دیا ہوا چرچ ایک بہت بڑے ہل پر مشتمل تھا۔ جس کے اندر بہت بڑا فانوس نصب تھا۔ یہ فانوس موم بتیوں سے مزین تھا۔ کرسیاں اور بیچ مینگی کٹڑی سے تیار کردہ تھے۔ چرچ کے پاس سے گزرنے کے بعد راستے نے موڑ کاٹا اور نیچے کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ یہاں مکانوں کی تعداد کم تھی وہ ایک دوسرے سے کچھ ہٹ کر واقع تھے۔ ان مختصر مکانوں کے آگے کٹڑی کا براآمدہ بنا ہوا تھا۔ اور براآمدے کے سامنے لان واقع تھا۔ ایک مکان کے سامنے بیچ کر سائی لیو رک گیا اور تویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”ہماری اس رہائش کا بندوبست سویلی کے سب سے بڑے رکن زومیری میم کی طرف سے کیا گیا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان معاہدہ چرچ میں طے پایا۔“

گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا۔ دونوں نے ہڑ بڑا کر مکان کے اندر کا رخ کیا براآمدے کے آگے بنے ہوئے کمرے میں دو کرسیاں رکھی تھیں ان کے سامنے میز پڑا تھا دروازے کے ساتھ کٹڑی تھی اور کٹڑی کے سامنے والی دیوار میں آتش دان بنا دکھائی دے رہا تھا۔ اندر داخل ہونے کے بعد سائی لیو نے دروازہ بند کر دیا۔ اور تویر کو بیٹھنے کا اشارہ کر کے لمحوہ کمرے میں چلا گیا۔ تویر دیر بعد جب وہ باہر آیا تو اس نے ہاتھوں میں بیٹلی پکڑی ہوئی تھی۔ اس نے آتش دان میں آگ لگانے کے بعد بیٹلی کو آگ پر رکھ دیا۔ اور لوہے کی سلاخ سے کوکوں کو کریدتے ہوئے بولا۔

”جناب ہمارے لئے جزیرہ محفوظ ترین مقام ہے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔ کہ

ہم پوشیدگی کے لئے سویلی جزیرے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ حالات معقول ہونے کے بعد ہم اپنی منزلوں کا رخ کریں گے۔“

تویر کے چہرے پر ایک دفعہ پھر افسردگی کی لہر ابھرنے لگی اس کی کوئی منزل نہیں تھی وہ صرف انجام کا منتظر تھا۔ اس لئے موضوع تبدیل کرنے کے لئے بولا۔

”جزیرے پر ہماری خوراک کا کیا بندوبست ہے؟“ سانی نے اسے بتایا۔

”اسٹیر میں ایک مہینے کی خوراک اور آپ کی ادویات موجود ہیں۔ بارش رکنے کے بعد میں انہیں یہاں منتقل کر دوں گا۔ اسٹیر کے نچلے حصے میں انسانی لاش بھی رکھی ہوئی ہے وہ سویلی والوں کے لئے آج کا تھکا ہے۔“

تویر کو اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ کھانے پینے کے سامان کی موجودگی سے آگاہ تھا۔ لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسٹیر کے نچلے حصے میں ایک عدد لاش بھی ان کے ہمراہ مخوف تھی۔ اس کے استفسار پر سانی کیونے اسے بتایا کہ ”وہ لاش اس نے سفر سے قبل کھڑی رقم دے کر مردخانے سے حاصل کی تھی جتنا عرصہ سویلی میں قیام کے لئے درکار تھا اس کے لئے جزیرے والوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے انہیں خوش رکھنا ضروری تھا اور ان کی خوشی کے لئے خون کی دستیابی لازمی تھی۔“

کچھ دیر بعد کافی تیار ہو گئی کافی پینے کے بعد سانی سامان لانے کے لئے اسٹیر کی طرف چلا گیا۔ تویر کو کمزوری محسوس ہو رہی تھی وہ اٹھ کر ملحقہ کمرے میں آ گیا کمرہ آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں دو پلنگوں کے علاوہ ایک مختصر سی الماری رکھی ہوئی تھی جس کے اندر کچھ برتن بھی دکھائی دے رہے تھے آرام گاہ کے سامنے والے حصے میں وسیع و عریض کھڑکی تھی اور کھڑکی کے ساتھ والی دیوار میں ہاتھ روم کا دروازہ بنا تھا تویر پلنگ پر لیٹ گیا اس پر خود گی طاری ہونے لگی دماغ لمبے اور ٹھن سفر کی بدولت بوجھل تھا پلنگ پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ تمام رات طوفانی بارش نے جزیرے کو جھل جھل

کئے رکھا۔ صبح موسم کھل گیا اور خوشگوار دھوپ نے جزیرے کا محاصرہ کر لیا۔ ناشتے میں ذیل روٹی ٹھن اور کافی کا اہتمام تھا سانی کیوناشتہ کرنے کے بعد لاش کا انتظام کرنے کے لئے دینا جزیرے کی طرف چلا گیا گزشتہ رات کی بھرپور نیند کی وجہ سے تویر اپنے آپ کو سخت مند اور خوشگوار محسوس کر رہا تھا۔ اس لئے سانی کیونے جانے کے بعد جزیرے کی سپر کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ باہر چنگلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی آب و ہوا خوشگوار تھی سرسبز دھلے ہوئے درختوں کا رنگ آنکھوں کو بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا جزیرہ حسب معمول سنسان پڑا تھا۔ رہائشی گھروں میں پوشیدہ تھے تویر کے دل میں انہیں دیکھنے کا تجسس پیدا ہوا وہ جس راستے سے گزر رہا تھا وہاں دور دوریہ مکانات کا سلسلہ دور تک جاتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ان مکانات کے ارد گرد درختوں کی کثرت تھی اس نے ایک گھر کا انتخاب کیا اور دروازے کی طرف چلا آیا یہاں برآمدہ نہیں تھا اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ دروازے کے ساتھ کھڑکی بنی ہوئی تھی کھڑکی کے پٹ بھڑے ہوئے تھے دھکا دینے پر چو پٹ کھل گئے اندر گہب اندر عمارت طاری تھا تویر نے جیب میں سے موبائل باہر نکالا اور رائج آن کر کے کمرے کے اندر کا جائزہ لینے لگا۔ کمرہ آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ پلنگ کے پاس الماری رکھی تھی الماری کے اندر برتن تھے پلنگ کے اوپر چھت کے ساتھ ایک انسانی وجود الٹا لٹکا ہوا تھا اس کے گرد سیاہ جھلی کا محاصرہ تھا تویر کو اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

دور سے دیکھنے پر وہ وجود ایک بڑی چمکاؤت مشابہت رکھتا ہوا دکھائی دیتا تھا..... لیکن درحقیقت وہ انسان تھا اس کے ماتھے سے سچے سچے دو آنکھیں نکلی ہوئی تھیں جن کے اندر سیاہ چٹیلانہیں تھیں تویر نے ہڑبڑا کر کھڑکی کے پٹ بند کئے اور پکی سروک پر گھبراہٹ کے عالم میں آگے بڑھتے ہوئے سوچنے لگا کیا سویلی جزیرہ چمکاؤت نما انسانوں کا مسکن ہے خون اور گوشت چمکاؤتوں کا من کھا جا ہوتا ہے جزیرے کو چھوڑ دینا بہتر تھا۔ وہ دونوں ہزاروں کی تعداد میں رہائش پذیر چمکاؤتوں سے مقابلہ

کے کر سکتے تھے۔ درختوں کے درمیان میں راستہ طویل و طویل پہاڑی کے اوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہ اوپر کی طرف چل دیا۔ راستے کے دونوں کناروں پر برفریب درختوں کی جھاڑیاں تھیں سوچنے کی بات یہ بھی کیا اتنے عجیب صورت جزیرے کے خالق وہاں کے حیوانی رہائشی ہو سکتے تھے پکی سروکوں کا ایک جال تھا جو جزیرے کے اندر پھیلا ہوا تھا ہر قسم کی ضروریات سے مزین گھرتے گرجا لکری پکی عمارت تھی یہ سب ان خوابیدہ مقامی باشندوں کے بس سے باہر تھا۔

پہاڑی کی چوٹی پر سرسبز دھلوان تھی۔ جہاں سے نیچے نکلا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ تویر نے اپنا کوٹ اتار کر سرسبز گھاس پر پھیلا دیا اور اس پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اگلے دن بڑی عید تھی۔ اس کے گھر میں ہسائیوں کا تاننا بندھ جائے گا۔ قربانی کا گوشت تقسیم ہوگا بچے اور بڑے ذوق برق کپڑے پہن کر عید ملنے کے لئے رشتہ داروں کے گھروں کا رخ کریں گے۔ لیکن وہ ان باتوں سے بہت دور نکل چکا تھا۔ سویلی میں صرف تنہائی اور بے بسی کا عالم تھا یہاں زندگی محفوظ تھی لیکن اینڈ کی آلودشت سے محسوس ہوتی تھی۔ تنہائی کی ٹھنڈی آبیشار پھیلتے ہوئے جسم پر برقی تھی۔ لیکن اس ٹھنڈک میں معلوم ہی نہیں پائی جاتی تھی۔ قدموں کی ہلکی چاپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پہاڑی راستے پر کوئی ہلکے قدموں سے چلتا ہوا اوپر کی طرف

پراسرار وجود جو یقیناً جزیرے کا رہائشی نہیں تھا کیونکہ وہ دن کے وقت باہر تھا خاردار جھاڑیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ پھر جھاڑیوں کا اختتام ہوا اور وسیع رقبہ زمین پر سرسبز گھاس کے خٹلے کے درمیان چند درخت دکھائی دینے لگے۔

تویر نے جب سرسبز گھاس کے کھلے حصے میں قدم رکھا تب وہ وجود درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو کر نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ تویر درختوں کی طرف بڑھنے لگا۔ درختوں کے قریب پہنچنے پر اسے کسی لڑکی کی ہچکچاہٹ لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ عمر سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ لڑکی کی عمر بچپس سے تین کے درمیان ہو سکتی تھی تویر نے درختوں کے درمیان نگاہ دوڑائی۔

لڑکی گھٹے درخت کے نیچے رکھے ہوئے بہت بڑے پتھر پر بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ تویر نے اس کے سر پرے کا جائزہ لیا عمر اس کے اندازے کے عین میابقی بچپس سے کچھ اوپر تھی۔ وہ سرخ نیکر اور سفید شرٹ میں ملیں تھی۔ بھورے اور بے بال کمر سے نیچے تک چلے گئے تھے۔ وہ ٹینس شوخ پہنے ہوئے تھی اس کی آنکھوں کا رنگ بالوں سے مطابقت رکھتا ہوا براؤن تھا۔ ہونٹ سرخ اور رس بھرے تھے۔ تویر کھٹکی باندھے اسے دیکھے چلا جا رہا تھا اس کی نگاہوں کی حدت کو محسوس کرتے ہوئے لڑکی نے ہڑبڑا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھلی ہوئی خوبصورت بخند سے کی طرح پھڑپھڑا رہیں تھیں چھوٹا سا ناک پونچھنے کی وجہ سے ٹھنڈی طرح سرخ دکھائی دیتا تھا۔ چند لمحے کھٹکی باندھے تویر کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے سر پٹی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

تویر آگے بڑھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اور نرم لہجے میں بولا۔

”تمہاری طرح اس جزیرے کا رہائشی نہیں ہوں۔ قسمت کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔“ لڑکی نے تعجب بھرے لہجے میں دوبارہ پوچھا۔



”آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ کہ میں جزیرے کی رہائشی نہیں ہوں۔ اگر میں جزیرے پر ہوں تو پھر یہیں کے رہنے والی ہوں۔“

تویر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”جزیرے کے رہائشی سو رہے ہیں۔ جودن کے وقت جاتے ہیں وہ جزیرے کے رہائشی نہیں ہو سکتے۔“

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا اور اداس لہجے میں بولی۔

”تمہارا اندازہ درست ہے میں یہاں سے کافی دور لندن کے ایک شہر کی رہنے والی ہوں۔ سوئی جزیرے کے پاس ہمارا جہاز تباہ ہو گیا چندہ کے قریب لوگ سوئی تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے چگاڈوں نے انہیں برغمال بنالیا اور ایک مہینے کے دوران ان سب کا خون نچوڑ کر ان کے ڈھانچوں کو سمندر کے اندر پھینک دیا۔“

تویر نے کہا۔ ”لیکن تم زندہ سلامت ہو۔ ان چگاڈوں سے تمہاری جان خلاصی کیسے ہوئی؟“

لڑکی بولی۔ ”میری ستم نظری کہ سوئی جزیرے کی کرتا دھرتا زدیمری میم کے اکوٹے لڑکے جو شوا کو میری خوبصورتی بھائی اس نے مجھے جزیرے والوں کے حوالے کرنے کے بجائے مجھ سے شادی کر لی۔ اب وہ رات کو میرا خون نچوڑتا ہے اور صبح میں تنہائی میں بیٹھ کر آنسو بہاتی ہوں۔“

تویر کو اس معصوم لڑکی کی بے بسی پر فحش ہوا اور وہ تلی دینے کے لئے بولا۔

”میرے پاس موبائل ہے اگر تم اپنے گھریات کرنا چاہو تو کر سکتی ہو۔“

لڑکی بولی۔ ”مجھے سوئی پر رہتے ہوئے چھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں سب کچھ بھلا چکی ہوں مجھے یاد نہیں کہ گھر کا نمبر کیا تھا۔“

تویر نے پوچھا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

لڑکی نے بتایا۔ ”رینی۔“

تویر بولا۔ ”رینی ڈیئر تم فکر نہ کرو۔ یہاں سے فرار ہونا ہمارے لئے مشکل نہیں ہے میرے ساتھ سائی لیو

کے پاس اسٹیر ہے۔ وہ سوئی سے باہر نکلنے کے راستے سے بھی باخوبی آگاہ ہے۔ میں رات تمہارے متعلق اس سے بات کروں گا۔ وہ یقیناً تمہاری مدد کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے گا۔“

رینی نے کوئی جواب نہیں دیا اور چند لمحے ادھر ادھر کی بات چیت کرنے کے بعد تویر واپس کیمپن کی طرف آ گیا۔

سائی لیو کی واپسی دوپہر تین بجے کے بعد ہوئی۔ اس کے ساتھ اسٹیر میں ایک ہٹا لٹا ڈچ نوجوان بھی تھا۔ اسے جذام کا مرض لاحق تھا۔ جسم سے بدبو کے بھٹکے اٹھ رہے تھے۔ مرض حال ہی میں لاحق ہوا تھا اس لئے بیماری اب تک صحت پر اثر انداز نہ ہو سکی تھی ڈچ نوجوان کے ہاتھ پاؤں کوریسیوں سے باندھ کر اسے اسٹیر کے نچلے حصے میں لٹایا گیا تھا اسٹیر کو لٹکرا کر انداز کرنے کے بعد سائی لیو تویر کے ہمراہ خاموشی کے ساتھ کمرے میں چلا آیا اور کافی تیار کرنے لگا تویر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”کیا تم یہ سب ٹھیک کر رہے ہو؟“ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے کتنے گناہ مزید کروں گے۔ کیا اس نوجوان کو معلوم ہے کہ رات کو اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔“

سائی لیو سر دلچے میں بولا۔ ”اگر اسے معلوم ہوتا تب بھی کیا فرق پڑتا۔ اسے یہاں تک لانا میری مجبوری تھی۔ اگر نہیں لے کر آتا تو سوئی والے رات کو ہمارا خون چوس لیتے۔“ اس نے پانی سے بھری ہوئی کیتلی کو آتش دان میں دھکی ہوئی آگ پر رکھ دیا۔

تویر اس دفعہ نرم لہجے میں بولا۔ ”ہم سوئی سے دور کسی اور جزیرے میں بھی پناہ لے سکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہم چگاڈوں کے درمیان اپنے گناہوں میں مزید اضافہ کریں۔“

سائی لیو نے جواب دیا۔ ”اس جزیرے کے ارا گرد اور کوئی جزیرہ نہیں ہے اور دور دراز جو موجود ہیں وہ قانون کی بالادستی میں آتے ہیں۔ اس لئے قانون سے بچنے کے لئے یہ جزیرہ نہایت مناسب ہے۔“

تویر بولا۔ ”آج صبح جزیرے کی بالائی پہاڑی

زیدیمری ملاقات ایک مظلوم لڑکی سے ہوئی۔ وہ لڑکی سوئی کی رہائشی نہیں ہے۔ بلکہ لندن کی رہنے والی ہے۔ لڑکی نے زیدیمری میم کے لڑکے جو شوا سے اس سے زیدیمری میم کی لڑکی وہ جزیرے سے فرار ہونا چاہتی ہے اس کے لئے مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ تم اسے اسٹیر کے ذریعے بحری جہازوں کی گزرگاہ کے قریب چھوڑ کر آ سکتے ہو۔“

سائی لیو غصیلے لہجے میں بولا۔ ”جناب میں سوئی والوں سے راہ و رسم استوار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہوں اور آپ معاملے کو بگاڑنا چاہتے ہیں زیدیمری میم سے مجاہدہ طے کرنے کے لئے مجھے کتنے پاپڑیلے پڑے۔ اگر ان کے متعلق آپ کو معلوم ہو جائے تو شاید آپ دوبارہ ایسی بات نہ کرتے۔“

تویر بولا۔ ”لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا کسی مظلوم کو قربانی کی بیعت چڑھا کر اپنی زندگی کا تحفظ کرنا مجھے اخلاقی طور پر منظور نہیں۔“

سائی لیو نے طنز یہ لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا صنعت کاری لڑکی کو خواہ کرنا اخلاق کے دائرے میں آتا ہے۔ کیا اس کی لڑکی کو قتل کر کے ہم نے اخلاق کی حدود کو توڑیں پھلا لگا۔ صرف چند دنوں کی بات ہے جناب ملاقات کے بہتر ہوتے ہی ہم سوئی کو چھوڑ کر شہر منتقل ہو جائیں گے۔ اس وقت تک آپ مہربانی کر کے لڑکی کے چکر سے دوری رہئے۔ تو ہم دونوں کے حق میں بڑھوگا۔“

تویر خاموش ہو گیا۔ سائی لیو نے کافی پی ہونے کی نیت سے بستر پر لیٹ گیا لہجے اور تکلیف دہ لڑکی وجہ سے اس کا جسم جھکنے سے ٹوٹ رہا تھا۔ بستر لیٹنے ہی اس نے خراٹے لینے شروع کر دیئے۔

شام ہوتے ہی سوئی کے رہائشیوں نے گھروں سے باہر نکلتا شروع کیا وہ اس وقت عام حالات میں تھے ان کے جسم جھلی نما پروں سے مشتمل تھے لیکن بغور دیکھنے پر انہوں سے باہر نکلے ہوئے دو دانت صاف دکھائی دیتے تھے ان سب کا رنج چرچ کی عمارت کی طرف تھا۔ گھر لڑکی کے پاس کھڑا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے

اپنے پیچھے سائی لیو کی آواز سنائی دی۔

”جناب یہ سب رات کے طعام کے لئے چرچ سے منسلک میدان میں جمع ہو رہے ہیں ڈچ نوجوان کو اسٹیر سے نکال کر میدان تک پہنچانے کے لئے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔“ تویر نے اثبات میں سر ہلایا۔

اور دونوں مکان سے باہر نکل کر ساحل کی طرف چل دیئے سوئی کے رہائشی انہیں ملگلی باندھ دیکھتے رہے لیکن ان کی موجودگی سے وہ خائف یا پریشان نہیں تھے آسمان پر چگاڈوں کا غول بیانی گشت کر رہا تھا۔ صبح کے وقت خوب صورت اور دلچسپ دکھائی دینے والا جزیرہ اس وقت نہایت خوف ناک اور دل پر سنگین طاری کر دینے والا منظر پیش کر رہا تھا۔

ساحل سنسان پڑا تھا۔ اسٹیر کے پینڈے میں ڈچ نوجوان رسیوں سے بندھا مجبورے بسی کی تصویر بنا دکھائی دیا۔ اس کی بے بسی کو دیکھ کر تویر کو اپنا دل بوجھل ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ سائی لیو کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ کچھ دیر کے لئے تویر کے دل میں خوف پیدا ہوا۔ وہ سائی لیو کی سنگدلی کا معترف ہونے لگا۔ سائی لیو اپنے مفاد کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہو سکتا تھا کل کو اگر اس کی ذات پر بات آتی۔ تو وہ تویر کے ساتھ دعا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ایسا وقت آنے سے پہلے اسے اپنے مستقبل کے لئے کچھ سوچ لینا چاہئے تھا۔

سائی لیو نے ڈچ نوجوان کو کاندھے کے پاس سے تھاما۔ اور تویر کو اس کی ٹانگیں پکڑنے کے لئے کہا۔ نوجوان نے ہلکی سی مزاحمت کی کوششیں کی لیکن مضبوطی کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کی وجہ سے صرف کسمسا کر رہ گیا دونوں اسے اٹھائے اسٹیر سے باہر سوئی کی طرف چل دیئے۔

چگاڈوں کا مختصر شہر اب سنسان ہو گیا تھا۔ آسان براؤنی ہوئی چگاڈوں بھی دکھائی نہیں دے رہیں تھیں۔ لیکن چرچ کے پاس ماحول گرم تھا۔ وہ سب ملحقہ میدان میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ تویر اور سائی لیو کے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے سیاہ چلیوں کے بغیر

سفید آنکھوں سے انہیں گھورا پھر ان کے جھوم میں پانچل پیدا ہوئی۔ وہ ایک طرف کھسک کر جھوم کے درمیان میں راستہ بنا رہے تھے۔ اس راستے میں سے اونچے لمبے قد کی عورت نمودار ہوئی۔ وہ ٹیلیجنز اور سفید شرٹ میں ملبوس تھی اس کا صحت مند جسم لباس میں پیش نظر قیام سہایا تھا۔ سرخی بال کا اندھے کے پاس ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرہ خوبصورت اور دیدہ زیب تھا۔ لیکن اس کی تمام خوب صورتی کو حلقوں میں گھومتی ہوئی سفید حیوانی آنکھیں ماند کر رہی تھیں وہ چمکاؤں پر حکمرانی کرنے والی دوسری میم تھی۔

پر چگاڑوں کے لئے انسانی شکار لے کر آنے والا ہے اگر ہم اسیر کے تہہ خانے میں چھپ کر فرار ہونے کی کوشش کریں تو چگاڑوں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

رینی بولی۔ ”آپ نے ان کے متعلق غلط اندازہ لگایا ہے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں پرواز کرتی ہوئی اسیر کا تعاقب کریں گی پھر اس پر اتارنے کے بعد انسانی روپ دھارن کر کے ہمیں ختم کر دیں گی۔“

تویر نے اثبات میں سر ہلایا اور رینی کو دلاستہ دینے کے بعد گھر سے باہر نکل کر سو لی چرچ کی طرف آ گیا چرچ کا دروازہ منقل نہیں تھا ہال کمرے سے ملحقہ کمرے میں لکڑی کا سامان اور اوزار پڑے تھے تویر بہترین ترکان تھا لکڑی کا فرنیچر بنانے میں اسے اتھارنی حاصل تھی لیکن اسے اپنے اس ہنر سے سخت نفرت تھی اس لئے ملک کوچھوڑ کر دیار غیر چلا آیا تھا لکڑی کا سامان دیکھنے کے بعد اسے اندازہ لگنے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ یہاں مرنے والوں کی تدفین کے لئے تابوت تیار کئے جاتے تھے تاہم کافی عرصے سے کام بند تھا۔ لیکن سامان کمرے میں ہی رکھا ہوا تھا ساتھ والا کمرہ ہاتھ روم تھا۔ یہاں ہاتھک شب کے علاوہ شاور اور بالٹیاں رکھی ہوئیں تھیں پانی کی ٹنکی چھت پر تھی سیڑھیوں کے پاس تہہ خانے کا دروازہ تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔

تویر نے پندرہ منٹ کے دوران تمام چرچ کو کھنگال ڈالا لیکن تہہ خانے کی چابی وہاں نہیں تھی مجبوراً اسے تالا توڑنا پڑا۔ دروازے سے نیچے سیڑھیوں پر گھپ اندھیرا طاری تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے جیب میں سے لائٹر باہر نکالا اور روشن کرنے کے بعد تہہ خانے کے اندر اتارنے لگا سیڑھیوں کے لامتناہی سلسلے کو عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو تہہ خانے کے کچے فرش پر کھڑے ہوئے پایا۔ فرش پر پرانا اور بوسیدہ فرنیچر بکھرا ہوا تھا۔ اس فرنیچر کے درمیان میں سیاہ رنگ کا صندوق پڑا دکھائی دیا۔ وہ تہہ خانے کے دروازے کی طرح منقل نہیں تھا تویر نے اسے کھول دیا اندر سیاہ رنگ کی چڑے کی جھلی کے اندر سو لی کی تاریکی کتاب پوشیدہ تھی

تویر نے کتاب کو ہاتھوں میں اٹھایا اور میز پر رکھا۔ کرتبہ خانے سے باہر چلا آیا رہائی کمرہ خالی پڑا تھا سائی لیو ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اس کے آنے سے قبل وہ کتاب کا مطالعہ کر سکتا تھا چڑے کی جھلی کے اوپر چڑے کی ہی رسی لپٹی ہوئی تھی جسے گردے کر بند کیا گیا تھا تویر نے گردے کو کھول کر کتاب کو باہر نکالا وہ مختصر اور ہاتھ سے لکھی ہوئی سیاہ جلد پر مشتمل کتاب تھی۔ پہلے ورق پر سو لی کا حدود اور بعد تھا اور دوسرے صفحے پر سو لی کے رہائشیوں کی تفصیل بمع رہن و بہن بطور طریقے اور رسم و رواج کے متعلق تحریر تھا۔ وہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔

ایک صدی قبل جزیرہ سو لی کوئی غیر معمولی جزیرہ نہیں تھا یہاں کے رہائشی نہایت شریف انفس اور دین دار واقع ہوئے تھے۔ غیر معمولی حدود اور بے کی وجہ سے باہر سے آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی جو کچھ تھے وہ سفری جہازوں کی تباہی کے مرہون منت تھے اسے وقت میں جزیرے کو پراسرار بیماری نے آگھیرا سو لی والوں کے جسموں میں خون کی کمی پیدا ہونے لگی اموات کے سلسلے میں روانی آگئی سو لی کے رہائشی پریشان دکھائی دینے لگے انہوں نے جزیرے کے واحد درج ڈاکٹر سے رجوع کیا درج ڈاکٹر خود بھی بیماری کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس کے پاس بیماری کا سدباب نہیں تھا لیکن اس کے محدود دماغ کے مطابق خون کی کمی کو خون کی فراوانی سے دور کیا جاسکتا تھا اس لئے اس نے جزیرے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ مرنے والے رہائشیوں کے جسموں میں بیج چاٹنے والے خون سے استفادہ حاصل کر کے تیزی کے ساتھ پھیلتی ہوئی بیماری کو روک سکتے ہیں یہ ایک کراہیت آمیز طریقہ کار تھا۔ لیکن ان کے پاس مزید چارہ کار نہیں تھا اس لئے انہوں نے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

تب انہیں حیرت انگیز طور پر اپنے جسموں میں فائدہ مند قوتیں ابھڑائیں لیتی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ خون پینے کے عادت میں بری طرح مبتلا ہونے لگے میں ان دنوں سو لی کا پادری ہونے کی بدولت جزیرے کے پراسرار حدود اور رسم و رواج پر کتاب تحریر کرنے کی

کوششوں میں مصروف تھا۔

سو لی والوں کو غلط عادت میں مبتلا ہوتا دیکھ کر میں نے کتاب کو مکمل کرنے کا ارادہ ترک کیا۔ ان کو سمجھانے بجھانے لگا۔ حیرت انگیز طور پر وہ میری باتوں کو سن کر مشتعل دکھائی دینے لگے چند رہائشیوں کے علاوہ میوزی مرض کی تباہ کاریوں سے اب تک محفوظ تھے۔ انی تمام سو لی والوں نے میرے خلاف پانکٹ کر دیا وہ مجھے ختم کر دینے کے لئے بے چین دکھائی دینے لگے۔ مجھے یہ جان کر دل میں خوف محسوس ہونے لگا کہ میرا جسم سخت مہلک خوں سے لبریز تھا۔ اور ان سب کو خون کی ضرورت تھی ان کے خطرناک ارادوں کو بھانپنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو چرچ کی عمارت میں قید کر لیا اور جزیرے کے ساتھ کتاب کی تکمیل میں مصروف ہو گیا میں نے جزیرے میں پھیلنے والی بیماری کے متعلق تفصیل کے ساتھ تحریر کیا اب چند تفصیلات کے متعلق غلطی طور پر تحریر کرتا ہوں جن کو مد نظر رکھتے ہوئے خونی چگاڑوں کی شہر پسند فطرت سے بچنے کی تدبیر کی جاسکتی ہے۔

سو لی کی مخلوق عام چگاڑوں کی طرح روشنی سے رائف ہے اس لئے رات کے اندھیرے میں باہر نکلتی ہے شمشے کی چمک یا پھر شبیہ ان کے سیاہ جسموں پر بارودی گولے کی طرح اثر انداز ہوتی ہے پانی کی بوجھاڑ بھی ان کے حملے کے خلاف مفید ہتھیار ثابت ہو سکتی ہے ان کی تعداد میں کمی غیر معمولی طور پر اس بیماری کا باعث ہے خون کی عدم دستیابی کی وجہ سے انہیں کافی کافی عرصے ہوگا کہ ہمارے تباہ پختہ ہو کر ہی نسل کی کا باعث ہے میری چند سطر پر اس تحریر کی حیثیت رہتی ہیں۔

”چرچ کے باہر خونخوار چگاڑوں کا ہجوم میرے خون سے پیاس بجھانے کا منتظر ہے چند لمحے پہلے انہوں نے دروازے کو ٹوڑنے کا آغاز کر دیا ہے میرے اس حفاقی اقدام کے طور پر مرمومیوں کے علاوہ نارنج بھی ہے پانی کی چرچ میں کمی ہے لیکن میں ان چند ہتھیاروں کے ساتھ انہیں کچھ عرصے کے لئے مغموں لادوں میں کامیاب ہونے سے روک سکتا ہوں۔ میرے

خیال میں دروازہ ٹوٹ گیا ہے میں مدافعتی کارروائیوں کا آغاز کرتا ہوں۔“

تحریر یا چمک ہی ختم ہو گئی۔ میں نے کتاب کو بند کیا اور بستر کے کنارے پر رکھ دیا اس مختصر جدوجہد کے بعد اسے اپنے جسم میں چستی اور پھرتی کا فقدان محسوس ہونے لگا تھا۔ اس لئے کافی کے ساتھ ذیل روٹی کے چند ٹکڑے کھانے کے بعد وہ بستر پر بے سمد ہو کر گر گیا۔ رات کے قریب اسے ہوش آیا کمرے میں تاریکی کا راج تھا۔ سو لی کی چگاڑوں میں چرچ کا رخ کر آئی تھیں سائی لیو کمرے میں نہیں تھا اس کی غیر موجودگی کو محسوس کر کے تویر پریشان ہو گیا وہ گزشتہ رات اس وقت تک جزیرے پر آ گیا تھا۔

تویر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چگاڑوں نما انسان خوں کی صورت میں چرچ کی طرف رخ کر رہے تھے۔ وہ ان کی مخالف طرف سے نکلتے ہوئے ساحل سمندر پر آ گیا سمندر سنسان پڑا تھا۔ لہروں میں طوفان کی کیفیت ظاہر ہو رہی تھی۔ ہواؤں کی شدت میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا تھا ایسے عالم میں سمندر میں پوشیدہ چٹانیں خونی ہتھیار کا کام کرتی تھیں یقیناً سائی لیو ایسے ہی حادثے کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کی موت تویر کی موت کے مترادف تھی جزیرے والوں کو اگر خون دستیاب نہ ہوتا تو وہ تویر کے خون کے پیاسے ہو سکتے تھے۔ لیکن جزیرے سے اسیر کے بغیر فرار ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ ایک گھنٹہ انتظار کرتے رہنے کے بعد تویر واپس اپنے رہائشی کمرے میں چلا آیا چرچ کی عمارت کے پاس ولع میدان میں سو لی کے رہائشیوں کا ہجوم جمع تھا۔ ان کے تپہ خطرناک تھے میدان کا ماحول غیر انسانی آوازوں سے گونج رہا تھا۔

تویر کو اپنے رگ دپے میں خوف کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تاہم انہوں نے تویر کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی اور تویر کی کترا کراہنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بستر پر پڑے ہوئے موبائل کو اٹھایا اور اس کی ٹارچ کو روشن کر دیا چار جنگ کم ہونے کی بدولت روشنی میں شدت نہیں تھی لیکن کسی نہ کسی حد تک وہ



تویر کے کم آ سکتا تھا۔ اس نے کبل اوڑھا اور بستر پر لیٹ گیا بارہ بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی وہ لپک کر بستر سے نیچے اترتا۔

سانی لیو واپس آ گیا تھا۔ لیکن دروازے کے قریب پہنچتے پر اسے غیر انسانی آوازوں کی چرچاہٹ سنائی دی۔ وہ جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا کمرے کے باہر سویلی کے رہائی جمع ہو رہے تھے۔ تویر بولکھا ہٹ کے عالم میں کمرے میں کھڑکی کی طرف آ گیا اس نے با آہستگی کھڑکی کے پٹ کو کھولا اور باہر جھانکا۔ گپ اندھیرے میں اسے کچھ زیادہ دکھائی نہیں دیا تاہم متعدد انسانی سایوں کو اس نے کمرے کے گرد گھومتے ہوئے پایا۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی کو بند کر کے چٹنی اوپر چڑھا دی۔ اور بستر پر پڑے ہوئے موبائل کو اکھا کر نارنج روشن کر دی۔ پھر کبل مرنگ اوڑھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

دروازے کو اب دھکے دینے چاہنے لگے تھے چگا ڈڑوں کے غیر انسانی وجود جب دروازے کے ساتھ ٹکراتے جب دروازے کی چیلیں بل کر رہ جاتیں تویر کا اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ دروازہ زیادہ دیر تک اپنی جگہ پر قائم نہیں رہ پائے گا۔ وہ سوچنے لگا تہہ خانے میں رہی ہوئی کتاب میں اور کیا حفاظتی تدبیر لکھی گئی تھی۔ جس پر عمل کر کے وقتی طور پر ہی سہی چگا ڈڑوں کے خطرناک ارادوں سے بچا جاسکتا تھا۔

سورج کی روشنی رات کے وقت مفقود تھی شیشے کی چمک اور شیشے بھی کمرے میں نہیں تھی پانی کی بو چھاڑ والی تدبیر قابل عمل تھی اس کی سوچوں کا سلسلہ درمیان میں ہی رہ گیا اور کہیں تیزخانی کی آواز کے ساتھ بجلی گری اس کے ساتھ ہی طوفانی بارش کا آغاز ہو گیا کمرے سے باہر دروازے کو دھکا مارتے ہوئے غیر انسانی وجودوں میں کھلبلی مچی اور دروازے کو دھکا مارنے کے سلسلے میں کمی واقع ہونے لگی۔ پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ تویر نے طویل سانس لیتے ہوئے کبل کو ایک طرف پھینکا اور بستر سے اتر کر کھڑکی کی طرف چلا آیا۔ اس نے کھڑکی کو کھولنے کے بعد باہر جھانکا۔

طوفانی ہواؤں نے کھڑکی کے راستے کمرے میں کھنکے کی کوشش کی سردی کی بدولت اسے اپنے جسم میں پھریری اٹھتی محسوس ہوئی غیر انسانی سایوں کا مجموعہ اپنے کمروں کا رخ کر رہا تھا پانی کی بو چھاڑنے تویر کے چہرے کو بھگدیا اس نے کھڑکی کو جھٹکنے کے ساتھ بند کر دیا اور بستر پر بیٹھ کر سوچنے لگا سانی لیو کی بے وقوفی کی وجہ سے وہ سویلی میں پھنس کر رہ گیا تھا اگر وہ واپس نہیں آتا تو بارش رکنے کے بعد تویر کو سویلی جزیرے والوں کی خوراک بننے سے کوئی بھی بچا نہیں سکتا تھا۔ جزیرے سے فرار ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بہترین تیراک تھا اور سمندر میں تیر کر قریبی آبادی تک با آسانی رسائی حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن بیماری نے اس کے جسم کو زور کر کے رکھ دیا تھا۔ زیادہ مشقت و جدوجہد کرنا اس کے اختیار میں نہیں تھا رات کے کسی پہر اس کی آنکھ لگ گئی وہ گہری نیند سو گیا۔

دروازے پر ہلکی دستک نے اسے بیدار کیا تویر ہڑبڑا کر بستر سے نیچے آ آیا بارش اب بھی طوفانی انداز میں برس رہی تھی ایسے حالات میں چگا ڈڑوں کا گھروں سے باہر نکلنا ممکن نہیں تھا یقیناً سانی لیو واپس آ گیا تھا دستک دوبارہ ہوئی اس کے بعد رینی کی متوجش آواز سنائی دی۔

”تویر دروازہ کھولو..... جلدی کرو..... میں مشکل سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئی ہوں۔“ تویر نے آگے بڑھ کر دروازے کی چٹنی گرا دی۔ اور دروازہ کھول دیا وہ پانی سے شرابور سامنے کھڑی تھی دروازہ کھلتے ہی اندر چلی آئی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے کمرے میں داخل ہوتے ہی بولی۔

”تمہارا دوست انہیں وعدے کے مطابق انسانی لاش مہیا نہیں کر سکا۔ سویلی کی چگا ڈڑیں بہت مشتعل ہیں وہ تمہارے خون کی پیاسی تھیں لیکن بارش نے ان کے عزائم کو ختم نہیں کر کے رکھ دیا اپنی رہائش گاہوں کا رخ کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات میرے خون سے پیاس بجھائی جائے میں نے کبل از وقت چھپ کر ان کے ارادوں سے آگاہی حاصل کر لی

اور خاموشی کے ساتھ فرار ہو کر یہاں چلی آئی۔“  
تویر ہلنوں کی مانند اس کی بات چیت سننے میں مگن تھا۔ بات ختم کرنے کے بعد رینی نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے بھاگ چلو..... ورنہ وہ ہم دونوں کو کبھی بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

تویر ہڑبڑا کر بولا۔ ”سانی لیو جزیرے پر نہیں آیا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کا اسٹیر حادثے کا شکار ہو گیا ہے اور اسٹیر کے بغیر جزیرے سے باہر نکلنا ممکن نہیں۔“

رینی چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد بولی۔ ”چگا ڈڑیں شیشے اور پانی سے خائف ہیں روشنی ان پر زہریلی ششاعوں کی طرح اثر کرتی ہے ہمارے پاس شیشہ اور روشنی نہیں ہے لیکن سمندر کا پانی وافر مقدار میں ہے ہم اسے استعمال میں لا کر چگا ڈڑوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

تویر نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا۔ ”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“

رینی بولی۔ ”بات سامنے کی ہے۔ اگر ہم سمندر کی لہروں کے درمیان میں اپنی رہائش گاہ بنائیں تو وقتی طور پر چگا ڈڑوں کے شر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ وہ پانی میں داخل ہو کر ہم تک پہنچنے سے قاصر ہوں گی۔“

تویر بولا۔ ”لیکن ان کے پر نہیں ہم تک پہنچانے میں مدد دے سکتے ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق وہ اڑ کر سفر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔“

رینی نے جواب دیا۔ ”ہماری رہائش گاہ مکمل طور پر یکھو فلاج ہوگی۔ اور رہائش گاہ کے پینڈے میں پانی کی وافر مقدار موجود ہونی چاہئے ہم پانی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کریں گے۔“

تویر بولا۔ ”میرے خیال میں رہائش سے مراد کشتی ہے تمہاری تدبیر قابل عمل ہے۔ جزیرے میں کشتی بنانے کا سامان دستیاب ہے چرچ کی تلاش کے دوران میں نے وہاں پر ضرورت کی تمام اشیاء کو وافر مقدار میں موجود پایا تھا اگر ہم ابھی سے کام کا آغاز کریں تو دو تین دنوں کے دوران ایسی کشتی بنا سکتے ہیں جس کی چھت

کپسول کی مانند بند ہو۔“

رینی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ سب اسی وقت ممکن ہے جب تین دنوں تک چگا ڈڑوں کی طرف سے یلغار نہ ہو۔ بارش کے رکنے ہی وہ مسئلہ کا آغاز کر دیں گی۔“

تویر بولا۔ ”چرچ کی چھت پر میں نے پانی کی وسیع ٹینکی دیکھی تھی۔ ہم آج کی رات اسے پانی سے بھر دیں گے تاکہ حسب ضرورت اسے استعمال کر کے چگا ڈڑوں سے بچا جاسکے۔“ رینی نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں کمرے سے باہر نکلنے کے بعد چرچ کی طرف چل دیئے۔ بارش طوفانی انداز میں برس رہی تھی۔ سردی کی شدت میں کافی حد تک اضافہ ہو گیا تھا لیکن انہیں کسی بات کی پروا نہیں تھی۔

سویلی جزیرہ سنسان پڑا تھا۔ چرچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ اندر داخل ہو گئے ہال کمرے میں آتش دان کے پاس لکڑیوں کا ڈھیر پڑا تھا تویر نے لائٹ کی مدد سے آتش دان کو روشن کیا اور جسم کو کسی حد تک گرم کرنے کے بعد دونوں نے پلاسٹک کی بالٹیاں اٹھائیں اور سمندر کے پانی کو ٹینکی میں بھرنے کا آغاز کر دیا۔ یہ ایک دشوار ترین اور تکلیف دے کام تھا لیکن ان دونوں کے پاس مزید چارہ کار نہیں تھا تویر کے جسم میں طاقت نہ ہونے کے برابر تھی لیکن گرتے پڑتے آخر کار ان دونوں نے وسیع و عریض ٹینکی کو آدھے سے زیادہ بھر لیا لیکن بارش میں بھینکنے کی وجہ سے صبح کے قریب تویر کو بخار نے آ گھیرا۔ جزیرے پر بیماری کے افات کے لئے کچھ نہیں تھا اس لئے وہ دھپکتے ہوئے آتش دان کے قریب ادھ موا ہو کر لیٹ گیا رینی اس کے سر ہانے بیٹھ کر اس کا سر دبائے لگی اس کے لبوں پر بارش نہ رکنے کی دعا تھی صبح سات بجے کے قریب بارش کی شدت میں مزید اضافہ ہو گیا۔

سمندر کی طوفانی موجوں نے جزیرے کو گھیرے میں لینے کے بعد تباہ کاریوں کا آغاز کر دیا سویلی کی گلیوں اور میدانوں میں پانی بھرنے لگا دوپہر کے ڈیڑھ بجے کے قریب تویر کو فاقہ محسوس ہوا اور بخار کی شدت میں کمی واقع

ہونے لگی۔ تاہم جسم میں کمزوری بہت تھی۔ ربی کی اپنی طبیعت ناساز تھی تمام رات بارش میں بیٹھنے کی وجہ سے اسے جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن صحت مند جسم کی وجہ سے مشقت طلب کام کرنے کے باوجود بھی کسی حد تک تازہ دم تھی۔ تنویر کے بیدار ہونے کے بعد اس نے طوفانی بارش کے درمیان دوبارہ رہائشی کمرے کا رخ کیا۔ اور کھانے پینے کا تمام سامان چرچ کی عمارت میں منتقل کر دیا اس سامان میں سوکھے گوشت کی کثرت تھی دونوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور دوبارہ کشتی بنانے کا آغاز کرنے سے قبل تنویر نے ہاتھ روم میں لگے ہوئے شاور کو باہر نکال کر اسے چرچ کے دروازے کے اوپر نصب کرنے کے بعد اسے پانی کے کنکشن سے منسلک کر دیا قدرت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

آسمان سے پانی چھا جوں برس رہا تھا اور سولہ کی جزیہ پانی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ چرچ کی عمارت اونچی جگہ پر قائم ہونے کی وجہ سے پانی کے ریلے سے محفوظ تھی تاہم سولہ کی رہائشی مکان نیچے بنے ہونے کی وجہ سے پانی میں ڈوبنے لگے تھے یہ پانی چگاڑوں کے لئے ہلک تھا لیکن ربی کے کہنے کے مطابق چونکہ چگاڑوں مکان کی چھتوں کے ساتھ اتنی لگی ہوئی تھیں اس لئے جب تک سمندر کا پانی مکان میں لمبا باہر جاتا اس وقت سے پہلے چگاڑوں کا کچھ بھی نہیں لگاؤ سکتا تھا کشتی بمبلی مراحل میں تھی کام تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا چرچ میں تابوت بنانے کے لئے متعدد تختے پڑے تھے۔ تاہم کشتی کی چھت بنانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا۔

شام تک کچھ بھی کھائے پئے بغیر وہ دونوں کام میں لگن رہے اس دوران مختصر وقت کے لئے بارش کی شدت میں کمی واقع ہوئی پھر دوبارہ سلسلے کا آغاز ہو گیا ربی وقتاً فوقتاً چرچ سے باہر نکل کر حالات کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے کر آتی رہی تھی۔ سمندر کا پانی مکانات میں کافی حد تک بھر گیا تھا اور مختصر مقدار نے اب چرچ کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا ربی نے دروازے کو اچھی طرح بند کرنے کے بعد دروازے کے خلاء میں

کپڑے ٹھونس دیئے لیکن پانی کی روانی میں کمی واقع نہ ہو سکی۔ مدت کو تنویر کو دوبارہ بخار چڑھ گیا اس نے بے دلی کے ساتھ کھانا کھایا اور چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد دوبارہ کام میں جت گیا۔

صبح کے قریب کشتی کا آدھا ڈھانچا تیار ہو گیا اسے مکمل کرنے کے لئے تنویر کو مزید ایک دن درکار تھا جس بجے کے قریب بارش اچانک ہی رک گئی اور بادلوں سے سورج کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ صوب کی نمازت میں زیادہ حد تک تازہ ہوئی لیکن چمکدار ضرورت تھی اگر بارش کا سلسلہ دوبارہ شروع نہ ہوتا تو تنویر اور ربی کو سورج غروب ہونے سے قبل کشتی کو تیار کر کے سمندر میں اتارنا تھا بصورت دیگر انہیں آج کی رات چگاڑوں کا مقابلہ کرنا تھا۔

دونوں تیزی کے ساتھ کام میں جت گئے اب انہیں کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ ناساز طبیعت کی وجہ سے تنویر کے رویے میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا تھا وہ بات بے بات ربی کو کھڑک رہا تھا ربی کو اس کی کیفیت کا احساس تھا اس لئے خاموشی کے ساتھ سر جھکائے نہایت تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کام میں مصروف تھی۔

دوپہر تک کشتی کا نچلا تمام حصہ مکمل ہو گیا اب صرف اس کے اوپری حصے کو کشتی کی مدد سے بند کر کے مکمل کرنا باقی رہ گیا تھا تنویر کو شدت کے ساتھ بھوک کا احساس ہو رہا تھا اس نے صبح سے ناشتے کے بعد کچھ بھی نہیں کھایا تھا ربی نے چند گوشت کے ٹکڑے آگ پر بھون کر آلو کے قلوں کے ساتھ اس کے سامنے رکھ دیئے تنویر نے بے صبری کے ساتھ ان پر ہاتھ صاف کیا اسے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی لیکن کھڑے ہونے ہی چکر آ گیا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر گیا ربی نے پریشان نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر قریب پڑی ہوئی بائیس سے پانی نکال کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے لیکن تنویر کی بے ہوشی میں فرق نہیں پڑا۔

پھر ربی نے ہر طرح کے جتن کر لئے لیکن تنویر کو ہوش نہیں آیا۔ رات سر پر آ گئی۔ اور چگاڑوں کے نکلنے کا وقت قریب آ گیا۔ اگر تنویر ہوش میں نہ آتا

تو اسے آج کی رات چگاڑوں سے اکیلے مقابلہ کرنا تھا۔ وہ ایسا باخوبی کر سکتی تھی پانی کا شاور چرچ کے ماتھے پر نصب تھا۔ صرف وال کھولنے کی دیر تھی چرچ کے دروازے پر معنوی بارش کا آغاز ہو جانا تھا۔

رات ہونے سے قبل ربی نے چرچ کے داخلی دروازے کو اچھی طرح بند کر کے کٹڑی لگا دی چھت کا دروازہ پہلے سے ہی بند تھا۔ وال کھول کر اس نے پانی کے اخراج کا جائزہ لیا۔ پھر مطمئن ہو کر کٹڑی کے نیچے پریشہ کر چگاڑوں کا انتظار کرنے لگی۔ وقت نہایت تیزی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ چرچ کی عمارت کے باہر کھمبیر خاموشی طاری تھی۔ ہال کمرے کے کھڑیاں نے آٹھ بجنے کا اعلان کیا اس وقت تک عموماً چگاڑوں اپنے آشیانیوں سے باہر آ جاتی تھیں لیکن خلاف معمول آج ایسا نہیں تھا چرچ کے باہر بنے ہوئے میدان میں آج الو بول رہے تھے نوجبے تنویر کے جسم میں نحیف حرکت پیدا ہوئی اور اس نے چند لمحے کسمانے کے بعد آکھیں کھول دیں کچھ دیر لا شعوری کے عالم میں ربی کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا۔ اس کا دماغ کچھ اٹھنے کی زردی کی طرح ٹل رہا تھا آنکھوں کے آگے اندھیرا طاری ہونے لگا تھا۔ وہ دوبارہ زمین پر لیٹ گیا۔ ربی نے اس کی خیریت دریافت کی۔

تنویر بوجھل لہجے میں بولا۔ ”میری طبیعت بہت خراب ہے۔ کشتی کو مکمل کرنا اب میرے لئے ممکن نہیں ہے میرے خیال میں آج کی رات چرچ میں بسر کرنے کے بعد کل صبح یہاں سے قریبی آبادی کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔“

ربی بولی۔ ”وہ آج چرچ والے میدان میں نہیں آئے۔ اگر رات کو فرار ہونے کی کوشش کریں تو میرے خیال میں زیادہ بہتر ہوگا۔“ تنویر نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں کشتی کا اوپری حصہ کھلا ہوا ہے۔ اگر انہوں

نے رات کے وقت حملہ کیا۔ تو ہمارے پاس چھپنے کی جگہ نہیں ہوگی۔ اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ چرچ کے دروازے پر لگی دیو سنگ ہوئی ربی اور تنویر نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ربی بولی۔

”مجھے سولہ والوں سے تیز و احرام کی توقع نہیں ہے وہ دروازے پر دستک دینے کے بجائے اسے توڑنے کو مناسب خیال کرتے ہیں یہ ضرور سولہ سے باہر کا کوئی بھٹکا ہوا مسافر ہو سکتا ہے۔“

تنویر نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ ”بھلا کون.....؟“ پھر خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

”ہاں یقیناً گزشتہ رات کے طوفان کے بعد کوئی بھٹکا ہوا مسافر سولہ کی طرف آ سکتا ہے تم دروازے کے پاس جا کر دریافت کرو۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔ اس دفعہ شدت زیادہ تھی۔ ربی اٹھ کر دروازے کے پاس چلی آئی۔ اس نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”باہر کون ہے.....؟“

جواب میں خاموشی طاری رہی۔ پھر دوبارہ دستک ہوئی۔ ربی حیرتزلزل لہجے میں با آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اپنی شخصیت اور آمد کے متعلق نہیں بتاؤ گے تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ جواب میں پھر دستک ہوئی پھر کسی کے ہانپنے کی آواز سنائی دی لیکن جواب اس دفعہ بھی موصول نہیں ہوا۔ ربی تنویر کے پاس آ گئی۔ اور پریشان لہجے میں بولی۔

”وہ جواب نہیں دے رہا۔“ حالات کی تھکنی کو مد نظر رکھتے ہوئے بغیر جانکاری کے دروازہ کھولنا سراسر بے وقوفی کے زمرے میں آ سکتا ہے میرے خیال میں ہمیں صبح تک انتظار کر لینا چاہئے۔

تنویر نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ کہ ایک دفعہ پھر دستک ہوئی اس کے فوراً بعد کی آدمی کی ٹڈھال آواز سنائی دی۔ تنویر اس آواز کو اٹھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ سائی لیو کی آواز تھی۔ اور تنویر کو دروازہ کھولنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ تنویر نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔



## خونی درندہ

راجلہ عباس - بستی فتنے والی

جرم و سزا کی ایک انمٹ کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی اور پڑھنے والا خود کو ایک انجان حیرتناک اور خوفناک دنیا میں محسوس کرے گا، حقیقت کا پردہ چاک کرتی انوکھی کہانی

جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتی عجیب و غریب دل دہلائی اور اجنبی میں ڈالتی کہانی

میں کسی کام کے سلسلے میں ڈاؤن آؤٹ آئی تھی۔ اگر یہاں بارش شروع ہوگئی۔ تو کیا کروں گا۔ رات کہاں سر کروں گا اپنے خیالوں میں کم بائیک چلا رہا تھا اچانک بائیک کسی پتھر سے ٹکرائی اور گرتی چلی گئی۔ جس کی وجہ سے میری ٹانگ شدید زخمی ہوگئی اور تیزی سے خون بہنے لگا۔ جلدی سے اپنی شرٹ اتار کر ٹانگ پر باندھ لی۔ اور اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد کسی آبادی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور پھر ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ

میں کسی کام کے سلسلے میں ڈاؤن آؤٹ آئی تھی۔ اگر یہاں بارش شروع ہوگئی۔ تو کیا کروں گا۔ رات کہاں سر کروں گا اپنے خیالوں میں کم بائیک چلا رہا تھا اچانک بائیک کسی پتھر سے ٹکرائی اور گرتی چلی گئی۔ جس کی وجہ سے میری ٹانگ شدید زخمی ہوگئی اور تیزی سے خون بہنے لگا۔ جلدی سے اپنی شرٹ اتار کر ٹانگ پر باندھ لی۔ اور اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد کسی آبادی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور پھر ایسا کرنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ

”خون کی کمی کی بدولت مجھے ہلکا جلتا بھی دشوار محسوس ہو رہا ہے اور تم تکلیف دہ سفر کی بات کر رہے ہو؟ یہ ناممکن ہے۔“

سائی لیو بولا۔  
”خون کی کمی کو خون کی دستیابی سے دور کیا جاسکتا ہے آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا۔“ تو میرے انکار میں سر ہلایا۔ سائی لیو نے معنی خیز انداز میں رہی کے صحت مند جسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
”اگر ایک انسان کی قربانی سے دو کی جانیں بچ سکتی ہیں تو میرے خیال میں مضائقہ نہیں ہے۔“ رہی نے دروازے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن سائی لیو نے اسے اپنی مضبوط گرفت میں قید کر لیا اور دانت اس کی گردن میں گاڑ دیے۔

☆.....☆.....☆

اگلی بڑی عید پر تو بزرگ گھر والوں کو خط لکھ رہا تھا۔  
”میں جزیرہ سوئلی پر خیریت سے ہوں۔ میری طبیعت اب پہلے سے کچھ بہتر ہے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق جسم میں خون پیدا کرنے والے جراثیموں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے اس لئے خون کی مقدار کم ہوتی چلی جا رہی ہے آپ سب کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میں نے خطرناک بیماری کا علاج دریافت کر لیا ہے میں اب سوئلی کا مستقل رہائشی ہوں جزیرے کے لوگ اپنے کام سے غرض رکھنے والے بے خود انسان ہیں مجھے ان سے کچھ خاص توقع وابستہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ میری بیماری میں مددگار ثابت ہو رہے ہیں جزیرے پر ڈاک کا انتظام نہیں ہے اس لئے خط کو ارسال کرنے کے لئے مجھے دینا جزیرے پر جانا ہوگا میں وہاں روانہ ہو جاتا ہوں یہ سب میرے کام کا ایک حصہ ہے گھر کے تمام افراد کو میرا سلام دیجیے گا جلد از جلد واپس وطن آنے کی کوشش کروں گا۔“

آپ کا تنویر



لیکن پھر سر کو تھام کر رہ گیا۔  
رہی نے دریافت کیا۔ ”کون ہے؟ کیا تمہارا کیا کوئی جاننے والا ہے۔“

تنویر نے جواب دیا۔ ”میرا ساقی لیو ہے۔ وہ جزیرے پر واپس آ گیا ہے۔ تم دروازہ کھول دو۔“ رہی آٹھ کدروں کے طرف چل دی۔ اس نے کڑی گرائی اور دروازے کو کھول دیا سائی لیو نے نہایت خستہ حالت میں سامنے کھڑا تھا اس کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا۔ اور جسم کمزوری کی بدولت پیش قدمی کے عالم میں کانپ رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ ٹوٹ پھوٹتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر آ گیا اور تنویر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”جناب مجھے معاف کر دیجیے گا۔ لیکن راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے میں کل رات سوئلی نہ آ سکا آج تمام دن طوفانی لہروں کا مقابلہ کرنے کے بعد جب میں نے جزیرے پر قدم رکھا تو چرچ میں آنے کے بجائے سیدھا زومیری بیم کے مکان کی طرف چلا گیا۔ میں نے اسے دیگر فتنہ حالات سے آگاہ کیا اور لاش کا انتظام نہ کرنے پر پشیمانی کا اظہار کیا۔ تمام چوگاؤں میں گزشتہ دن سے بھوکے ہونے کی وجہ سے نہایت مشکل محسوس ہونے لگا کونہ پا کر وہ سب آپ سے باہر ہو گئیں لیکن زومیری بیم نے انہیں قابو کیا۔ اور میرے جسم کے ساتھ لپٹ گئی اس نے مجھے اپنے آپ سے اس وقت تک علیحدہ نہیں کیا جب تک خون سے اس کی پیاس نہ بجھ گئی۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔

”اگر کل لاش کا بندوبست نہ ہوا۔ تو کچھ ایسا ہی دوسرے دن بھی ہوگا۔ وہاں سے جان خلاصی کے بعد میں گرتا پڑتا آپ کے پاس چلا آیا میری آپ سے درخواست ہے کہ میرے کام کا بیڑہ اب آپ کو سنبھالنا ہوگا اسٹیمر ساحل پر ٹنگر انداز ہے۔ کل صبح آپ کو دینا آئر لینڈ کے راستے کے متعلق تفصیل کے ساتھ آگاہ کروں گا۔ انہیں ہر روز ایک لاش دستیاب ہے ورنہ جو حال میرا ہوا ہے وہی کل آپ کا بھی ہو سکتا ہے۔“  
تنویر نے تھکتا ہوا بھرے لہجے میں جواب دیا۔



تھوڑی دور آبادی کے آثار نظر آنے لگے جس کو دیکھ کر مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ لیکن قریب پہنچ کر ایسا محسوس ہوا۔ شاید یہ گاؤں صدیوں سے یوں ہی سنامن پڑا ہے یہاں سے کوئی انسان گزر کر بھی نہ گیا ہو۔ لیکن کچھ مکان ابھی بھی اپنی اصلی حالت میں تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرے حواس اٹھ گئے مجھے یہ جب چلا جب تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ بہت زیادہ سوچہ بوجھ کے بعد میں نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک بار دروازہ تین بار آخر مایوس ہو کر جانے ہی والا تھا کہ اندر سے آواز آئی۔

مہربانی کر کے راکھش ہمیں بخش دو، ہماری جان چھوڑ دو روتا بلکتا بزرگ پتہ نہیں کسی کی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پھر دروازہ ٹوک کیا تو بزرگ آ دی کے رونے میں روئی آ گئی۔

”اللہ کی قسم راکھش چلے جاؤ۔ میرا ایک بیٹا میرے پاس رہنے دو چلے جاؤ۔“ مجھے یہ راز سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس گاؤں کے لوگ کسی بڑی مشکل میں گھرے ہوئے ہیں۔ ٹانگ کی رودی دیر سے میں زیادہ دیر تک نہیں سکتا تھا میں نے آواز دی۔ اگلے میں ایک مسافر ہوں اور طوفانی بارش والی رات آپ کے گھر گزرا جاتا ہوں خدا کے نام پر یقین کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر میں رات گزارنے دیں۔ میں آپ لوگوں کو کسی بھی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔“

اندر سے آواز آئی۔ ”تمہارا نام کیا ہے۔“ ”میرا نام حسن عزیز ہے۔“ تقریباً دو تین منٹ کے بعد دروازہ کھولا گیا۔ میں بائیک لے کر اس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ بزرگ نے مجھے ایک علیحدہ چھوٹے سے کمرے میں رات بسر کرنے کے لئے کہا۔ میں ایسی چیز کو غنیمت جانتے ہوئے اس کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ساری رات اس گاؤں کے بارے میں سوچتا رہا۔ پتہ نہیں کب آگ لگے گی اور جب آگ لگے گی تو دن اچھا خاصا دن چڑھ جائے گا اور پورے گاؤں میں روغن بحال تھی۔ اس روغن کو دیکھ کر یقین ہوتا کہ یہ گاؤں آباد ہے۔ تب میرے ذہن میں وہ رات والا منظر گھومتا لگا جہاں

چاروں طرف خاموشی کا راج تھا۔ کسی بھی گھر سے روشنی نہیں نکل رہی تھی۔ لیکن زیادہ دیر میں اپنے خیالوں میں نہ رہا۔ اور ادھاری کی تیاری کرنے لگا میں نے اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور ادھاری کا راستہ ناپا اور دل میں یہ ارادہ کیا کہ میں ان گاؤں والوں کی مدد ضرور کروں گا۔ کیونکہ اب میں جلدی میں تھا۔ اور گھر والوں کو بھی نہیں بتایا تھا سب لوگ دیکھنے میں تو خوش تھے لیکن چہرے پر خوف کے سائے برقرار تھے۔ سارے راستے میں سوچتا آیا جب گھر پہنچا تو سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

”کہاں گئے تھے اور رات کہاں بسر کی۔“ تو میں نے سارا واقعہ گھر والوں کی گوش گزار کر دیا۔ جس کون کرب پریشان ہو گئے۔ مجھے یقین تھا کہ میرا دوست اعتراف عرف جج میری اس کام میں مدد کر سکتا ہے جب میں نے یہ بات جج کو بتائی تو وہ میرے ساتھ اس گاؤں والوں کی مدد کرنے پر رضامند ہو گیا اور پھر ہم نے گھر والوں سے اجازت لی اور ایک نیک مشن پروانہ ہو گئے۔

آج جتنی خوشی مجھے ہو رہی تھی شاید زندگی میں اتنی بڑی خوشی نہ ملی ہو۔ تقریباً عصر کے ناظر ہم اس گاؤں میں پہنچ گئے۔ وہ بزرگ بڑی خوش دلی سے ہمیں ملیں اور ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ اور پہلے والے واقعہ پر اچھا خاصا شرمندہ ہونے لگے۔

”اگلے کوئی بات نہیں آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ ہم دونوں دوست آپ لوگوں کی مدد کے لئے آئے ہیں۔“ بزرگ بولے۔ ”بیٹا ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔“

”اگلے آپ کا نام کیا ہے۔“ ”بیٹا میرا نام اسحاق ہے اور میرے بیٹے کا نام محمد فیضان احمد فیضی ہے۔“

”بابا میرا نام حسن عزیز ہے اور یہ میرے دوست ہیں اس کا نام اعتراف عرف جج ہے۔“ اگلے میں وہ لڑکا ہوں جو طوفانی بارش میں آپ کے گھر رات گزارنے آئے تھا۔ تب میں آپ لوگوں کے حالات دیکھ کر گھبرا گیا تو میں نے اپنے گھر والوں کو بتایا تو میرے دوست نے کہا کہ ہم آپ لوگوں

کی مدد کریں گے سو ہم دونوں آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔“ یہ سنتے ہی باباجی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”بیٹا جہاں پورے کا پورا گاؤں ہار گیا ہے وہاں تم دونوں کیا کر لو گے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ جوج ہو جیت اس کی ہوتی ہے۔ سو دن چور کا ایک دن سادکا ہوتا ہے۔“ ”جوج بات ہمت بہادری سے لڑی جائے جیت اسی کی ہوتی ہے۔“

”ہمیں اس پاک کتاب پر پورا یقین ہے جس کی بدولت ہم ہاری ہوئی بازی بھی جیت سکتے ہیں۔“

باباجی جلدی سے اٹھے اور باہر کا دروازہ بند کر کے اچھی طرح چیک کیا اور پھر ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ آنکھوں سے آنسو صاف کر کے اپنی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔

”بیٹا میں تو یہ دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات آپ دونوں کو اس نیک کام میں کامیابی عطا کرے اور تمہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔“ اور ہم دونوں نے کھل دل سے (آمین) کہا۔

”بیٹا یہ کوئی آج سے 5 سال قبل کی بات ہے کہ ہمارے اس ہتے تھکتے گاؤں کو کسی بد نظر لگتی 11 ستمبر کی رات میں ایک انہونی آئی جس میں ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی اغوا ہوئی جس پر گاؤں والوں نے مختلف قسم کی باتیں کیں۔ جس کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کی ماں اس دنیا سے چل بسی۔ تیسرے روز اس لڑکی کی لاش آبادی سے تھوڑی دور پہاڑیوں سے ملی۔ جس کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ زیادتی کے بعد جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو اس کا جسم لٹھے کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ جس کو دیکھ کر سارے گاؤں والے دنگ رہ گئے۔ جس کو گاؤں والوں نے چپ چاپ آبائی قبرستان میں دفن دیا۔ اور پھر تیسرے دن میرا بیٹا لاپتہ ہو گیا اگلے دن اس کی لاش بھی وہی سے ملی جس کی حالت اس لڑکی سے مختلف نہ تھی، جتنے منہ اتنی باتیں ہوتی رہیں۔“

”کوئی کہتا اس نے اس لڑکی کے ساتھ ظلم کیا ہوگا جس کے کارن اس لڑکی کی روح نے اس کا یہ

حال کر دیا لیکن میرا دل یہ بات ماننے سے انکار کرتا تھا کہ میرا بیٹا ایسی حرکت نہیں کر سکتا مگر میری بات پر کسی نے یقین نہ کیا اور مجھے یوں روتا بلکتا چھوڑ کر سب اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ اور پھر میں نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنے بیٹے کو ان بد نصیب ہاتھوں سے کفن دے کر منوں مٹی تلے دیا۔“

باباجی کے رونے میں روئی آ گئی۔ ہم نے بھی باباجی کو رونے کا موقع دیا اور پھر وہی سے سلسلہ شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

”پھر ایسے واقعات کا ہونا معمول بن گیا کسی کی بیٹی تو کسی کا بیٹا روز اغوا ہوتا تو اس کی لاش بری حالت میں گاؤں سے باہر پڑتی جسم سے سارا خون نچوڑنے کی وجہ سے موت ہوتی۔ اور جسم پر مختلف قسم کے نشانات پائے جاتے۔ جس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ کسی درندے کے دانتوں کے نشان ہیں۔ جو جسم کے مختلف حصوں کو ادھیڑ کر سارا خون چوس جاتا ہے۔“

جج بولا۔ ”ایک منٹ بابا۔ (تسی بریک تے پیر رکھو) مجھے ایک بات بھضم نہیں ہوئی بڑی کی ہر لاش سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ زیادتی کے بعد جسم سے سارا خون نچوڑا گیا ہے اور پھر جسم پر درندے کے نشان یہ ظاہر نہیں کرتا کہ یہ کسی انسان کا کام ہے۔“ جس پر میں نے بھرپور اتفاق کیا۔

میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے اگلے اس درندے کو کسی نے پال رکھا ہو اور اس کی خوراک انسانی خون ہو۔ وہ درندہ خون پیتا ہو اور انسان ہر عورت کو اپنی دلی تسکین کے لئے استعمال کرتا ہو۔“

لیکن اگلے نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ ”میں بیٹا میں نے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ راکھش کی طرح لہبا چڑا تقریباً 8 فٹ اس کا قد ہوگا میں نے اسے خود اپنی بیٹی کو اغوا کر جاتے دیکھا ہے لیکن یہ بد نصیب باپ اپنی بیٹی کے لئے کچھ نہ کر سکا۔ کچھ نہ کر سکا۔“ اور دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھ کر رونے لگا۔

اور پھر ہم دونوں اٹھ کر باہر آ گئے پھر ہم نے پلان



## خون آشام

صفر علی - فیصل آباد

خونی مخلوق کی دیدہ دلیری رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ایسا لگتا کہ موت نے ہر طرف اپنے نوکیلے پنچے گاڑ دیئے ہیں ہر طرف خوف و ہراس پھیل جاتا اور پھر.....

خوف کے افق پر چنگھاڑتی ہوئی..... عجیب الحلقہ مخلوق کی ناقابل یقین..... کہانی

پہلے ہی دو مہینوں کی خوراک گھروں میں ذخیرہ کر لیتے کیونکہ شدید برفباری کی وجہ سے پورا گاؤں ٹھہر جاتا۔ اور پھر اس عرصے کے دروان سورج بھی نہیں نکلتا تھا۔ رات کے تقریباً بارہ بجے کا وقت ہوگا کہ اچانک ہی ایک سایہ حرکت میں آیا جو برف پر چلتا ہوا فرڈ کے گھر کے آگے رکا۔ فرڈ کا گھر گاؤں کے سرے پر تھا۔ دروازہ بجایا گیا۔ فرڈ اور اس کی بیوی جاگ اٹھے۔ فرڈ دروازے

خون لہج نامی یہ چھوٹا سا قصبہ تقریباً ستر گھروں پر مشتمل ہوگا۔ یہ قصبہ بجلی اور گیس جیسی سہولتوں سے محروم تھا۔ لیکن یہاں پر رہنے والے اس پسند لوگوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ قصبہ چاروں طرف سے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ جس پر حکومت کوئی خاص توجہ نہیں دیتی تھی۔ یہاں کے لوگ نہایت سادگی سے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لوگ سردیاں شروع ہونے سے

دو منٹ میں پولیس وہاں پہنچ چکی تھی ایک آفیسر نے جب دروازہ کھولا تو اگلا منظر دیکھ کر سب دنگ رہ گئے کہ ایک درندہ نما مشین اس لڑکی کے اوپر حرکت کر رہی ہے۔ جس کے ذریعے بڑی بے دردی سے اس لڑکی کے جسم سے خون نکالا جا رہا تھا۔ جیج کے ہاتھ میں جو آیا اس نے مار مار کر مشین کو توڑ دیا مشین میں جمع شدہ خون نیچے بہنے لگا اور وہ دونوں شخص جلدی سے خون چاٹنے لگے اس منظر کو دیکھ کر مجھے آنے شروع ہو گئی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا اتنے میں افسران دونوں آدمیوں کو اٹھڑی لگا چکا تھا اور اس مکان کے اندر سے ہزاروں بوتلیں خون کی برآمد ہوئیں اور ایسے کئی راہکشش ملے جن کو کپکپڑ کے ذریعے چلاتے تھے اور خونی مشین جن کے ذریعے خون نکالتے تھے پولیس والوں نے سب سامان اپنی گاڑی میں رکھ لیا دیکھنے والی ہر آنکھ اٹھ بار بھی کہ اس طرح کے شیطان بھی اس دنیا میں ہیں جو کہ دوسرے انسانوں کا خون چوستے ہیں۔ اتنے میں گاؤں والوں نے امتزاز عرف جیج اور حسن عزیز کو کندھوں پر اٹھالیا اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ میڈیا بھی پہنچ گئی سریہ گینگ کس نے پکڑوائی۔

افسر نے میرے اور جیج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کو جانوں نے۔“ اور ہمیں اس بات پر خوشی تھی کہ ہم نے انسانیت کے دشمن کو ان کے انجام تک پہنچایا۔ اگلے دن اخبار ٹیلی ویژن پر ہم دونوں کے چرچے عام تھے۔ میں جیج کے گلے ملنے ہوئے بولا۔

”یاد تم جیسے بہادر انسان کی ہمارے ملک کی ضرورت ہے جیج کوئی امیر کبیر گھرانے سے تعلق رکھنے والا نہیں تھا بلکہ ایک بستی فتنے والی سے تعلق رکھنے والا اور لاہور ٹیکسٹری میں کام کرنے والا بہادر لڑکا ہے۔ اور حسن عزیز کوٹھاکلاں سے تعلق رکھنے والا بہادر لڑکا ہے ان دونوں کی زبانی یہ واقع میں نے آپ سب کے گوش گزار کر دیا اللہ تعالیٰ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے (آمین)



بنایا کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم دونوں پھر پورے پلان کے ساتھ رات دن بجے گاؤں سے باہر ایک اونچے درخت پر چڑھ گئے اور ایک جگہ بہت زیادہ ٹہنیاں اکٹھی کی ہوئی تھی اس کے اوپر گھاس وغیرہ ڈال کر بیٹھ گئے جس کے اوپر کھڑا ہونے سے پورے گاؤں کاؤں نظر آتا تھا۔ جو کہ اتنا بڑا نہ تھا بیٹھے بیٹھے ہم تھکنے لگے تقریباً صبح کی اذان کا ٹائم قریب تھا کہ ایک طرف سے شور مچا دیا جب ہم نے سرچ لائٹ ماری آگے والا مناظر دیکھ کر جیج کے ہاتھ سے نارنج گرتے گرتے پڑی۔ سامنے کی طرف ایک گلی تھی جس کے اندر یہ واقع پیش آیا تقریباً دس فٹ لمبا، ناخن اس کے لمبے لمبے اور منہ سے آگ برسی رہی تھی دیکھنے والا اسے دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا اور مجرورہ راہکشش اسے اٹھا کر کندھوں پر ڈالتا اور چلتا بنا جب وہ ہمارے قریب سے گزرا۔ ممکن تھا اگر وہ ہاتھ اوپر کرتا تو ہم دونوں کو پکڑ لیتا جب وہ درخت کے نیچے سے گزر گیا تو جب ہم دونوں بھی اترے اور اس راہکشش کے تعاقب میں نکل پڑے میں سارے راستے جیج کو بھجتا گیا۔

”یار آہستہ درج چلے والا ہے کہیں اس کو ہماری موجودگی کا پتہ نہ چل جائے۔“ جیج غصے سے بولا۔

(یار مسال مسال تا آگے تورن ڈائیاں اتوں تو) میں نے جلدی سے جیج کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور وہ خاموش ہو گیا تھوڑی آگے جا کر وہ یکدم گدھے کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ بہت زیادہ تلاش کرنے کے باوجود بھی نہ ملا۔ ہمیں اپنی ذرا سی لاپرواہی پر سخت طیش آیا۔

ابھی ہم واپس جانے کے لئے مڑے ہی تھے کہ ہمیں کسی کے چلانے کی آواز سنائی دی جس کے ساتھ ہنسنے کی بھی۔ ہمارا شک بالکل سچ ہوتا دکھائی دیا اور پھر میں اور جیج اس کے دروازے کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ دوا دی تھی جو اس لڑکی پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہے تھے ہمارے دو منٹ اور رکنا کسی بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔

جیج جلدی سے بولا۔ ”حسن تم پولیس کو فون کرو کیونکہ چوکی نزدیک ہے میں دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کے پاس گیا اور پوچھا ”کون ہے؟“

”باہر سے آواز آئی۔“ میں میگ ہوں باہر آؤ۔“

”میگ!“ فرڈ اور اس کی بیوی دونوں حیران ہو گئے کیونکہ میگ پہلے ایک مبینہ سے لاپتہ تھا۔ اس کے بیوی اور بچے اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ گاؤں میں پولیس تو تھی لیکن اس لئے گاؤں والوں نے بھی ان کی مدد کی مگر نتیجہ صفر رہا۔

دروازہ پھر بجایا گیا۔ فرڈ جلدی سے لوگ کوٹ پہن کر باہر نکل گیا اور اس کی بیوی واپس کمرے میں چلی گئی۔

جب صبح ہوئی تو اپنے ہر بیٹے کو بستر پر تاپا کر وہ پریشان ہو گئی اور پورا گھر چھان مارا جب فرڈ نہ ملا تو اس نے ہسپتالوں سے مدد مانگی پھر کیا تھا بات پورے گاؤں میں پھیل گئی اور سب اسے تلاش کرنے لگے۔

گاؤں کا سردار جو کہ چالیس کے قریب کا شخص تھا۔ جس کا نام مارٹن تھا۔ مارٹن نے فرڈ کی بیوی سے رات کا احوال سنا تو پریشان ہو گیا مارٹن نے فرڈ کی بیوی کو خاموش رہنے کا کہا اور اس بات کا ذکر صرف پاسٹر جوزف سے کیا۔

اس قصبے میں صرف ایک ہی چرچ تھا اور ایک ہی پاسٹر تھا۔ جو بہت ضعیف ہو چکا تھا۔ پاسٹر بھی مارٹن کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔ فرڈ کو بہت تلاش کیا گیا آس پاس کے جنگلات بھی دیکھے گئے مگر وہ نہ ملا۔

رات کو ہونے والی برفباری نے عیروں کے نشان بھی مٹا دیے۔

شام ہو گئی تو سردار نے کہا۔ ”اب اپنے اپنے گھروں کو جایا جائے۔ کل فرڈ کو جنگل کے اندر جا کر تلاش کیا جائے گا۔“

صبح کا اجالا پھیلا تو ایک اور بری خبر سامنے تھی کہ رات کو ڈاکس بھی غائب ہو گیا ہے۔ اس کے گھر میں صرف ڈاکس اور اس کا بیٹا رہتا تھا بقول اس کے بیٹے کے رات کو فرڈ نے اس کے باپ کو گھر سے باہر بلایا تھا۔ جسے خود اس کے بیٹے نے موم بتی کی روشنی میں دیکھا تھا

اور اسے کوئی مغالطہ نہیں تھا۔

اب بات پورے گاؤں میں پھیل گئی اور انہوں نے دو لوگوں کی تلاش شروع کر دی جنگل بے حد گھنٹا تھا، اس لیے جنگل میں نیم تاریکی کا راج تھا۔ سب لوگ دس دس کی ٹولیاں میں تقسیم ہو کر جنگل کی مختلف سمتوں کو چل دیے۔

آخر ایک ٹولی کو جنگل کے بچ و بچ فرڈ کی لاش مل گئی۔ جس کا سر اس کے تن سے جدا تھا سب لوگ واپس آ گئے لاش نے لکڑی اور سردار اور پاسٹر کے پاس پہنچ گئے۔ پاسٹر نے جب لاش کو دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اور لوگوں کے لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ اگر فرڈ مر چکا ہے تو کیا ڈاکس بھی گھر اس کی لاش تو نہیں لے لی۔

سردار نے پاسٹر کی پریشانی بھانپ لی اور ان سے پریشانی کا سبب پوچھنے لگا۔ پاسٹر نے سب لوگوں کی نظروں سے بچ کر سردار کی توجہ فرڈ کے دھڑکی رگوں کی طرف کرواتا جس پر ایک قطرہ بھی خون موجود تھا۔ سردار کی آنکھیں پھیل گئی، گھر اس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ”گلتا ہے اس پر شیر نے حملہ کیا ہے۔“ سب لوگ سردار کی بات سے مطمئن ہو گئے اور گھروں کو چلے گئے۔

لاش کو کل دفنایا جاتا تھا۔ لوگوں کے جانے کے بعد سردار نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو پاسٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ سردار کا خیال تھا کہ فرڈ کسی خون آشام کا شکار ہوا ہے۔ پاسٹر نے کہا۔ ”ابھی ثابت ہو جائے گا۔“ پاسٹر چرچ سے اپنے کمرے میں گیا جو کہ چرچ میں ہی تھا۔ جب واپس آیا تو پاسٹر کے ہاتھ میں تھوڑی اور ایک لکڑی کی صلیب تھی۔ پاسٹر نے صلیب فرڈ کے دل کے مقام پر رکھی اور تھوڑی سی ضرب سے اس کے دل میں اتار دی۔

فرڈ کے مردہ جسم نے جھرجھری لی اور ساکت ہو گیا۔ سردار کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں چھا گئی۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر لاش کو صندوق میں بند کیا۔ اور صبح دفنایا گیا۔

اگلے صبح ایک اور شخص غائب تھا۔ اسے دو دن

تک لگا تار ڈھونڈا گیا مگر وہ نہ ملا۔ یہ شخص گھر میں اکیلا رہتا تھا اس کا کوئی نہ تھا ایک بیوی تھی جو تین سال قبل انتقال پا چکی تھی۔

ادھر سردار پاسٹر سے ملا اور دونوں نے فیصلہ کر کے سب لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان کو خون آشام والی بات بتا دی گئی۔ پھر کیا تھا سب گاؤں والوں کو سانپ سوگھ گیا۔ سردار نے کہا۔

”ابھی ان کی تعداد کم ہے صرف تین، ہمیں انہیں ڈھونڈ کر ختم کرنا چاہیے۔ لوگ ایسا کریں گے اپنے گھروں سے رات کے وقت نکلنے سے گریز کریں اگر بہت مجبوری کے ساتھ تنکا بھی پڑے تو ساتھ دو تین فرد ہونے چاہیے اس کے علاوہ آپ سب کو ایسی سیٹیاں دی جائیں گی جن کی آواز خاصی بلند ہوگی۔ یہ سیٹی ایئر چنسی ہوگی اور اس کے علاوہ اپنے پاس حفاظت کے لئے کوئی ہتھیار رکھا جائے۔“

یہاں کے لوگ دیسے بھی روحوں کو بہت مانتے تھے اب تو شام ہوتے ہی گاؤں میں ہولناک سناٹا چھا جاتا گویا لوگ اپنی آواز نکالنے سے بھی ڈرنے لگے ہوں۔ پھر ہر رات لوگوں کے دروازے بجائے جانے لگے۔ ساری ساری رات سیٹیاں بجنے لگیں۔ یوں اس گاؤں کی راتیں بھی حرام ہو گئیں۔ صرف چرچ کا دروازہ نہ بجایا جاتا۔

ایک بار پھر سب لوگ جمع ہو گئے اور سردار سے اس مسئلے کا حل پوچھنے لگے۔ اس بار پاسٹر نے تجویز پیش کی کہ گاؤں کے نوجوان ٹولیاں بنا کر باری باری پہرہ دیں گے۔ اور اپنے پاس ہتھیار اور مشعل وغیرہ بھی رکھیں گے۔

اسی رات نوجوان پہرہ دینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے انہوں نے رات کو ایک سایہ جنگل سے آتے دیکھا تو اس پر گولیاں چلا دیں۔ وہ سایہ چھٹا ہوا جنگل میں گھس گیا۔ اس کے بعد ساری رات کوئی نظر نہیں آیا۔ یہ رات نہایت پرسکون گزری۔ اور صبح ہوتے ہی ایک ٹولی جن میں پاسٹر اور سردار بھی شامل تھے خون آشاموں

## رشتے داروں کے حقوق

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب رشتے

داروں کی معاشی بحالی پر زور دینے کے ساتھ کم زور

اقرباء کے حقوق کی ادائیگی کی بھی تلقین فرمائی ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام افراد پر صدقہ

کرنے کے بجائے، رشتے داروں پر خرچ کو بھی

ثواب کا ذریعہ وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس سے آگے

بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مفہوم:

”عام مسکین پر صدقہ سے تو ایک گناہ ہی ثواب

پائے گا، لیکن اگر کوئی شخص غریب رشتے دار کو صدقہ

دیتا ہے تو اس کو دگنا ثواب و اجر ملے گا، ایک اجر تو

صدقہ کا دوسرا صلہ رحمت کا۔“ (نسائی)

## وقت کو غنیمت جانو

حضرت حاجی محمد شریفؒ فرماتے ہیں: ”زندگی

کا ایک ایک سانس بے بہا گوہر ہے۔ انسان اس

زندگی میں اگر ایک دفعہ بھی سبحان اللہ کہہ لے، تو

جنت میں درخت لگ جاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد

اگر ہزار دفعہ بھی ”سبحان اللہ“ کہتا رہے تو کوئی درجہ

نہیں ملے گا۔ جنت میں درجات کی ترقی، اس دنیا

میں ہی ہوتی ہے۔

دنیا دار العمل ہے، یہاں پر اعمال کی قیمت پڑتی

ہے اور آخرت دارالجزاء ہے، وہاں انسان کو عملوں کی

جزا دی جاتی ہے۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)





## پراسرار کھانی

رضوان قیوم-راولپنڈی

ہورے قبرستان میں ویرانی کا تسلط تھا اور ایک نوجوان ایک پرانی قبر میں بیٹھا چلا کاٹ رہا تھا کہ اچانک ایک کان پھاڑ دینے والی حیرت ناک اور ہیبت ناک آواز گونجی تو.....

حرم و لالچ کی ایک ناقابل یقین اور ناقابل فراموش..... دل گرفتہ اور دل شکستہ کہانی

یہ مافوق الفطرت کی کہانی مجھے ایک ایسے ریٹائرڈ فوجی نے سنائی ہے جو کہ 1967ء میں جب مشرقی پاکستان قائم تھا وہ اس زمانہ میں محکمہ فوج میں جیسور کے مقام پر پارک آری کی ایک مشہور کور EME میں بحیثیت سپاہی تعینات تھا۔ اس ناقابل یقین مافوق الفطرت واقعہ کی شروعات اس نے اس طرح کی۔ میرا نام عبدالقدوس ہے اور میرا تعلق چھتر پانی جو کہ مری کے قریب علاقہ ہے وہاں سے ہے۔ GHQ راولپنڈی سے مخصوص فوجی جہاز C130 کے ذریعے 1967ء میں ڈھاکہ EME ہیڈ آفس پہنچا۔ وہاں سے آگے ہمارا تبادلہ جیسور کر دیا گیا۔ پہلی نظر میں مجھے وہاں کی کوئی چیز پسند نہ آئی۔ وہاں کے موسم میں چپ چاپ ہٹ، پھمروں، مٹھلوں اور جوگوں کی بہتات، مغربی پاکستان سے نئے آنے والوں کے لئے

کی تلاش میں جنگل روانہ ہوئے مگر ان کا کوئی نشان تک نہ ملا۔ تین دنوں میں پورا جنگل چھان مارا۔ اس دوران ایک ٹولہ جورات کو پہرہ دے رہا تھا اس کا ایک آدمی ٹولے سے الگ ہو گیا اور پھر وہ بھی گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔

اب ان کی تعداد میں ایک اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر تو جیسے ہر طرف موت نے اپنے بچے گاڑ دیے۔ اس بار پاسٹر نے کہا کہ ”ایسی جگہ خون آشاموں کو تلاش کرنا چاہیے جہاں کوئی نہ آتا جاتا ہو۔“

تب سردار نے کہا۔ ”ایسی جگہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے پرانا قبرستان جسے آبادی بڑھنے کی وجہ سے چھوڑ دیا گیا۔ اس قبرستان میں ایک چرچ بھی تھا جو کہ اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے۔“

سردار نے دس بارہ لوگوں کو لیا جنہوں نے ہاتھ میں ہتھوڑی اور لوک دار لکڑی کی صلیب پکڑ رکھی تھی۔ جب یہ لوگ قبرستان پہنچے تو قبریں نہایت بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ یہ لوگ چرچ کی طرف بڑھے ماحول میں عجیب سی وحشت برپا تھی۔

چرچ کے پاس پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ چرچ کی ایک دیوار گر چکی ہے۔ وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں وہاں کچھ نظر نہ آیا۔ پاسٹر سب سے آگے تھا۔ پاسٹر تہہ خانے کی طرف بڑھنے لگا اور بیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے جا گرا۔ پاسٹر کو اپنی گردن پر چھین کا احساس ہوا لیکن پاسٹر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بائیل پڑھنا شروع کر دی۔

سامنے چاروں خون آشام کا لوں پر ہاتھ رکھ کر چلانے لگے۔ پھر اچانک خون آشاموں نے ان پر حملہ کر دیا، جس سے پچھلے لوگ اوپر کی طرف بھاگے مگر پاسٹر نے پھرتی کے ساتھ ہتھوڑی پھینک کر تہہ خانے کی کھڑکی کا کاچ توڑ دیا۔ خوش قسمتی سے اس دن سورج نکلا تھا جس سے دھوپ اندر آنے لگی۔

دھوپ کا اندر آنا تھا کہ خون آشام چیتنے ہوئے پیچھے کی طرف بھاگے اور کونے میں جا گئے۔ پاسٹر نے



اکتاہٹ بے چینی کا باعث بنتی تھی۔ جس فوجی بیرک میں ہماری رہائش تھی، وہاں بچا نوے فیصد نفری مقامی بنگالیوں کی تھی۔ مجھے ان کے علیہ اور لباس سے کوفت ہوتی تھی۔ ان کی تنگ نظری کی وجہ سے ہم چند مغربی پاکستان کے فوجی اہلکاروں نے اپنا علیحدہ گروپ بنایا ہوا تھا۔ نیز ہم مغربی پاکستان والوں کی تعداد بہ مشکل 8,7 ساتھیوں پر مشتمل تھی۔

اگرچہ اس بیرک میں میری تمام ساتھیوں سے علیک علیک تھی لیکن وحید قریشی نامی سپاہی جس کا تعلق مندر شائع راولپنڈی سے تھا اس سے میری دوستی بہت ہی زیادہ حد تک بڑھ چکی تھی۔ یہاں تک کہ میری اور اس کی دوستی پورے بیرک میں بہت مشہور ہو گئی تھی۔ وحید قریشی درحقیقت میری فطرت اور پسند کے عین مطابق تھا۔ وہ بے حد کم گو سنجیدہ اور کتاب دوست ہونے کے علاوہ کام سے کام رکھنے والے کے علاوہ دل کا بہت سخی تھا۔ وہ اکثر اتوار یا جمعہ کے روز مجھے بازار لے جا کر میری بہت خاطر تواضع کرتا تھا۔

ہم اس روز خاص طور پر جیسور کے اکلوتے بازار میں جا کر نارمل، انناس وغیرہ اور کھل کا حلوہ لازماً کھاتے تھے۔ ڈیوٹی کے بعد ہم زیادہ تر وقت اکثر اکٹھے گزارتے۔ یعنی کھانا پینا ہم نہ صرف ساتھ ہی کرتے ہم دونوں ایک دوسرے کے نہ صرف گہرے دوست تھے بلکہ ہر ازمی تھے۔

وحید قریشی کے زیر مطالعہ کتب میں جہاں دیگر موضوعات کا ذخیرہ تھا۔ وہاں چند کتب بڑی پراسرار اور جادوئی موضوعات پر بھی مشتمل تھیں۔ جن کو میں نے اس سے مانگ کر پڑھنے کی کوشش بھی کی تو اس نے دینے سے انکار کر دیا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ”یاد تو یہ کتب مجھے کیوں نہیں پڑھنے دیتا۔“

میرے اس سوال پر وہ اکثر ٹال دیتا تھا۔ اس کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک جمعہ کے روز ہم نے اکٹھے جیسور کی جامع مسجد

میں جمعہ کی نماز پڑھی اس کے بعد اس نے مجھے کہا۔ ”میں تمہیں اس مسجد سے سیدھا لالہ کے مشہور ہوٹل پر لے کر جاؤں گا۔ وہاں پہلے سے کھٹل بنزی کھائیں گے۔ مجھے بھی لالچ آگیا۔ کیونکہ جمعہ کے روز ہمیں فوجی لنگر سے چنے کی پتی وال ملا کر تھی۔“

بہر حال، میں اس کے ساتھ ہولیا۔ اس نے سب سے پہلے سائیکل رکشہ کو مسجد کے قریب روکا پھر مجھے رکشہ میں لے کر بیٹھا تو میں نے پوچھا یا رکشہ چار ہا ہے تو وہ بولا چند منٹ کی بات ہے۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ وہ ذرا کرلوں پھر لالہ کے ہوٹل جا کر پیٹ پوچا کریں گے۔ میں بھی اس کی بات سن کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس نے رکشہ کو ایک دیرانے میں رکھنے کو کہا تو رکشہ والے نے بھی حیرانگی کے عالم میں کہا۔ ”جی ادر روک دوں۔ لیکن یہ جگہ بہت دیران ہے آپ یہاں رکھیں گے۔“

”بس ادر روک دے۔“ اس نے رکشہ والے سے کہا۔ ”اچھا جی جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے رکشہ روک دیا۔ میں بھی حیرت کے عالم میں وحید کو دیکھ رہا تھا کہ اس دیرانے میں اسے کیا کام پڑ گیا۔

بہر حال میں خاموشی سے سوچنے لگا کہ آگے دیکھوں ہوتا ہے کیا۔ وحید نے مجھے کہا۔ ”یاد تو چند منٹ ذرا اس درخت کے نیچے انتظار کر، میں ابھی آتا ہوں۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا، وہ میرے بولنے سے پہلے ہی تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

وہاں آدم نہ آدم کی ذات رکشہ والا بھی اس عجیب ڈراؤنے ماحول سے جان چڑھا کر بھاگ گیا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا تو میں بھی تیزی سے وحید کا پیچھا کرنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت آگے چل رہا تھا اور اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کے پیچھے آہستہ آہستہ آ رہا ہوں اس دیرانے میں ایسا مقام آیا جہاں دیرانے کے بالکل عین سامنے بڑی ہی دیوار تھی جو کہ غالباً کسی اسکول یا کسی سرکاری عمارت کی ہوئی۔ وہ اس دیوار کے سامنے بڑے عجیب انداز سے خاموشی سے ساکت کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کیں جیسے کسی قدیم

تصویر یا بدھ مذہب میں کوتم بدھ اس کے مخصوص انداز میں تپیا کرتے ہوئے نظر آتا ہے۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر کے نہ جانے کس زبان میں کوئی عبارت پڑھنا شروع کر دی اور پھر یکدم خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اس عمل میں تقریباً چار پانچ منٹ تک ساکت رہا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں جھٹکے سے کھول دیں۔ وہ بیسنہ سے شرابور تھا۔ میں بھی حیرانگی اور پریشانی کے عالم میں اس کی اس ناقابل یقین پراسرار حالت کا مشاہدہ کرتے ہوئے خود بھی خوف سے لرزنے لگا۔ اس نے خلاف توقع مجھے اپنے قریب دیکھا تو شدید غصے کے عالم میں مجھے ڈانٹنے اور چلاتے ہوئے کہا۔ ”تو میرے پیچھے کیوں آیا؟ میں نے تجھے کہا تھا اس درخت کے نیچے ذرا رک کر میرا انتظار کر لیکن تو نے میرا کہا نہیں مانا۔“

”وحید بھائی میں دراصل اس دیرانے میں ڈر گیا تھا اور دوسرے میں کچھ بولتا کہ آپ تیزی سے آگے بڑھ گئے۔“ پہلے تو اس نے مجھے عین نظروں سے دیکھا لیکن بعد میں شانت ہو کر میری طرف دیکھنے ہوئے بولا۔ ”یار مجھے معاف کر دے میں نے خواہ مخواہ تجھ کو ڈانٹ پلا دی، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”یہ کیا ماجرا ہے؟“ وحید سے میں نے سوالیہ انداز میں استفسار کیا تو اس نے ایک لمحہ کو توقف اختیار کیا اور کچھ سوچنے کے بعد گہرا سانس کھینچے ہوئے بولا۔ ”جبکہ تو نے سب کچھ اپنی نگاہوں سے دیکھ لیا ہے تو مجھ سے وعدہ کر کہ یہ بات کسی اور سے کہے گا نہیں۔ یہ میرا ایک راز ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلادیا اس نے جب محسوس کیا کہ میں اس کے اعتماد کا آدمی ہوں تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”پہلے تو میں تجھے اپنے وعدے کے مطابق لالہ کے ہوٹل سے بہترین لالچ کرواتا ہوں بعد میں تجھے اپنا ایک خفیہ اور اہم راز بتاؤں گا۔“

میری آتش اشتیاق بھڑک اٹھی میں نے اس سے کہا۔ ”پہلے تو مجھے بتلا اصل معاملہ کیا ہے؟“

”میں تجھے یہ بات آرام اور سکون سے بتاؤں گا لیکن پہلے ہم کھانا کھائیں گے۔ اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کے مارے چوہے دوڑ رہے ہیں۔“ اس نے کہا۔

وہ مجھے لالہ کے ہوٹل لے گیا۔ وہاں ہم نے خوب سیر ہو کر لالچ کیا۔ پھر اس نے مجھے بتلایا کہ ”میں تجھے زندگی کا ایک ایسا راز بتا رہا ہوں جس کی اصلیت کا سن کر تجھے یقین نہیں آئے گا لیکن میں تجھے تیری آنکھوں سے ایک بڑی عجیب چیز دکھاؤں گا۔“

میں نے تجس سے پوچھا۔ ”وہ کیا چیز ہے؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا اور بولا۔ ”اگر تجھ میں ہمت ہے تو تجھے تیرے سوال کا جواب سامنے آ جائے گا۔ لیکن تو نے اپنے دل کو تمام کر رکھا ہے۔“ اس کے بعد ہم دونوں سیدھا اس مقام پر سائیکل رکشہ کے ذریعے پہنچے۔ اس نے مجھے ایک مخصوص جگہ کھڑے ہو کر کہا۔ ”اس دیوار کو غور سے دیکھ اور جو میں پڑھوں اسے تو بھی دہرانا اور پھر جو چیز بھی تجھے نظر آئے تو گھبرانا نہیں میں تیرے پیچھے ہوں۔“

بہر حال میں نے ہمت کو یکجا کیا اور خوف و تجسس کی آمیزش کے جذبہ کے ساتھ اس دیوار کی جانب بغور دیکھنا رہا۔ وہ اپنے منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہا میں کافی دیر تک دیوار کی جانب دیکھتا رہا۔ لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا میں نے اس سے کہا۔ ”مجھے یہ توقف بنا رہا ہے۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔“

اس نے فوراً اپنا عمل بند کیا اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”ابھی جو چیز میں تجھے دکھانا چاہتا تھا۔ وہ تجھے دیوار میں نظر آنے والی تھی۔ لیکن تو نے درمیان میں بول دیا۔ اب مجھے یہ عمل پھر سے دہرانا پڑے گا تو آرام اور صبر سے صرف دیوار کی طرف دیکھ۔ اور اگر اب تو نے مجھے ڈسٹرب کیا تو میں تجھے تھپڑ مار دوں گا۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ میں دوبارہ غور سے دیوار کی جانب دیکھنے لگا۔ سات آٹھ منٹ مسلسل دیوار کی طرف دیکھنے پر واقعی ایک نسوانی صورت نمایاں طور پر نظر آئی۔

## وارننگ

ایک آدمی کا قد بہت چھوٹا تھا جب کہ اس کی بیوی بہت زیادہ لمبی تھی۔ لمبی وجہ تھی کہ شوہر صاحب اکثر بیوی سے مار کھا کر باہر بھاگ جاتے تھے۔

ایک دفعہ حسب معمول بیوی نے شوہر سے جھگڑے کے بعد اس کی پٹائی کر دی تو وہ اپنی عادت کے مطابق محاذ چھوڑ کر گلی میں بھاگ آیا۔ راستے میں اسے بیوی کا بھائی مل گیا۔ اسے مخاطب کر کے وہ غصے سے بولا۔

”جی صاحب۔ اپنی بہن کو منع کر لیں روزانہ میری پٹائی کر دیتی ہے۔ یہ میری آخری وارننگ ہے جس روز مجھے غصہ آ گیا تاں تو پھر سڑی پر چڑھ کر اتنا ماروں گا کہ یاد رکھے گی۔ پھر آپ بہن کی حمایت میں مجھ سے کچھ نہ کہیے گا۔“

(کا کڑخان۔ پشاور)

## پاگل دیوانہ

پاگل خانے میں ایک پاگل اپنے سامنے دیکھی میں پانی بھر کر اس میں مچھلی کا کاٹا لگائے بیٹھا تھا۔ اسی وقت وارڈن کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے پاگل کو دیکھا تو پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو بھئی؟“

”مچھلیاں پکڑ رہا ہوں؟“ پاگل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”خواب اکتی پکڑ لیں صبح سے؟“ وارڈن نے مسکرا کر پوچھا۔

پاگل نے حیران ہو کر کہا۔ ”دیوانے ہوئے ہو کیا کہیں دیکھی میں بھی مچھلیاں ہوتی ہیں۔“

(عمران حمید۔ دیہا پور)

اوسان خطا ہو جائیں گے اور چلہ کو شروع کرنے سے پہلے اس کے تقاضے بھی بہت سخت ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ تو کر نہیں سکتا۔“

”یاد تیری ترقی اور شان و شوکت کو دیکھ کر میرا دل کرتا ہے کہ میں بھی تیری طرح محنت کروں۔“

”اچھا اگر تو بعد سے تو سن ہمارے اس کام کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے یعنی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“

”لیکن کرنا کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کرنا یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے کسی نئی قبر میں سے کسی مردے کا ٹھوسا گوشت کا ٹکڑا کرنا ہوگا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”تیری ہوا نکل گئی نا..... کیسے ہوگا؟..... ارے بیوقوف یہ کام اتنا آسان نہیں، اے جن کو قابو کرنا کوئی اماں جی کا کھیل نہیں ہے۔ ویسے تو پرواہ نہ کر میرے پاس اس کا بندوبست ہے۔“

”وہ کیا؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”میں نے قریبی قبرستان کے لالچی گورکن کو پھنسا رکھا ہے۔ جب بھی میں نے اپنا مخصوص چلہ کاٹا ہوتا ہے۔ اس کی پٹھلی پر 200 روپے رکھ دیکھ دیتا ہوں۔ وہ مجھے کسی نہ کسی طرح لاش کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لا دیتا ہے۔“

”اس ٹکڑے کو تو کیا کرتا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا کرتا ہوں؟“ وہ ہلکا سا مسکرایا۔

”اب اس کا قیہ بنا کر کھاتا ہوں۔“

”تو اسے کھاتا ہے۔“

”اور کیا یہ چلہ کی پہلی شرط ہے۔“ وحید مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے پہلے ہی تجھ سے کہا ہے کہ تجھ میں یہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”نہیں میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ میں وہ ہر عمل کرنے کو تیار ہوں جو میرے مسائل کو حل اور مجھے ترقی میں مدد دے۔“

”تو پھر ہمت کر اور مجھ سے دن طے کر۔“ میں نے بھی اپنے دوسرے مرحلہ کا چلہ کاٹا ہے۔ لیکن تیرا

تھا تو میرا گہرا دوست مگر افسر بننے کے بعد بھی وہ بالکل نہ بدلا۔ مجھ سے اس کا رویہ پہلے جیسا ہی تھا جیسا کہ سپاہی دور میں تھا۔ ذرا بھی مغرور نہ ہوا تھا۔ وہ بدستور مجھے ہر اتوار اور جمعہ کے دن لالہ کے ہوٹل میں کھانا کھلاتا۔ لیکن حسب معمول ان دنوں بھی اس دیوار کے پاس جا کر اپنی محبوبہ سے ضرور ملتا تھا۔

میں ایک روز اس کے پیچھے پڑ گیا تو اس نے مجھ سے کہا۔ ”عبدالقدوس میں جس میں پڑا ہوا ہوں وہ تو نہیں کر سکتا۔“

”میں میں کر سکتا ہوں بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی ترقی کرنی ہے اور اس کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ اچھا اس وقت تو چاہتا کیا ہے؟“

”تیرا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟“

اس نے مجھ سے پوچھا میرے یوں تو بہت سارے مسائل ہیں لیکن سردست بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے پیچھے گاؤں میں میرے گھر کے مالی حالات بہت خراب ہیں اور یہ بھی وہ ہے کہ مجھ سے چھوٹے دو بھائیوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے مجھ سے یعنی دوسرے نمبر والا بھائی آج کل بے روزگار ہے۔ کاش اسے کوئی نوکری مل جائے۔ ہمارے گھر کے معاشی حالات درست ہو جائیں۔“

میں نے اسے رو دہمی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ سن کر اس نے مجھ سے کہا۔ ”ایک کام کرے گا اگر کر سکے تو تیری تقدیر بدل جائے گی۔ جیسے میری بدل رہی ہے۔“

”ہاں میں ہر وہ کام کرنے کو تیار ہوں جو میری ترقی کے لئے بہتر ہوگا۔“ میں نے کہا۔

اس نے مجھے جوش دلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ایک جن کو قابو کیا ہوا ہے جو کہ ابھی میرے محل قابو میں نہیں ہے۔ مجھے جس عامل نے جن کو قابو کرنے کا طریقہ یعنی چلہ کاٹنا بتلایا ہے وہ تین مرحلوں میں ہے ہر مرحلہ کا علیحدہ اور بڑا صبرانہ سخت چلہ ہے۔“

”کتنا سخت ہوگا؟“

”اے اتنا سخت ہوگا کہ تو دیکھے گا تو تیرا

بال کھلے لہراتے ہوئے نقش دکش اور انتہائی سحر انگیز تھے۔ لیکن یکدم ایک جھماکے سے میری نظروں سے وہ غائب ہوئی۔

یہ خوفناک منظر دیکھ کر واقعی میری گھٹکی بندھ گئی تھی۔ یہ تو کوئی بہت خوب صورت پراسرار مخلوق کی لڑکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے کہا۔

”ہاں تم نے سچ بچپانا لیکن یہ کیسے ہوا؟ میں نے اس سے پوچھا۔“

”یار چل اب دیر ہو رہی ہے۔ ہیرک میں رات کے وقت میرے پاس آنا۔“ رات ہوئی تو میں اس کے پاس خصوصی طور پر پہنچ گیا اور اس سے پرخس انداز میں دیوار کے قریب نظر آنے والی ماورائی حسینہ کے متعلق پوچھا۔ وہ ایک لمحہ کو مسکرایا اور مجھے شدید فینڈ کے غلبہ کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ دوسری صبح پورے ہیرک میں خبر مشہور ہوئی کہ وحید قریشی کی آؤٹ آف ٹرن ترقی ہوئی اور اسے ایک سال کی بنیادی تنخواہ کے برابر بقیہ بھی مل گیا ہے۔ مجھ سمیت ہیرک کے تمام فوجی اہلکار وحید کی قسمت پر رشک کرنے لگے۔ اس نے دراصل اپنی پرموشن کے لئے ہیڈ آفس میں اپیل کی ہوئی تھی۔ وہ خلاف توقع منظور ہوئی۔ اس کا رکا ہوا اور مشکل ترین کام ہو گیا تھا۔ یہ راز میں ہی جانتا تھا کہ وحید قریشی جاوہر ٹونا اور عمل کرنے والا شخص ہے لیکن کیونکہ میں نے اسے زبان دی ہوئی تھی اس لئے میں اپنے وعدے کا پاس رکھتے ہوئے خاموش تھا۔

اس دوران جو غیر کشمکش کے لئے ڈھاکہ میں چند پوسٹیں آئیں۔ ہماری کور کے تقریباً 200 لوگوں نے اپلائی کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وحید قریشی اس اسکیم میں سلیکٹ ہو گیا۔ وہ ایک بار پھر قسمت کا دشمن رہا۔

یعنی وہ سپاہی رینک سے نکل کر براہ راست سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گیا۔ ہم سب بے درپے اس کی کامیابیاں دیکھ کر حیرت زدہ تھے۔ کئی بار لوگوں نے اس کا راز اس سے جاننے کی کوشش کی۔

لیکن وہ بہت چالاک سے بات ٹال جاتا تھا۔ وہ



ابھی معاملہ شروع اور پہلے مرحلہ میں ہے۔ میں تجھے اس کے لئے چند ابتدائی شرائط اور طریقہ بتا دوں گا۔  
”وہ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلی شرط یہ ہے کہ تو نے میرے ساتھ قبرستان جانا ہوگا اور پھر وہاں ہمیں گورکن ایک تازہ لاش کے گوشت کا ٹکڑا دے گا پھر اسے ہم قیہ بنا کر آدھا آدھا کھائیں گے۔“

”کچا گوشت اور وہ بھی کسی مردے کا؟“ یہ بات میرے دل میں آئی لیکن میں نے اس کے سامنے اس کا اظہار نہ کیا۔ اس نے پھر مجھ سے کہا۔ ”ہفتہ کی رات آٹھ بجے کا وقت طے ہوا۔“ اس نے کہا۔ ”میں ٹھیک وقت پر قبرستان آ جاؤں گا۔“

”تو دل و دماغ سے تیار ہو کر سیدھا شکور خان گورکن کی جھوپڑی میں آ جانا۔“

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس رات جیسوڑی آج وہاں سخت سردی تھی لیکن خوش قسمتی سے بارش نہ تھی، میں وعدے کے مطابق پورے آٹھ بجے مذکورہ قبرستان پہنچا۔ ایک طرف سخت سردی اور قبرستان میں کیڑے مکوڑوں کا رنگ برنگی آوازیں دل کو دہرا رہی تھیں۔ میں خوفزدہ قدموں سے چلتا ہوا جب شکور کی جھوپڑی میں پہنچا تو وہ اس وقت موجود نہ تھا۔ صرف وہاں ایک دیا جل رہا تھا۔ میں وہاں ایک طرف سہا ہوا اکیلا کھڑا ہو گیا۔ اس لمحے مجھے ایسا لگا تھا جیسے اس شہر خوشائ کے مردوں کے درمیان صرف میں ہی زندہ انسان ہوں۔ پتا نہیں وحید آتا ہے کہ نہیں۔

میرے دل و دماغ میں مختلف اندیشے منڈلانے لگے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بوڑھی مردانہ آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ”وہ جی آپ ہی عبدالقدوس ہیں؟“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں ایک کھروری شکل کا ایک بوڑھا شخص اپنے ہاتھوں میں کسی کاغذ میں لپی ہوئی کوئی چیز پکڑے ہوئے تھا۔ ”میں شکور خان گورکن ہوں۔ یقیناً آپ وحید قریشی کے دوست ہیں جنہوں نے آج آنا ہے۔“

”ہاں میں عبدالقدوس ہوں۔“

”آپ بیٹھ جائیں۔“ وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے بولا۔ ”آج بہت سردی ہے۔“ میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”ہاں آج واقعی کچھ زیادہ ہی سردی ہے۔ گورکن نے جواب دیا۔ ”میں لکڑیاں جلا کر آگ جلاتا۔ لیکن اس لئے جلا نہیں رہا کیونکہ آج رات فجر تک آپ دونوں نے ایک ڈبر میں خشک بدن سے جن کو قابو کرنے کے لئے عمل کرنا ہے؟ آپ ابھی سے اپنے آپ کو چٹنی و جسمانی طور پر تیار کر لیں اور ہاں میں تمہارے لئے جن کو قابو کرنے کے لئے پہلی شرط کے مطابق لاش کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر لایا ہوں۔ پتا نہیں وحید قریشی آئے گا کہ نہیں۔“ میں نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

”وہ ضرور آئے گا۔ اس نے مجھے 200 روپے ایڈوانس دیئے ہیں۔ تم بھی کوئی جادو وغیرہ یا جنوں کو قابو کرنے کا کوئی عمل کرتے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں ایک غریب انسان ہوں۔ ہم تو اس قبرستان کی مٹی کے ڈبر میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں مرجائیں گے۔ تم نے سنا ہوگا کہ لاکھ دوڑ مسجد تک ہوتی ہے۔ بس ہم نے اس مٹی میں مٹی ہو جانا ہے۔ باؤ جی آپ لوگوں کی طرح ہماری کوئی بڑی خواہش یا زیادہ مسئلہ نہیں ہوتا ہر انسان کی فطرت کے اندر کوئی نہ کوئی مسئلہ یا آگے بڑھنے کا لالچ تو ضرور ہوتا ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔

”ہوتا ہوگا۔“

”لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتا جو آپ لوگ کرنے جا رہے ہیں۔ مجھے تو صرف اپنی مزدوری سے غرض ہے۔ مجھے تو ویسے بھی اس دور میں 200 روپے بھاری معاوضہ مل جائے گا اور مجھے کیا چاہئے۔“ اس نے کہا۔ ”لگتا ہے صاحب جی آگئے۔“ اس نے دروازہ کھولا تو وحید قریشی ہمارے سامنے باریک لمبل کی قمیض اور کاشن کی مختصر رنگی دھوٹی پہنے ہوئے کھڑا تھا۔ ”دیکھو میں نے کہا تھا ناں کہ وحید صاحب وعدے کے کپے

ہیں۔ ضرور آئیں گے۔“ وحید نے شکور خان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”گوشت تیار ہے۔“

”ہاں جی۔“ اور شکور نے اخباری کاغذ میں لپی ہوئی چیز وحید کے ہاتھوں میں پکڑادی۔ ”دیری لگے۔ یہ تو بڑا اچھا کم کردیا لیکن یہ بڑا ٹکڑا ہے اسے آدھا کر کے اس کو قیہ بنا دو تا کہ عمل پڑھتے وقت اسے آسانی سے سٹکا جاسکے۔“ مجھے اسے دیکھ کر ایکانی اور کراہیت محسوس ہونے لگی لیکن میں نے بالکل بھی اس کا احساس اس کے سامنے نہ کیا۔

میرے لرزاتے پاؤں اور سخت سردی کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کو دیکھتے ہوئے وحید نے مجھے کہا۔ ”دیکھو عبدالقدوس تم میرے دوست اور ہم راز ہو۔ اب بھی وقت ہے تم یہاں سے جاسکتے ہو۔ دیکھو جو کام میں اور تم کرنے جا رہے ہیں وہ بہت کٹھن ہے، تکلیف دہ اور خطرے والا ہے۔ اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی تخت یا تختہ، سیدھا ہو گیا تو وارے کے نیارے اور اگر انا ہو گیا تو تختہ ہو جائے گا یعنی اگر جن قابو نہ آیا اور وہ بگڑ گیا تو نہ جانے کیا ہو جائے۔“ میں نے وحید کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت اتنے مسائل کے دلدل میں پھنسا ہوا ہوں کہ میں ڈنٹی طور پر تمہاری ہر بات ماننے اور اس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔“

یہ سن کر وحید نے گہرا سانس لیا اور مجھے کہا۔ ”اچھا یہ بات ہے تو تمہاری مرضی، میں تمہاری خواہش کے مطابق تمہیں جن قابو کرنے کے لئے پہلے مرحلے کا عمل کروانا ہوں۔ اس مرحلے میں سب سے پہلے تمہیں یہ مردہ انسان کا قیہ کھانا پڑے گا اور ساری رات ایک خالی قبر میں میرے پیچھے بیٹھ کر وہ پڑھنا پڑے گا جو میں پڑھوں گا پھر آخر میں تمہیں ایک بد شکل جن نظر آئے گا اسے دیکھ کر ڈرنا نہیں بس اس سے اپنی خواہش کا اظہار کر دینا لیکن ہاں اس عمل میں تمہیں قمیض اتارنی ہوگی اور یہ عمل فجر کی نماز سے پہلے تک جاری رہے گا اور ایک بات تمہیں میں بتانا ہوگی کیا تم نے عمل کرنے سے لے کر اس کے ختم ہونے تک کوئی چھوٹا بڑا پیشاب نہیں

کرنا جو کرنا ہے پہلے کر لیکن استنجے کے ساتھ۔“ آپ کا تو غالباً دوسرا مرحلہ ہے۔“ شکور خان نے وحید کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ہاں میرا دوسرا مرحلہ عبدالقدوس کا پہلا مرحلہ ہے اس کا مطلب ہے کہ آپ کا آج کے بعد آخری اور تیسرا مرحلہ رہ جائے گا۔ اس کے بعد مطلوبہ جن آپ کے مکمل قابو میں آ جائے گا۔“ شکور خان نے کہا۔ ”ہاں میں پھر اپنی زندگی کی ہر خواہش اس کے ذریعے پوری کر پاؤں گا۔“ وحید نے فخریہ انداز میں کہا۔

”چلیں صاحب۔ اس گوشت کا قیہ بنا کر اسے دو حصوں میں لاتا ہوں۔“ شکور خان نے کہا۔

وحید پہلے قبر کے اندر کودا اور پھر مجھے خالی قبر میں اترنے کے لئے کہا۔ میری روح و جسم پر لرزہ طاری ہو گیا لیکن میں ہمت کے سہارے قبر میں اتر گیا۔ بہت بھیا تک سزاؤں کی بدبو آ رہی تھی تقریباً قیہ دو حصوں میں اخباری کاغذ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اسے دو حصوں میں کھانا پڑے گا۔ ایک حصہ عمل شروع کرتے وقت جب اس کی نیت کی جائے گی اور دوسرا جب تمہیں کچھ نظر آئے گا تو پھر اور جیسے میں پڑھتا ہوں گا تم بھی زبرد پڑھتے رہنا اور اپنی آنکھیں بند کر کے اور جب تمہیں کچھ نظر آئے تو پھر اس سے اپنے دل کا مدعا بیان کر دینا لیکن تم نے خشک بدن پر سردی کے جھوکوں اور کیڑے مکوڑے کے کاٹنے کے باوجود بھی ذرا بھی اپنی آنکھیں کھولنی اگر کھول دی تو سوچ لو کوئی نقصان ہوا تو مجھ سے شکوہ نہ کرنا۔“ وحید نے کہا۔

میں نے آنکھیں بند کر کے انسانی مردہ گوشت کا قیہ کھالیا، قیہ منہ میں رکھتے ہی ایسی کراہیت، بد ذائقہ اور کوفت ہوئی کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ وحید نے بھی میری طرح قیہ کھایا وہ جو بھی عمل پڑھتا رہا میں اسے دہراتا رہا۔

ہم دونوں کی پیٹھ قمیضوں سے محروم تھی اوپر سے شدید سردی کی آفت اور قبرستان کی خون خشک کرنے والی کیفیت ناقابل برداشت ہوتی جاری تھی۔ لیکن بہتر

مستقبل اور مسائل کے حل کے جوش و جذبہ کے تحت یہ کام کر رہے تھے۔

رات تقریباً ایک بجے اس نے خاموشی اختیار کر لی اور میں نے اپنی آنکھیں مسلسل بند کی ہوئی تھیں کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ اپنی آنکھیں اس وقت تک نہیں کھولنی جب تک میں نہ کہوں۔ میں آنکھیں بند کئے بے سدا رہا۔ سخت سردی اور انسانی مردار کچا قیہ کھانے سے میرے پیٹ میں شدید ناقابل برداشت ابکائیاں آرہی تھیں۔ لیکن میں نے اپنے دانتوں کو بری طرح بھینچا ہوا تھا۔

اس دوران رات کے تقریباً دو بجے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے آگے کوئی شیبہ بن رہی ہے۔ لہذا طبی طور پر کچھ فکری پھر غائب ہو جاتی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس نے کچھ سیکنڈوں کے لئے اپنی مکمل شکل اختیار کر لی وہ بہت خوفناک اور بد صورت بچے کی طرح تھی جس کے بڑے سے چہرے پر ماتھے کے درمیان ایک سرخ آنکھ تھی۔ اس کو جب میں نے دیکھا شکر ہے میرا شعور قائم تھا میں نے فوراً دل میں کہا۔ ”خدا کے لئے میرے معاشی مسائل حل کر دو۔ بھائیوں کو کہیں نوکری دلوادو۔“ پھر وہ فوراً جھٹ پٹ غائب ہو گیا۔ اگرچہ میں بے سدا آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔ میرا پورا جسم کپکپا رہا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میں اب شاید مرنے والا ہوں۔ میرے دل میں آیا کہ آنکھیں کھول دوں لیکن میں وحید کی آواز پر قائم تھا۔ چند لمحوں بعد وحید کی آواز سنائی دی۔ ”عبدالقدوس اپنی آنکھیں کھول دو۔“ میں نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

وحید نے اپنی میض پہنی اور مجھ سے کہا کہ تم بھی قمیض پہن لو۔ پوری رات خالی قبر میں نہ گفتہ حالت میں بیٹھ کر ایسا لگا جیسے پورا دن ہو گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد عبدالشکور گورکن دو پرانے کھل لے کر آیا۔ ایک اس نے میرے اوپر اور دوسرا وحید پر

ڈالا۔ وہ سہارا دے کر پہلے وحید کو اور پھر مجھے اپنی جمپوٹری میں لے کر گیا۔ وحید اور میں سردی اور پیٹ کے درد سے تڑپ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے گرم دیسی چھلی کے سوپ کے پیالے کے ساتھ ایک کالی سی گولی ہمیں دی تو میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہاؤ جی چھلی کا سوپ آپ کو گرمی اور درد کو راحت دے گا اور یہ کالی گولی آپ کا معدہ نہ صرف صاف کرے گی بلکہ آپ کے پیٹ کے اندر انسانی قیہ کی گندگی اور اثرات زائل کرے گی۔“

واقعی اس کا دیا ہوا سوپ اور گولی نے بڑا موثر کردار ادا کیا۔ ہم دونوں کے ہوش اور ذہن ٹھکانے آئے تو وحید نے مجھ سے پوچھا۔ ”اور بھی سناؤ رات کیسی گزری۔“

میں نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے تو تارے نظر آ گئے لیکن مجھ میں بچہ بھی نظر آ گیا۔“

”تو تم نے اہلاند عایان کیا کہ نہیں؟“

”ہاں کیا تھا۔“

”چلو، بہتر ہوگا۔“

میں صبح ہوتے ہی سیدھا اسپتال گیا کیونکہ میرے پیٹ کا درد اور ناک سے بہتا زلہ ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک دوا کھاتا رہا۔ جس سے میرے بہتے زلہ اور درد کو آرام ملا لیکن میرے پیٹ میں مستقل مروڑ اور موٹن کا مرض گھر کر گیا تھا۔ چند روز بعد مجھے مغربی پاکستان اپنے گھر سے خط ملا کہ مجھ سے چھوٹے بھائی کو دفتر خارجہ میں نوکری مل گئی ہے۔ میری تو خوشی کے مارے باپ چھپس کل گئیں۔ اب یہ بات مجھ پر عیاں ہو گئی کہ واقعی جن کو قابو کرنے کا میرا پہلا مرحلہ صحیح طور پر مکمل ہو گیا۔ دل کو تسلی ہوئی کہ بچہ جن نے میرا کام کر دیا۔

چند روز بعد مجھے وحید نے بلایا اور اس نے مجھے بتایا کہ وہ مزید ترقی کر گیا ہے۔ اور اب اسے علیحدہ چھوٹا سا بنگلہ مل گیا ہے اور دوسری طرف گاؤں سے خبر آئی ہے کہ مجھے خدا نے اولاد دینے سے نوازا ہے۔ میں نے بھی

اسے اپنے بھائی کی اچھی جا ب کے بارے میں بتلایا۔ یہ سن کر وہ خوش ہوا لیکن اس نے مجھ سے کہا۔ ”اگر تم اپنی زندگی میں مزید ترقی و خوشحالی چاہتے ہو تو تمہیں اب جن کو قابو کرنے کے لئے دوسرا مرحلہ طے کرنا ہے۔“ اور نیز اس نے یہ بھی بتلایا کہ ”وہ اب جن کو قابو کرنے کے لئے آخری مرحلہ طے کرے گا جس سے وہ اس کے مکمل قابو میں آ جائے گا وہ پھر اپنے قابو شدہ جن کے ذریعے کئی کام کرانے گا۔“

میرا یقین تو پختہ ہو چکا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مجھے دوسرا مرحلہ طے کر کے جن کو مزید قابو کر کے اس سے مزید افادیت حاصل کرنی چاہئے۔ وحید نے پھر ماضی کی طرح تاکید اور تنبیہ کی۔ ”اس بار بھی یہ کام بڑی راز داری اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہئے۔“

میں مان گیا اس بار ہمارا خالی قبر میں عمل کرنے کا دن اتوار کے روز طے پایا کیونکہ دوسرے دن یعنی سوموار کے دن کوئی قومی دن کی وجہ سے چھٹی تھی۔

وحید نے مجھ سے کہا کہ ”تم اس قبرستان میں شکور خان گورکن کے پاس آٹھ بجے آ جانا۔“ اور اس نے یہ بھی بتایا اس دفعہ ذرا عمل سخت ہوگا لیکن اگر یہ ہو گیا تو پھر میرے اور تمہارے وارے کے نیارے ہوں گے۔ اب تمہارا دوسرا اور میرا تیسرا مرحلہ رہ گیا ہے اور ہاں یہ چلہ پہلے سے ذرا سخت اور طویل نوعیت کا ہوگا۔ تم ہر قیمت پر وہاں آ جانا میں تمہارا انتظار کروں گا۔

نیز وحید نے مجھ سے بھی بتایا کہ اس نے 300 روپے گورکن کو ایڈوانس دے دیے ہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔ میں نے بادل خواستہ حاوی بھر لی۔

اتوار کے دن صبح ہی سے بہت سرد ہوائیں جیسو کی فضاؤں کو ٹھہرائے دے رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ رات کو قبرستان کی سخت سردی میں ٹنگے بدن خالی قبر میں چلہ کشی کرنی ہے لہذا کیوں نہ میں چھلی کی بنی بی لوں لہذا میں وہاں کی باغ مخصوص بنگالی چھلی خرید کر لایا۔ میں نے ہیرک کی کینٹین کے ایک ویٹر کو کہا۔

”ذرا اس کا سوپ بنا دے۔“ میرا خیال تھا کہ میں سوپ کے ایک دو پیالہ پی کر قبرستان جاؤں گا۔ تاکہ جسم کسی حد تک گرم رہے۔ دیر کے لئے ہوئے سوپ کے دو پیالے پینے کے بعد میرے پیٹ میں ایسا لگا جیسے میں نے کوئی بارود پی لیا ہے۔ اور وہ پھٹنے کو بے تاب ہے۔ ناقابل برداشت مروڑ کے ساتھ مجھے ہیضہ ہو گیا۔ میری بگڑتی حالت کو دیکھتے ہوئے فوری طور پر میرے ہیرک کے سپاہی مجھے اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے ابتدائی طور پر مجھے درد کش ٹیکہ اور کچھ وغیرہ دیئے۔ لیکن مجھے آرام نہ آیا درد تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ دوسرے دن میں نے چلہ کٹانے کے لئے لازماً جانا تھا۔ میں نے اسپتال میں جھوٹا بھانہ کیا کہ ”میں نے بہت ضروری کسی عزیز کی شادی میں جانا ہے لیکن وہاں کے ڈاکٹر میرے ساتھیوں اور عملے نے مجھے سختی سے روکا کہ تمہاری حالت بہت خراب ہے۔“

بہر حال جب میرا درد حکم شدید بڑھنے لگا اور مجھ پر غشی کے دورے پڑنے لگے تو فوری طور پر ڈاکٹروں نے مجھے بے ہوش کا ٹیکہ لگا دیا صبح غنودگی کے عالم میں میری آنکھ کھلی تو میرا درد حکم ختم ہو چکا تھا۔ البتہ گلوکوڈ کی بوتل کی پتلی ٹیوب میرے بازو میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے ہونٹوں کی طرح اپنے گرد کے ماحول کا جائزہ لیا تو وہاں ایک نرس میرے چند ہیرک کے ساتھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان میں سے ایک میرا دوست بولا۔ ”تمہارے لئے ایک خوشخبری ہے۔ اور دوسری محسوس خبر ہے۔“ میں نے اچھے اور خیریت سے پوچھا۔

”کیا خبر ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے کہ بڑی جدوجہد اور مشکل کے بعد تمہاری جان بچ گئی لیکن تمہارے لئے یہ بری بلکہ محسوس خبر ہے کہ آفیسر ذکالونی سے یہ خبر آئی ہے کہ تمہارے بھگری دوست وحید قریشی قریبی قبرستان کے ایک خالی قبر میں ٹنگے بدن کوئی چلہ کر رہے تھے کہ وہ مر گئے۔“



## قوس قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

پلکوں پہ آنسوؤں سے چراغاں کریں گے ہم  
اس طرح کہکشاں کو پریشان کریں گے ہم  
واقف ہیں ہم بھی گردشِ دوراں سے دوستو!  
اس بات پہ نہ چاک گریباں کریں گے ہم  
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

موسم کو موسم کی بہاروں نے لوٹا  
کشتی کو سمندر کے ظہری کناروں نے لوٹا  
ارے تم تو ایک قسم سے ڈر گئے  
تیری قسم دے کر مجھے ہزاروں نے لوٹا  
(خضر حیات.....روڈہ تھل)

کبھی راتوں کی کروٹیں کبھی دن کی بے چینیاں  
اے محبت خدا کے واسطے ذرا محبت سے پیش آ  
(محمد ندیم جوئیہ.....روڈہ تھل)

واہ میرے محبوب بڑی جلدی خیال آیا  
بس کرو چومنا اب اٹھانے دو جنازہ  
(محمد انیسال جوئیہ.....روڈہ تھل)

تم صاف رہو یا نہ رہو اے مہ تاباں  
ہم وہ ہیں کہ دل بھی کبھی میلا نہیں ہوتا  
کیوں عشق میں ڈوبے نہ رہیں چاہنے والے  
دریائے محبت میں کنارہ نہیں ہوتا  
(مہر پرویز احمد دولہ.....میاں چنوں)

ہے نزاکت بلکہ فصلِ گل میں معیار چن  
قلبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوار چن  
وقت ہے، مگر بلبلِ مشکیں زلیخائی کرے  
یوسفِ گل جلوہ فرما ہے، یہ بازار چن  
(انس حبیب خان.....کراچی)

آہ کو چاہے اک عمر اڑ ہونے تک  
کون جیتا ہے تیری زلف کے سحر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن  
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک  
(شرف الدین جیلانی.....ٹنڈوالہ یار)

اپنے خیالوں میں آنے کی اجازت دو ہم کو  
ہم تمہارے ہیں بتانے کی اجازت دو ہم کو  
یہ نہ ہو ٹوٹ جائے امیدِ وفا ہماری  
بس کچھ پل چینیے کی اجازت دو ہم کو  
(شاہد علی خان.....لورالائی)

تمہارا نام لکھ کر مٹانا بھول جاتا ہوں  
تمہیں جب یاد کرتا ہوں بھلانا بھول جاتا ہوں  
بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میرے دل میں رہتی ہیں  
مگر جب تم سے ملتا ہوں تو مٹانا بھول جاتا ہوں  
(جہانزیب.....کراچی)

گرنے سے پہلے میں بھی قابلِ پرواز تھا  
بے وفائی اس نے کی جس کی وفا پہ بڑا ناز تھا  
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد.....ننگا نہ صاحب)

ابھی تو دفن بھی نہ ہوئے تھے خاکِ قبرستان میں ہم  
کہ شہنایوں کے ساتھ رقص کرتے جاں ہماری لٹے  
(ذکاء اللہ بھٹی.....کراچی)

تم خواب میں آئے پاس میرے  
ہم دل کی تمنا کہہ نہ سکے  
ہم خواب میں بھی ڈرتے رہے  
رسوا تو نہیں کردو گے مجھے  
(رشک نور.....فیصل آباد)

ڈاکٹر نے دوا کے ساتھ، لکھا اس کا بھی نام  
پھر لکھا یہ بھی کہ ”صبح“، دوپہر، شام  
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی.....ٹھیک موڈ قصور)

تجھ سے ملنے کی دعا لب پہ نہ آجائے کہیں  
چاند کو دیکھ کر یوں آنکھ بچائی ہم نے اے دوست  
(دلیر خان.....کوئٹہ)

حدِ جمیل کو پہنچی تیری رعنائی حسن  
جو کسر تھی وہ مٹادی تیری انگڑائی نے  
(عبدالحمید آرائیں.....گجرات)

☆☆



پڑھ کے صلی علی سرور ملا  
دیدہ دل کو کیا نور ملا  
ملا، پس آپ کا سہرا  
آپ کی شان میں کلامِ خدا  
رحمت دو جہاں آپ ہوئے  
رب کے اک ترجمان آپ ہوئے  
دینِ اسلام آپ سے پھیلا  
شرک کا داغ آپ نے دھویا  
آپ کی کیا شائستگی ہو  
قلبِ خوش آپ کی نظر سے ہو  
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

کے جو ہم سے وعدے تو انہیں وفا کرنا  
مانگ لینا جان ہم سے بچ نہ جانا کرنا  
بس کر کردیں گے سب کچھ قربان ہم  
مصعوم سا دل توڑنے کی نہ خطا کرنا  
میں عشق کی انتہا کو چھو جاؤں جو کہو  
میرے عشق کو ہی میری نہ سزا کرنا  
زمانے کی تنخیاں سہہ کر تم کو پایا ہے  
ہو کر قریب وہ تنخیاں بھلایا کرنا  
قدم قدم پر دکھاتا ہے زمانہ دل  
گر ہو سکے تو ہر دکھ کا تم مداوا کرنا  
جب فرصتوں میں ہو کی محسوس تو  
آنا میرے پاس اور پیار سے جایا کرنا  
میری فرصتوں کی محتاج محبت کی قسم  
ہے نینا کی فطرت تو تجھ سے وفا کرنا!!!  
(ایڈووکیٹ نینا خان.....کراچی)

تیری چاہت میں تیرے دیوانے ہو گئے  
اب تو ہم انہوں سے بیگانے ہو گئے

تیری پھول سی صورت کے ہم طلبگار تھے  
پھر آنکھوں میں کیسے خواب سہانے ہو گئے  
جو تیری یاد میں کھوئے رہتے تھے اکثر  
وہ جان تمنا تیرے جیسے مٹانے ہو گئے  
تیری شوخ نگاہوں نے کردیا ڈنڈی ہم کو  
کارگر تیری آنکھوں کے نشانے ہو گئے  
تیرے ساتھ گزارے تھے پیار بھرے لمحات  
جیسے اب وہ ماضی کے فسانے ہو گئے  
اپنی جان سے زیادہ تجھے چاہا ہے جاوید  
پھر کیوں غیروں سے تیرے یارانے ہو گئے  
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

دل کی بربادی کا قصہ ہم نے سن لیا  
اک دیوانی کو ہمارے دل نے جن لیا  
آئی صبا تو پوچھا حراجِ یار کا  
ایک ایک پہلو ادا صبا نے گن دیا  
پتا چلا کہ دیوانی تنہائیوں میں رہتی ہے  
خوش رہنے کا ہم نے اسے فن دیا  
اب اشک نہیں بہانہ مسکراتا ہے سدا  
چلو من بھی دیا اور تمہیں تن بھی دیا  
اب نہ کہنا تنہا ہوں تمہارے ساتھ ہوں میں  
اے صبا اے کہنا کیا اس نے سن لیا  
(محمد اسحاق انجم.....گگن پور)

لہرائے سدا آنکھ میں پیارے تیرا آنچل  
جمویر ہے تیرا چاند، ستارے تیرا آنچل  
آنچل میں چھپے رنگ کھاریں تیری زلفیں  
ابھی ہوئی زلفوں کو سنوارے تیرا آنچل  
اس وقت ہے تپ کی طرح ہوا دوش پر  
اس وقت کہاں بس میں ہمارے تیرا آنچل  
اب تک میری یادوں میں ہے رنگوں کا ظلم  
دکھتا تھا کبھی جمیل کنارے تیرا آنچل  
لپٹے کبھی شاخوں سے کبھی زلف سے اٹھے  
کیوں ڈھونڈتا رہتا ہے سہارے تیرا آنچل



کاجل بہہ بہہ کے رلائے مجھے اب بھی  
رہ کے مجھے اب بھی پکارے تیرا آجکل  
(شرف الدین جیلانی..... شہزادہ یار)

یہ شاہکار وطن تار تار میرا ہن  
یہ جھلے جھلے سے چہرے پہ زرد زرد بدن  
یہ وہ ہیں جن کی سیاست سے آشتی نہیں  
نہ اس آسکا ان کو نہ ان کا علم نہ فن  
دفا و صدق و صفا ہیں صفات اعلیٰ درست  
مگر نتیجہ فقط تنگی ہائے کام و دین  
شجر شجر ہے ستم آلود ہر کلی پر خون  
نہ پوچھ ہم نفو حسن و آب رنگ چن  
ہزار دہم ہیں دل میں تو اشک آنکھوں میں  
نہ آرزوئے بہاراں، نہ پرکشش سادوں  
عجب سکوت ہے اب اطہر زندگانی میں  
نہ ان کو تاب سخن ہے نہ مجھ کو شوق سخن  
تمام عقل زیاں کار کے کرشمے ہیں واجد  
کہ قحط و جنگ ہیں اب نصیب ہر دامن  
(پروفیسر ڈاکٹر واجد گئیوی..... کراچی)

سنو  
تم سے ملنے بھی تو کیسے ملتے  
میرے منزل دور نہ تھی

کبھی راستوں نے بھٹکا دیا  
کبھی موسموں کی نظر لگ گئی  
کبھی کسی مجبوری کی زد میں آگئے  
اور کبھی  
اور کبھی محبت ہی نہ رہی

(ایس امتیاز احمد..... کراچی)

چھیڑ دیتا ہے یہ دل پھر سے پرانی کوئی بات  
کوئی دکھ کوئی گلہ کوئی کہانی کوئی بات  
ایک چپ تھی جو کہ خوشبو کی طرح پھیلی تھی

صبح دم کہہ نہ سکی رات کی رانی کوئی بات  
اہل ملکین کا تو شیدہ ہے کہ بدنام کریں  
گل بھی سنتا کبھی بلبل کی زبانی کوئی بات  
وہ تیرا عہد وفا تھا کہ وفائے وعدہ  
میں کہہ کر پھر بھول گیا یاد دلانی کوئی بات  
جانے کیوں اب کے پریشان ہیں تیرے خانہ بدوش  
ورنہ ایسی بھی نہ تھی نقل مکانی کوئی بات  
جس طرح ساری غزل میں کوئی عمدہ مصرع  
جس طرح یاد میں رہ جائے نشانی کوئی بات  
اہل دستار و قبا ترش جبین کیوں ہیں شہزاد  
کہہ مئی کیا میری آشتی بیانی کوئی بات  
(ڈاکٹر رانا عامر شہزاد..... ننگا نہ صاحب)

دل سے دور وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
دونوں انسان ہیں خدا وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
وہ مجھے اور میں اسے الزام دیتا ہوں  
مگر غلط اپنی جگہ وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
محبت تو ہم دونوں کرتے ہیں دل سے  
محبت کا گناہگار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
عمر بھر ساتھ اگر ہم جی لیں تو کیا ہوگا  
پر ہاتھوں کی لکیروں میں وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
اس کے علاوہ میں کیا مانگوں اس خدا سے  
اور کسی چیز کا طلبگار وہ بھی نہیں میں بھی نہیں  
(خضر حیات..... روڈہ تھل)

شام سہانی اور شاہراہ قائد کی نمی نمی چھاؤں  
ایسے لگے ہم تم رہتے ہیں کسی اجنبی گاؤں  
تہا جا رہے ہو دل کہہ رہا ہے  
آؤ ساتھ میرے تم بھی کوئی نغمہ گاؤ  
شاخسار ہیں سجے شمعوں سے  
دل میں کوئی نہیں آؤ سہم جاؤں  
ہر ایک حسینہ پہ حسن کی چھاؤں  
سب سے بے نیاز ہے تمنا ہے تم ہی کو پاؤں  
پہلے ہی دل پر ہیں بہت زخم

Dar Digest 222 May 2018

اس بچے سے دل پر تم ستم اور نہ ٹھاؤں  
اگر آج تم مجھے مل گئی تو  
تجھے لے کے کہیں دور بھاگ جاؤں  
شام سہانی اور شاہراہ قائد کی نمی نمی چھاؤں  
ایسے لگے ہم تم رہتے ہیں کسی اجنبی گاؤں  
(غلام مصطفیٰ بادل..... قصور)

یہ کیا ستم مرے پروردگار ہوتا ہے  
ستم عدو میں کوئی سوگوار ہوتا ہے  
کسی کا شام و سحر انتظار ہوتا ہے  
اب آگے کیا میرے پروردگار ہوتا ہے  
وہ گھر ہمارے لئے قافل زیارت ہے  
ترا ظہور جہاں بار بار ہوتا ہے  
تمام اہل جہاں جب خاموش ہوتے ہیں  
تو ساز عشق مرا نغمہ بار ہوتا ہے  
یلاک اپنے نقش کا رقص میں آنا  
تجھ میں ایسے نشان بہار ہوتا ہے  
تجھ کی یاد ستانی ہے کیوں یہاں مجھ کو  
یہ آج کیا ہے کہ دل بے قرار ہوتا ہے  
تجھ کی یاد سے باتیں کروں نہ کیوں عامر  
اسی سے دل کو مرے کچھ قرار ہوتا ہے  
(ایس حبیب خان..... کراچی)

تیری آنکھوں کا نور ہوں میں  
تجھ سے پھر اتنی دور ہوں میں  
اپنی راہوں سے بھٹکا ہے تو  
دیکھ بیٹھی ہوں رنجور میں  
تو ہے مغرب کے نشے میں گم  
تیرے نشے میں ہوں چور میں  
تیری یادوں میں ڈوبی ہوئی  
آنسوؤں میں شرابور میں  
میں پری ہوں بدلتی المال  
کھڑی لے کر سندور میں  
تو ہے گاؤں کا گھرو جوان

Dar Digest 223 May 2018



## چڑیل کا بسیرا

شازہ اعوان - راولپنڈی

اچانک چڑیل کی آواز سنائی دی، میرا بیٹا درخت کی ٹھنی پر موجود تھا کہ اس گھر کے فرد نے کلھاڑی سے میرے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی اور میں ہر صورت اپنا بدلہ لے کر رہوں گی اور پھر.....

ایک سرکش چڑیل کی سرکشی جس نے گھروالوں کو تنگ کر رکھا تھا..... خیر انگیز کہانی

جو کہانی میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں سو فیصد سچی کہانی ہے آپ کو کہانی پڑھنے کے بعد اس کی سچائی کا علم ہو جائے گا کہ یہ واقعہ کس کے ساتھ پیش آیا تو سمجھیں۔

یہ سچی کہانی ہے کہ لاہور میں میرے شوہر کا ایک دوست رہتا تھا۔ اور وہ اس کے ساتھ مل کر ایک ہوٹل بنانا چاہتے تھے اس لئے میرے شوہر مجھے اور دو چھوٹے بچوں کو لے کر آگے میری ایک بیٹی تھی جس کا نام شمن نور تھا۔ اور ایک بیٹا جس کا نام اسفندیار تھا بیٹی تین سال کی اور بیٹا ایک سال کا تھا۔

لاہور آ کر ہم نے فاروق یعنی کہ آصف کے دوست کے گھر کے ساتھ والا گھر کرایہ پر لے لیا یہ گھر ایک ٹاؤن ایریا میں شفٹ ہوئے۔ لاہور آنے کی وجہ صرف

نا زندگی کا سوچا تھا نہ زمانے کا سوچا تھا میں نے بس تمہیں اپنا بنانے کا سوچا تھا تمہارے روٹھ جانے کے انداز کی قسم تم روٹھ جاؤ تو زمانے کا سوچا تھا وقت نے نہ کی وفا تو کوئی گھٹ نہیں میں نے تم سے وفا نہیں مہمانے کا سوچا تھا تم مجھے رلاؤ تو کوئی بات نہیں میں نے رو کر بھی تمہیں مہمانے کا سوچا تھا (محمد عیدم۔ روڈ ہٹل، خوشاب)

اُس کے ہونٹوں پر اتر آئی دعا میرے بعد یہ بھی صد شکر مرا نام لیا میرے بعد اپنی ہستی سے تو ویسے ہی اسے نفرت تھی وہ تو کرتا ہی رہا خود سے جفا میرے بعد ہوش اپنا نہ کسی شخص کی پہچان اسے روگ ایسا ہی کوئی اس کو لگا میرے بعد وہ جو پتھر کے خداؤں میں رہا کرتا تھا اس کی آنکھوں سے کوئی اشک گرا میرے بعد اس کو احساس ہوا میرے چھڑنے سے اس نے محفل میں مرا ذکر کیا میرے بعد (راشد زمان۔ صادق آباد)

سرد راتوں کو میرے پاس آتی ہیں تیری یادیں ہر شب تہائی میں ستانی ہیں تیری یادیں لوٹ کر اب بھی نہ آئے گا تیرے پاس ہر شب یہی کہہ کر مجھے رلائی ہیں تیری یادیں روز و شب تجھے بھلانے کی کوشش کرتا ہوں تیرا نام لے کر ترپاتی ہیں مجھے تیری یادیں جب بھی مجھ جاتا ہے تیرے پیار کا دیا مجھ سے پوچھے بغیر اسے جلاتی ہیں تیری یادیں فلک بھلانا چاہتا ہوں جس صورت کو ہر شب وہی صورت دکھاتی ہیں تیری یادیں (فلک زاہد..... لاہور)

☆☆

میرے مزدور

میرے دوست

غم نہ کر

ہم سب ساتھ ہیں

(گلاب خان سولنگی..... نوشہرہ فیروز)

روشنی کی اس طرح تشہیر ہونی چاہئے ظلمتوں کی پھر بری تقدیر ہونی چاہئے واعظو ہیں اس جہاں میں کچھ ہمارے بھی حقوق میکدے میں آج اک تقریر ہونی چاہئے تجھ سے تیرے ظلم کی روداد کہنے کیجئے! تیرے در پہ عدل کی زنجیر ہونی چاہئے چاندنی ہے دھوپ جیسی دھوپ سایہ دار ہے ہے اگر یہ خواب پھر تعبیر ہونی چاہئے آج پھر ہے عید شاکر پھر وہی تہائیاں وہ نہیں تو ان کی گھر تصویر ہونی چاہئے (محمد حنیف شاکر..... بھاگوالی نکانہ صاحب)

کون ہو تم

میرے انتظار کی راحت ہو تم

میرے دل کی چاہت ہو تم

تم ہو تو یہ دنیا ہے

میں کیسے کہوں کہ میرے لئے کیا ہو تم

چلو میں بتاؤں کیا ہو تم

میں نے جو مانگی وہ دعا ہو تم

کرے مجھ کو جو روشن وہ دیا ہو تم

فضا میں مہکتی اک شام ہو تم

پیار میں چمکتا جام ہو تم

میری زندگی کا دوسرا نام ہو تم

میری جھپتی زندگی کی سانس ہو تم

پھر کیسے نہ کہوں

میری جان ہو تم

(محمد انیال جوئیہ۔ روڈ ہٹل خوشاب)

دو کروں پر مشتمل تھا اور ساتھ میں ایک کونے میں دواں روم غسل خانہ بنا ہوا تھا جبکہ آگے صحن میں چھوٹا سا بچن تھا صحن کے درمیان میں ایک بڑا اور گھنا سا لوترے کا درخت تھا۔ ہم میاں بھوی دونوں نے نل کر ایک کمرہ مہمانوں کے لئے سیٹ کیا تاکہ آنے جانے والے مہمان اس میں رہ سکیں اور دوسرا کمرہ ہم نے اپنے لئے رکھا کچھ دن تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہا تقریباً پندرہ سولہ دن کے بعد آصف نے ماشاء اللہ ایک ہول کھول لیا وہ 7 بجے جاتے اور دن کو 12 بجے تک گھر آ جاتے تھے پھر اس کے بعد رات کو 8 بجے جاتے ہوئے پرسب نے ملازم کام کرتے تھے اس لئے آصف بس چکر وغیرہ لگا کر واپس آ جاتے۔

میرے شوہر زیادہ تر کھانا گھر میں ہی کھاتے تھے کیوں کہ مجھے شروع سے ہی اچھے اچھے کھانے بنانے کا شوق تھا اس لئے میں گھر کے کاموں اور کھانے وغیرہ کا کام اچھے سے انجام دیتی تھی اور میرے شوہر جب بھی کھانا کھاتے کھلے دل سے تعریف کرتے تھے کیونکہ ہماری شادی کو 6 سال ہو چکے تھے۔ لوگ ہماری محبت کی مثال دیتے تھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔

اس دن آصف ہوٹل پر چلے گئے میں نے سارا کام ختم کیا بچوں کو نہلا کر کپڑے بدلے اور چھوٹے بیٹے کو دودھ کا فیڈر بنا کر دیا وہ سو گیا میں نے سوچا چلو آج آصف کی پسند کی چکن بریانی بنا دوں میری بیٹی بھی میرے ساتھ چکن میں آگئی۔

میں نے بریانی بنانی شروع کی جب بریانی بن گئی تو میں نے دم پر کھڑی، میری بیٹی نے کہا "ماما میں نے بسکٹ کھانے ہیں۔" میں نے کہا۔ "جاؤ بیٹا کمرے میں ٹیبل پر میں نے رکھے ہیں اٹھاؤ۔"

ٹھیک ہے ماما۔ "وہ کہتی ہوئی چکن سے نکل گئی تو میں نے موائس اٹھایا اور اپنے شوہر کو کال کی اور پوچھا گھر کس تاخیر آئیں گے۔"

"بس 20 منٹ مبر کرو آ رہا ہوں۔" میں نے فون بند کیا اور جلدی جلدی رانے بنانے لگی۔ رانے

بنا کر میں نے ابھی رکھائی تھا کہ مجھے چکن سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی عورت میری کمر کے پیچھے پیچھے پکار رہی ہو میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا میں نے آرام سے گیس بند کیا اور چولہے سے بریانی تیار کی۔ پھر وہی آواز ٹپ ٹپ ٹپ آئی شروع ہو گئی میں نے گھبراتے ہوئے ایک بار پھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

میرا دل خوف سے دھڑکنے لگا اگر یہاں کوئی نہیں تو پھر آواز کسی ہے ابھی میں خوف کے مارے قہر قہر کانپ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کس طرح چکن سے باہر جاؤں مگر میرے قدم جیسے جم گئے تھے۔

اتنے میں ایسے معلوم ہوا جیسے دو عورتیں آگس میں سرگوشی کر رہی ہوں پھر تو جانے کیسے مجھ میں اتنی ہمت آئی کہ میں بھاگ کر چکن سے باہر نکل اور بھاگتے ہوئے سیدھی اپنے کمرے میں گئی میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور پسینے سے میرا جسم تر ہو چکا تھا میں اتنی ڈر گئی تھی کہ میری بیٹی نے مجھے آواز دی تو میری چیخ نکل گئی، میں تو پہلے سے ڈری ہوئی تھی اس کی اچانک آواز دینے پر حیدر ڈر گئی اتنے میں باہر گیٹ (چکن کے ساتھ آگے گیٹ تھا چکن کے سامنے سے گزر کر گیٹ تک جانا پڑتا تھا) جاؤں، دستک جب پار ہوں گی تو میں نے دھڑکنے والے دلوں پر قابو پاتے ہوئے گیٹ تک گئی کھانا کھانا کھانا آصف کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے تم ٹھیک تو ہو کب سے دستک دے رہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے غرور مندی سے بولے۔ "نہن..... نہن..... نہیں کوئی بات نہیں....." میں نے گیٹ بند کیا ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی جب وہ چکن کے بالکل سامنے گئے تو رک گئے۔

"واہ بی بی بڑے مزے کی خوشبو آ رہی ہے..... لگا ہے تم نے بریانی بنائی ہے۔" میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو انہوں نے مزے مزے کی طرف دیکھا۔ میں آنکھیں پھاڑے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہی ہو، کیا بات ہے بتاؤ تم مجھے کافی پریشان لگ رہی ہو۔"

"وہ..... وہ..... آ..... ف..... وہ....." میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کون ہے چکن میں۔" اتنا کہ وہ چکن میں گئے وہاں کوئی نہ تھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں۔" "آصف یہاں کوئی عورت تھی وہ روٹی بنا رہی تھی سرگوشی کر رہی تھی..... آصف مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے آصف کا ہاتھ پکڑ لیا۔

تو وہ مسکرانے لگے۔ "واہ میں اپنی پیاری بیوی کو بہت بہادر سمجھ رہا تھا مگر تم تو ڈر پوک ہو۔" ایک بار پھر مسکرائے اور کہا۔

"یار دیکھو رات ہوتی تو پھر بھی میں مان لیتا کہ تم ڈر گئی ہو۔ ارے دن کے 12 بجے تم ڈر گئی اسی لئے کہتا ہوں کہ آرام کیا کرو تم ہر وقت گھر کے کاموں میں لگی رہتی ہو رات کو بھی بچے تمہیں نیند نہیں کرنے دیتے تمہیں آرام کی ضرورت ہے چلو کھانا کھاتے ہیں پھر تم آرام کرنا تو بڑی دیر سو جاؤ گی تو اپنے آپ کو فریض محسوس کر دو گی۔" میں نے کہا۔ "اسفند کب کا سو رہا ہے ابھی جاگ جائے گا پھر وہ کب سونے دے گا مجھے۔"

"ارے جان من تم بچوں کی فکر نہ کرو میں یہاں موجود ہوں بچوں کو کھانوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو پھر کھانا کھاؤ۔"

"ہاں ٹھیک ہے تم کھانا کھا لو میں منہ ہاتھ دھو لوں۔" وہ دواں روم میں چلے گئے تو میں نے چکن میں جا کر کھانا کھانا تو اس وقت مجھے نہ کوئی آواز سنائی دی اور نہ میں ڈری۔ کیوں کہ اپنے شوہر کی باتوں سے مجھے کافی تسلی ہوئی تھی آصف منہ ہاتھ دھو کر واپس آئے تو میں نے کمرے سے اپنی بیٹی کو بھی بلایا اور ہم کھانا کھانے لگے موسم تو گرمی کا تھا مگر چکن کے آگے صحن میں جو درخت تھا اس کی ٹھنڈی ہوا سیدھی چکن میں آتی تھی۔ اس لئے ہم اکثر چکن میں ہی بیٹھ

کر کھانا کھالیتے تھے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میرے شوہر نے کہا۔ "چلو اب تم آرام کرو۔" ہم اندر کمرے میں آ گئے، میں بیڈ پر لیٹ گئی جب کہ شوہر سامنے چار پائی پر بیٹھے صحن سے باتیں کرنے لگے اور مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ کب مجھے نیند آ گئی جب میری آنکھ کھلی تو شام کے 5 بج رہے تھے میں اٹھ کر بیڈ پر میرے شوہر دونوں بچوں کو پاس بیٹھائے آنکس کریم کھلا رہے تھے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "جاگ گئی....."

میں نے کہا۔ "بی جاگ گئی۔" تو بولے۔ "تم سو رہی تھی صحن آنکس کریم مانگ رہی تھی تو میں نے باہر دکان سے لے دی۔ تمہارے لئے بھی لے آؤں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ بھی کھا نہیں گے۔" "ہاں میں بھی کھاؤں گا۔" وہ باہر آنکس کریم لینے گئے تو میں منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس وقت میں کافی فریض ہو چکی تھی میں نے دل میں سوچا کہ آصف صبح کہتے تھے کہ آرام نہ کرنے کی وجہ سے تمہیں یہ سب کچھ سنائی دیتا ہے۔ پھر میں نے صحن کے فرش پر دیکھا تو دھیروں پتے گرے ہوئے تھے میں نے سوچا آصف ابھی نہیں آئے چلو جھاڑو لگا دوں میں نے جلدی جلدی جھاڑو لگائی سارے پتے اٹھا کر کرچرے دان میں ڈال دیئے اور جھاڑو ایک سائیڈ پر رکھ دی۔

جب میں پیچھے مڑی تو پتے پہلے سے بھی زیادہ فرش پر ڈھیر لگ چکے تھے میں نے ایک بار پھر جھاڑو لی اور شروع ہوئی۔ لیکن تیسری بار تو فرش کم نظر آ رہا تھا اور پتے زیادہ، میں سوچنے لگی یا اللہ پہلے تو اتنے پتے نہیں گرتے تھے یہ آج کیا ہو رہا ہے۔ اتنے میں آصف آ گئے ابھی میں کھڑی تھی درخت بھی فرش پر پڑے بچوں کو دیکھ رہی تھی کسا صنف نے پوچھا۔

"کیا ہوا کیوں ایسے کھڑی درخت کو کھڑے جارہی ہو۔"

میں نے کہا۔ "دو بار جھاڑو لگائی لیکن یہ پتے۔" انہوں نے میری بات کا تے ہوئے کہا۔ "چلو چلو"



مستند ڈاکٹروں، حکیموں، ماہرین طب ہدایات مشوروں سے لکھی گئی مفید کتاب

قیمت - 100 روپے

## ہیپاٹائٹس اور علاج

(کالابرقان)

پڑھئے ہیپاٹائٹس کیوں اور کیسے ہوتا ہے، جگر کی ساخت، جگر کا اہم کام، پوریابنے کا عمل، ناکارہ خون کے ذرات، مفید عضو، ہیپاٹائٹس اور کینسر، جنسی علامات، مرض کی وجوہات، قدرتی نظام، گردوں کا عمل، ہیپاٹائٹس اے، اور ہیپاٹائٹس بی، ایلو پیٹھی اور ہومیو پیٹھی علاج، ہیپاٹائٹس کا طبی علاج، دافع درد جگر، نسخہ دافع یرقان، نسخہ آملہ، شربت انار، عرق کاسنی، نسخہ آب آمین تاب، خشک انجیر سے علاج، گردے کا درد، گردے کا ورم، جگر پر ورم، جگر میں گرمی، یرقان (پیلیا)، زیادہ پیشاب آنا، گردوں کے نقص، جگر میں ورم کے لئے، تلی کا رائے سے علاج، تلی بڑھنا، تلی کا ورم، آک سے یرقان کا علاج، امراض گردہ مثانہ کے چند نسخے، دن میں صرف دو بار کھائیے، دن میں آٹھ گلاس پانی پینا ضروری ہے، روزانہ پندرہ منٹ ورزش کریں، حفظان صحت کے 39 اصول، اور دیگر معلومات اور ان کا علاج گھریلو نسخے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفیٰ

شیخ بک ایجنسی  
نویڈاسکوائر گڑھی  
اردو بازار

Ph:32773302

آکس کریم کھالو۔  
میں بھی سر جھٹک کر ان کے ساتھ اندر آگئی۔ ہم نے آکس کریم کھائی اور بچوں کو لے کر باہر صحن میں آگئے کیونکہ شام ہو رہی تھی۔ باہر شادی ہوا چل رہی تھی، ہم نے درخت کے نیچے چار پانی بچھا دی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آصف کی نظر فرش پر پڑی تو وہ بولے۔  
”یارتو ویسے ٹھیک لگتی ہو بہت پتے گرتے ہیں۔ اچھا میں ایسا کرتا ہوں یہ جو شاخیں آگے کی طرف ہیں یہ زیادہ پھرا کرتی ہیں ان کو کاٹ دیتا ہوں۔“  
میں نے کہا۔ ”ہاں یہ آپ نے ٹھیک کہا کاٹ دیں ان کو پھرتا کچرا بھی نہیں ہوگا۔“  
انہوں نے کہا۔ ”تم یہ چار پانی ایک سائیڈ پر کرو میں اپنے دوست فاروق کے گھر سے آری لے آتا ہوں پھر کانوں گا۔“  
میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ آری لے آئیں۔“  
فاروق کا گھر بالکل ساتھ تھا وہ جلدی واپس آگئے۔ پھر انہوں نے ایک شاخ کاٹی اور پھر جب دوسری شاخ کاٹی شروع کی جو کہ کافی بڑی تھی آدھا صحن اس سے ڈھکا ہوا تھا جو بھی شاخ کٹی تو شاخ کے نیچے گرتے ہی آصف کے سفید کالن کے سوٹ پر خون کے قطرے نظر آنے لگے۔ میری خوف کے مارے چیخ نکلی گئی۔ آصف نے گھبرا کر میری طرف دیکھا تو میں مقررہ کاپ رہی تھی انہوں نے آری اور وہی جھٹکی اور میرے پاس آئے۔  
”کیا ہے۔۔۔۔۔“  
میرے منہ سے آواز نہیں نکلی رہی تھی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔  
”ارے کیا ہوا کچھ تو بتاؤ۔“ میں نے مشکل سے آواز نکالی وہ خو۔۔۔۔۔ خو۔۔۔۔۔ خو۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آپ کے کپڑوں پر۔“ انہوں نے جب اپنے کپڑے دیکھے تو جگہ جگہ خون کے چھینٹے پڑے ہوئے نظر آئے۔  
وہ بولے۔ ”یہ خون کدھر سے آگیا۔“ وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دینے لگے۔ اتنے میں چکن سے کچھ چیز گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آصف چکن کی طرف بڑھنے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ گئی چکن میں جا کر دیکھا تو کانٹ کا جگ ٹوٹ کر کچی کچی ہو چکا تھا اسے دیکھ کر تو میں نے رونا شروع کر دیا کیوں کہ پانی والا جگ نیچے فرش پر گیس کے سلنڈر کے ساتھ ہی میں نے رکھا تھا تو پھر یہ کیسے ٹوٹ گیا جب کہ آواز تو ایسے آئی جیسے کوئی اور سب چیز نیچے گر کر ٹوٹی ہے میں نے روتے ہوئے آصف کو جگ کے بارے میں بتایا تو آصف بھی پریشان ہو گئے۔  
”یارتو ٹھیک لگتی ہو جگ تو ہم کھانا کھا کے گئے تو یہاں ہی گیس سلنڈر کے پاس رکھا ہوا تھا پھر یہ ٹوٹا کیسے اور یہ خون کیسا ہے، یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔“ ابھی ہم اسی بارے میں سوچ رہے تھے کہ میرے پیٹے اسفند کی زوردار چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں بھاگ کے باہر گئے تو اس کی گردن چار پانی سے نیچے لٹکی ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو اٹھایا آوازیں دینے لگی۔  
”اسفند بیٹا آکھیں کھولو۔“ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”آصف یہ دیکھو میرے اسفند کو کیا ہو گیا ہے۔ آصف اس سے بولوناں آکھیں کھولے۔“ میں مسلسل روتے جا رہی تھی آصف نے مجھے تسلی دی۔  
”ہمارے بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ چلو ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے چلتے ہیں۔“ جلدی سے اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد اسے کچھ انجکشن لگائے اور پھر بولا۔

”یہ ساتھ والی مسجد میں قاری صادق صاحب ہوں گے ان سے دم کراؤ میرے خیال میں بچہ ڈر گیا ہے۔“ ہم دونوں جلدی سے باہر نکلے اسفند کو آصف نے اٹھایا ہوا تھا، میں نے صحن کو، ابھی ہم مسجد کے باہر پہنچے تو فاروق کی کال آگئی۔  
”یارتو آصف کدھر ہو تم تمہارے گھر کا تو گیٹ بھی کھلا تھا اور دروازے بھی کھلے تھے کدھر گئے ہو آپ لوگ، کم از کم دروازے تو بند کر کے جاتے۔“  
آصف نے کہا۔ ”یارتو اسفند کی طبیعت خراب ہے، اسے لے کر آئے ہیں۔“

آکس کریم کھالو۔  
میں بھی سر جھٹک کر ان کے ساتھ اندر آگئی۔ ہم نے آکس کریم کھائی اور بچوں کو لے کر باہر صحن میں آگئے کیونکہ شام ہو رہی تھی۔ باہر شادی ہوا چل رہی تھی، ہم نے درخت کے نیچے چار پانی بچھا دی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ آصف کی نظر فرش پر پڑی تو وہ بولے۔  
”یارتو ویسے ٹھیک لگتی ہو بہت پتے گرتے ہیں۔ اچھا میں ایسا کرتا ہوں یہ جو شاخیں آگے کی طرف ہیں یہ زیادہ پھرا کرتی ہیں ان کو کاٹ دیتا ہوں۔“  
میں نے کہا۔ ”ہاں یہ آپ نے ٹھیک کہا کاٹ دیں ان کو پھرتا کچرا بھی نہیں ہوگا۔“  
انہوں نے کہا۔ ”تم یہ چار پانی ایک سائیڈ پر کرو میں اپنے دوست فاروق کے گھر سے آری لے آتا ہوں پھر کانوں گا۔“  
میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے آپ آری لے آئیں۔“  
فاروق کا گھر بالکل ساتھ تھا وہ جلدی واپس آگئے۔ پھر انہوں نے ایک شاخ کاٹی اور پھر جب دوسری شاخ کاٹی شروع کی جو کہ کافی بڑی تھی آدھا صحن اس سے ڈھکا ہوا تھا جو بھی شاخ کٹی تو شاخ کے نیچے گرتے ہی آصف کے سفید کالن کے سوٹ پر خون کے قطرے نظر آنے لگے۔ میری خوف کے مارے چیخ نکلی گئی۔ آصف نے گھبرا کر میری طرف دیکھا تو میں مقررہ کاپ رہی تھی انہوں نے آری اور وہی جھٹکی اور میرے پاس آئے۔  
”کیا ہے۔۔۔۔۔“  
میرے منہ سے آواز نہیں نکلی رہی تھی میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔  
”ارے کیا ہوا کچھ تو بتاؤ۔“ میں نے مشکل سے آواز نکالی وہ خو۔۔۔۔۔ خو۔۔۔۔۔ خو۔۔۔۔۔ خون۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ آپ کے کپڑوں پر۔“ انہوں نے جب اپنے کپڑے دیکھے تو جگہ جگہ خون کے چھینٹے پڑے ہوئے نظر آئے۔  
وہ بولے۔ ”یہ خون کدھر سے آگیا۔“ وہ بھی کچھ پریشان دکھائی دینے لگے۔ اتنے میں چکن سے کچھ چیز گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔ آصف چکن کی طرف بڑھنے لگے تو میں بھی ان کے ساتھ گئی چکن میں جا کر دیکھا تو کانٹ کا جگ ٹوٹ کر کچی کچی ہو چکا تھا اسے دیکھ کر تو میں نے رونا شروع کر دیا کیوں کہ پانی والا جگ نیچے فرش پر گیس کے سلنڈر کے ساتھ ہی میں نے رکھا تھا تو پھر یہ کیسے ٹوٹ گیا جب کہ آواز تو ایسے آئی جیسے کوئی اور سب چیز نیچے گر کر ٹوٹی ہے میں نے روتے ہوئے آصف کو جگ کے بارے میں بتایا تو آصف بھی پریشان ہو گئے۔  
”یارتو ٹھیک لگتی ہو جگ تو ہم کھانا کھا کے گئے تو یہاں ہی گیس سلنڈر کے پاس رکھا ہوا تھا پھر یہ ٹوٹا کیسے اور یہ خون کیسا ہے، یا خدایا یہ کیا ماجرا ہے۔“ ابھی ہم اسی بارے میں سوچ رہے تھے کہ میرے پیٹے اسفند کی زوردار چیخ سنائی دی۔ ہم دونوں بھاگ کے باہر گئے تو اس کی گردن چار پانی سے نیچے لٹکی ہوئی تھی اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کو اٹھایا آوازیں دینے لگی۔  
”اسفند بیٹا آکھیں کھولو۔“ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کیا ہوا اسفند کورات کو میں آپ کے گھر گیا تو وہ بالکل ٹھیک تھا کہ تھا پھر اچانک کیا ہو گیا ہے۔“  
پھر آصف نے جلدی جلدی ساری تفصیل اسے بتائی تو اس نے کہا۔

”اس وقت کہاں ہو میں ابھی آتا ہوں۔“  
”پا زار والی مسجد کے باہر کھڑا ہوں۔۔۔۔۔“ آصف نے کہا۔ اور فون بند کر دیا۔

ہم مسجد میں گئے تو قاری صاحب نے اسفند کو دیکھا اور دم کرنے لگے اتنے میں فاروق بھی ہمارے پاس آ گیا۔ اسے دیکھ کر میں پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے مجھے تسلی دی اور پھر قاری صاحب سے پوچھنے لگا۔  
تو قاری صاحب نے کہا۔ ”میں نے دم کر دیا ہے یہ ہوش میں آ جائے گا اور پانی دم کر کے دے دیتا ہوں اسے وقفے وقفے سے پلاتے رہنا۔“

اور پھر بولے۔ ”اگر آپ جس گھر میں رہتے ہو وہ چھوڑ دو تو اچھا ہوگا۔ آپ کا بچہ بری طرح سے ڈر گیا ہے خدا کا شکر ادا کرو کہ اس کی جان بچ گئی۔“  
ہم واپس گھر آئے تو آصف نے کہا۔

”فاروق تمہاری بھالی نے بھی مجھے بتایا تھا کہ کچن سے کچھ آوازیں آتی ہیں مگر میں نے سوچا شاید اس کا وہم ہے مگر اب پتہ چل گیا ہے یہ سچ کتنی تھی اس لئے ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ اب میں اس گھر میں اپنے بیوی بچوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس لئے فاروق تم کوئی اور گھر دیکھو جلد از جلد۔ میں جب تک یہ گھر چھوڑ نہیں دیتا میں ان کے پاس گھر میں رہوں گا میں ان کا کیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

”ٹھیک ہے آصف میں دو دن کے اندر کوئی اور گھر دیکھ لوں گا۔“ فاروق نے ہامی بھری اتنے میں اسفند کو ہوش آ گیا لیکن اس کی آنکھیں ایسی تھیں کہ لال سرخ جیسے خون ہو، میں نے گھبرا کر آصف سے کہا اس کی آنکھوں کو کیا ہوا زرد دیکھو آصف نے اشارہ کر کے مجھے چپ کر دیا میں نے آصف سے لے کر اسفند کو اپنی گود میں لٹایا اور اس سے پوچھنے لگی۔

”میرا بیٹا کیا کھائے گا۔“ مگر وہ کچھ بول نہیں

رہا تھا بس صرف منہ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے جلدی سے اندر فریج سے جوس نکالا تو اس نے پینے سے انکار کر دیا میں بار بار اس کا منہ چوم رہی تھی پھر آصف نے اسے دم کیا ہوا پانی زبردستی دو تین قطرے پلایا تو 10 منٹ کے بعد اس کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی۔ تو اس نے ادھا گلاس جوس پی لیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا میں نے اور آصف نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی حالت تھوڑی بہتر ہوئی تو فاروق نے اسے اٹھایا تو وہ اس کے پاس چلا گیا تو ہم نے تھوڑا سکون محسوس کیا۔ فاروق بھی اس سے بہت پیار کرتا تھا کیونکہ وہ ماشاء اللہ تھا ہی بہت خوب صورت صحت مند موٹی موٹی آنکھیں گول منول چہرہ، وہ ایک سال کا نہیں لگتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی تین چار سال کا بچہ ہو۔ جب کہ میری بیٹی بھی بہت پیاری نازک سی گڑیا تھی مگر وہ اس سے کئی گنا زیادہ خوب صورت تھا۔

میں پیار سے اسے خان شہزادہ کہتی تھی میری جان تھا وہ۔ پھر فاروق نے اسے میری گود میں دیا تو آصف نے کہا چلو فاروق ہم کچن خالی کر دیے ہیں کھانے پینے کا سامان اندر کر کے میں ایک سائیڈ پر رکھ لیں گے اب میں تمہاری بھابی کو کچن میں کھانا نہیں بنانے دوں گا۔ فاروق نے کہا چلو میں تمہاری مدد کرتا ہوں دو دنوں نے سامان اٹھا کر اندر کر کے میں رکھ دیا۔

آصف نے مجھ سے کہا۔ ”بس دو دن کی بات ہے پھر کوئی اور گھر مل جائے گا ہم چلے جائیں گے۔“  
”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”چلو بھابی لاؤ اسفند کو میرے حوالے کر دو اور آپ اچھی سی چائے پلا دو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسفند کو فاروق کے حوالے کیا اور خود اندر کمرے میں جا کر چائے بنانے لگی۔ میں چائے بنا کر کپ میں ڈالنے لگی تو فاروق نے کہا۔ ”بھابی اسفند سو گیا ہے۔“ تو میں نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا وہاں ڈال دو میں چائے لے کر باہر آئی ہم نے چائے پی اور میں کپ دھو کر اندر رکھنے لگی تو اسفند کے منہ سے آواز آرہی تھی۔

جیسے کہ آہستہ آہستہ رو رہا ہو، میں جلدی سے

آگے بڑھی تو دیکھا اسفند چھت کو گھور رہا تھا اور آواز بھی نکال رہا تھا، میں نے اسے آواز دی۔ ”اسفند میرا چاند کیا کر رہا ہے آج اپنی ماما کے پاس۔“ مگر اس نے میری طرف نہیں دیکھا بس چھت کو گھورتا رہا۔ میں نے آصف کو جا کر بتایا تو وہ بھگ کر آئے انہوں نے اسے اٹھایا بس اٹھانے کی دیر تھی کہ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہم نے بہت کوشش کی کہ اسے چپ کروانے کی مگر چپ نہ کر داسکے۔ وہ بار بار چھت کو گھورتا اور زور زور سے روتا۔

فاروق نے جلدی سے دم کیا ہوا پانی اٹھایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور زبردستی پانی اس کے منہ میں ڈالا، پانی ڈالنے کی دیر ہوئی کہ وہ بے ہوش ہو گیا اور بخار سے اس کا جسم ایسے تپ رہا تھا کہ جیسے آگ ہو۔ میں اسے دیکھ کر رونے جا رہی تھی اور اپنے سینے کے لئے دعا مانگ رہی تھی۔

فاروق نے کہا۔ ”آصف ایک پیر ہے جو ایسے کاموں کا ماہر ہے ہم کل اس کے پاس جائیں گے میرے پاس اس کا فون نمبر بھی ہے میں تقریباً دو تین بار اس سے ملاقات کرچکا ہوں مجھے امید ہے اس کے پاس جانے سے اسفند ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں نے کہا فاروق تم اسے کال کرو۔ ہم ابھی اس کے گھر جائیں گے۔“ اس ناٹم رات کے نو بجتے والے تھے۔ فاروق نے کال کی اور ساری بات اس کو بتائی تو اس نے کہا۔ ”صبح 8 بجے سے پہلے تم اسے میرے پاس لے آنا۔ اور اس بچے کو ایک منٹ کے لئے بھی اکیلا مت چھوڑنا۔“

”میں آپ کا کام ضرور کروں گا۔“  
رات کے 12 بجے کا ناٹم تھا جب کچن کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی میں نے مڑ کر آصف کی طرف دیکھا آصف نے کہا یہ تو بچن کے دروازے کی آواز ہے۔ پھر دوبارہ زور سے دروازہ بند ہونے کی آواز آئی ہم کمرے کے دروازے میں جا کر کھڑے ہو گئے اتنے میں درخت کے ساتھ مجھے کوئی سایہ ساد کھائی دیا۔

میں نے آصف سے کہا۔ ”وہ دیکھو درخت کے پاس کیا ہے۔“ آصف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور میں بھی اندر چلنے لگا کہ اب خود بھی اندر آ کر دروازہ بند کر دیا، میں بہت خوف زدہ تھی دل دھڑک رہا تھا ہم بیٹھ گئے تو ہمارے کمرے کے دروازے پر کھٹ کھٹ ہونے لگی جیسے کہ کوئی آرام آرام سے اٹکی سے دستک دے رہا ہو۔

”آصف نے کہا۔“ تم بیٹھو میں دیکھتا ہوں کہ ہے۔“  
میں نے زور سے آصف کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتا شروع کر دیا۔ ”آصف خدا کے لئے نہ جاؤ کوئی چیز ہوگی آپ کو مار دے گی۔“ میں ہلک ہلک کرونے لگی تو آصف بیٹھ گئے چلو اب چپ کرو میں کہیں نہیں جا رہا۔

اچانک دروازہ ہلنا شروع ہو گیا جیسے کہ زلزلہ آ گیا ہو ہم نے کلمہ پڑھنا شروع کیا کہ اچانک اسفند نے چیخ ماری اور زلزلہ شروع ہو گیا وہ مسلسل چھت کو دیکھ دیکھ کر زور زور سے روتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”آصف اس کے دودھ والا فیڈر لیجئے اٹھا دوسرے چار پانی پر رکھا ہے۔ میں اسے دودھ دوں۔“ آصف نے پورا کمرہ چھان مارا مگر فیڈر نہ ملا۔

آخر کار تنگ آ کر میں نے گلاس میں دودھ ڈال کر اسے پلانے کی کوشش کی لیکن اس نے دودھ کا ایک قطرہ نہیں پیا۔ میں بار بار اسے اپنے سینے سے لگاتی اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی مگر سب کچھ بیکار، وہ چھت کی طرف دیکھتے دیکھتے اچانک میری طرف دیکھنے لگا اس کی آنکھوں میں درد تھا جیسے کسی بہت بڑی تکلیف میں مبتلا ہے۔ میری طرف دیکھتے دیکھتے وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ میں نے جھک کر اسے پیار کیا تو کافی دیر تک دیکھتا رہا، میں نے کہا۔ ”اسفند بیٹا اسفند بیٹا بولو ناں کیا ہوا ہے ماما کی جان کو۔“

اتنے میں اس کی ناک سے خون نکلا اور اس نے زور کی سانس لی بس وہ اس کی آخری سانس تھی۔  
میں نے کہا۔ ”آصف یہ دیکھو خون اسفند کی ناک سے نکلا ہے۔“ آصف نے مجھ سے لے کر اسے غور سے دیکھا اور پھر اس کی کھلی ہوئی آنکھیں بند کر دیں۔

میں نے کہا۔ ”کیا کیا کر رہے ہیں۔“  
اور آصف کے منہ سے جو کچھ نکلا وہ میری برداشت سے باہر تھا۔  
”اسفند فوت ہو گیا۔“ پھر تو مجھے ہوش نہ رہا۔  
میری چیخوں سے ساتھ والے ہمسائے بھی دوڑے  
آئے فاروق کے گھر والے بھی آگئے سب مجھے چپ  
کروا رہے تھے سب مجھے دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے مگر میں  
اپنے بیٹے اسفند کو آواز دیں دے رہی تھی۔ مگر اسے کوئی  
پرواہ نہ تھی آج نہ وہ جس مانگ رہا تھا نہ دودھ نہ آکس  
کریم، وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا گہری نیند سو رہا تھا۔  
آصف مجھے گلے لگا کر چپ کروا رہے تھے مگر میں کسی کی  
نہیں سن رہی تھی میں نے چارپائی سے اپنے بیٹے  
کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھا میں بار بار اس کے جسم کو چھو کر  
دیکھتی کیا پتہ میرا بیٹا بے ہوش ہو۔

محلے کی ایک عورت نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔  
”بیٹی حوصلہ رکھو خدا کی چیز تھی اس نے لے لی۔ اپنی بیٹی کو  
دیکھو وہ تمہیں دیکھ دیکھ کر رو رہی ہے۔“ میں نے دیکھا  
شمن میرے پاس کھڑی رو رہی تھی اور اما کہہ رہی تھی میں  
نے اسے گود میں اٹھایا بس اس کے بعد مجھے اپنا ہوش نہیں  
رہا۔ جب مجھے ہوش آیا تو اسفند کے جانے کی تیاری  
ہو چکی تھی اسے غسل دے دیا گیا تھا میرے سر والے  
اور راولپنڈی سے میرے امی ابو سب آگئے تھے۔ بس  
نہیں رہا تو صرف میرا بیٹا میرا شہزادہ۔“

غسل کے بعد پتہ چلا کہ اسفند کی گردن پر نشان  
تھے جیسے کسی نے اس کا گلا دبا دیا ہو۔ اور آنکھوں کے  
آگے کالے سیاہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے  
بعد سب اسے منوں مٹی تلے کیلا چھوڑ کر واپس آگئے۔  
میرے امی ابو اور سرال والوں نے بہت اصرار کیا کہ  
چلو ہمارے ساتھ گھر میں اپنے بیٹے کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی  
تھی 5 دن کے بعد سب واپس چلے گئے۔

آصف میرا بچوں کی طرح خیال رکھتے۔ آصف  
نے بھی مجھے کہا چلو راولپنڈی چلے جاتے ہیں مگر میں نے  
انکار کر دیا کیوں کہ وہاں گھر کے ساتھ ہی میرے اسفند

کی قبر تھی میں اس سے دور نہیں جانا چاہتی تھی۔  
میرے بیٹے کو فوت ہوئے ابھی 10 دن ہوئے  
تھے کہ میں داش روم سے باہر دو قدم آگے چلی کہ مجھے  
ایسا لگا جیسے میرے پیچھے کوئی کھڑا ہے میں نے ڈر کر پیچھے  
دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ میں آگے چل پڑی ابھی میں  
نے کمرے کے دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ میرے  
کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میرے منہ سے خوف  
ناک چیخ نکلی اور میں دروازے میں ہی گر کر بے ہوش  
ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو مجھے بہت تیز بخار تھا لیکن  
میرے سامنے ایک بزرگ نورانی چہرہ لئے بیٹھے تھے  
انہوں نے پوچھا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے بیٹی۔“  
میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہوں بابا جی۔“

پھر فاروق نے تعارف کرایا کہ یہ میر صاحب  
ہیں حسین احمد پھر مجھے علم ہو گیا یہ وہی پیر ہیں جن  
کو فاروق جانتا ہے انہوں نے پورے گھر کا جائزہ لیا  
اور پھر تین توہیر بنائے ایک میرے لئے ایک میری بیٹی  
شمن کے لئے ایک میرے شوہر آصف کے لئے۔ توہیر  
دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”کسی بھی حال میں توہیر  
گلے سے نہ نکالنا انشاء اللہ سب بہتر ہوگا۔“ اور میری  
طرف دیکھ کر بولے۔ ”توہیر پاس رکھو گی اس کے  
بعد تمہیں ڈر بھی نہیں لگے گا۔“

وہ چلے گئے ہم نے توہیر گلے میں ڈال لئے۔ نہ  
کوئی واقعہ ہوا نہ آواز آئی اور ناں مجھے ڈر لگا تقریباً ایک  
ماہ کے بعد ہم نے قرآن پاک کا قسَم کر دیا کافی مہمان  
تھے ہمارے اپنے بھی آئے ہوئے تھے۔

ایک دن رہ کر جب سب واپس گئے تو میں گیٹ  
کے باہر کھڑی ان کو جاتا دیکھ رہی تھی جب وہ آنکھوں  
سے اوٹھلے ہوئے تو میں اور آصف واپس گیٹ سے اندر  
آنے والے تھے کہ شمن کی چیخ کی آواز آئی۔ ہم پریشان  
ہو گئے شمن ہمارے ساتھ باہر کھڑی تھی پھر اندر کب آئی  
ہم بھاگ کر اندر آئے تو شمن درخت کے نیچے بے ہوش  
پڑی تھی پھر تو مجھے ہوش نہ رہا میں نے پاگلوں کی طرح  
رونا شروع کر دیا ایک بیٹا چھوڑ کر چلا گیا تھا اور اب بیٹی بھی

ہاتھوں سے نکل رہی تھی آصف نے اسے اٹھایا  
اندر کمرے میں لے گئے۔ پھر فاروق کو کال کی تو اس  
نے پیر صاحب کو بلایا آدھے گھنٹے کے بعد پیر صاحب  
آگئے انہوں نے شمن کی حالت دیکھی تو پریشان ہو گئے،  
میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”پیر صاحب میری  
بیٹی کو بچا لیں خدا کے لئے۔“ میں رو رو کر ان کی منت  
کر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا۔ ”کچھ نہیں ہوگا  
اب میں آگیا ہوں تمہاری بیٹی کو کچھ نہیں ہونے دوں  
گا۔“ پھر انہوں نے شمن کے گلے میں دیکھا تو تعویذ نہیں  
تھا۔ یعنی توہیر غائب تھا انہوں نے باہر درخت کے نیچے  
چارپائی پر بیٹھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔

آصف شمن کو لے کر ان کے پاس بیٹھ گئے۔  
دو گھنٹے تک وہ پڑھتے رہے اچانک شمن نے آنکھیں  
کھول دیں۔ تو پیر صاحب نے پوچھا۔ ”کیا چاہتی  
ہے تو۔“

شمن نے بولنا شروع کر دیا شمن کے اندر سے کسی  
اور عورت کی آواز آرہی تھی۔ ”میں سب کو مار دوں گی  
ان کو میں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

پیر صاحب نے پوچھا۔ ”کیوں ایسا کر رہی ہے۔“  
اس نے کہا۔ ”اس بچن اور اس درخت پر ہمارا  
بیرا ہے۔“ پھر بولی۔ ”اس نے درخت کا ٹاٹا اور ساتھ  
میرے بیٹے کی ٹانگ کاٹ دی میری دو بیٹیاں تھیں اور  
صرف ایک بیٹا تھا اس لئے میں نے ان کے بیٹے  
کو مار دیا۔ اب بیٹی کو بھی مار دوں گی پھر ان دونوں کو بھی  
زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

پیر صاحب نے کہا۔ ”تمہارا بیٹا کدھر تھا جب  
اس کی ٹانگ کٹی تو۔“

وہ بولی۔ ”درخت کے اوپر بیٹھا تھا۔“  
”تمہارے بیٹے کی کتنی عمر ہے۔“

7 سال ہے۔ ”اب وہ چل نہیں سکتا۔“

پیر صاحب نے کہا۔ ”تو نے بیٹے کی ٹانگ کا بدلہ  
ان کے بیٹے کو مار کر لیا ہے اب ایسا کوئی کام نہ کرنا۔“

”کیوں نہ کروں گی۔“ پیر صاحب جو بات

کرتے وہ انکار کر دیتی۔

اس کی باتیں سن کر خوف کے مارے میرا ہر حال  
تھا میرا حلق خشک ہو چکا تھا میں مسلسل کانپ رہی تھی۔

پیر صاحب جب تھک گئے تو انہوں نے کچھ  
پڑھنا شروع کر دیا پھر جب پچوٹ ماری تو وہ چیختے لگی۔  
”مجھے چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔“

پیر صاحب نے کہا۔ ”اب تمہیں کبھی نہیں  
چھوڑوں گا۔“ وہ پیر صاحب کو خدا کا واسطہ دینے لگی۔  
”میں آج کے بعد کچھ نہیں کروں گی۔“

پیر صاحب نے اسے اس کے بچوں سمیت  
اپنے قبضے میں کر لیا۔

تو شمن کو ہوش آگیا وہ ابھی اور کہنے لگی۔  
”پاپا آکس کریم کھاؤں گی۔“

میں نے اور میرے شوہر نے اس کی پیشانی  
چومی اسے سینے سے لگایا۔

پیر صاحب نے کہا۔ ”اب تم آرام سے  
رہو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔“ مگر میں نے کہا۔ ”اب میں اس  
گھر میں نہیں رہوں گی۔“ پھر ہم وہ گھر چھوڑ کر راولپنڈی  
آگئے کراہیہ کے مکان میں رہے پھر ایک سال کے بعد ہم  
نے اپنی جگہ لے لی اور اپنا ایک چھوٹا سا پیارا سا گھر بنالیا  
پھر مجھے خدا نے ایک اور بیٹی عطا کی۔ جس کا نام ہم نے  
ایمان رکھا، پتہ ہے میری بیٹی کیسی ہے بالکل میرے بیٹے  
اسفند کی طرح وہی خوب صورت چہرہ، وہی آنکھیں، اسی  
طرح صحت مند اب بھی مجھے اپنے خان شہزادے کی یاد  
آتی ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ پھر میں اپنی  
دونوں بیٹیوں کو سینے سے لگا لیتی ہوں۔

اور آپ کو پتہ ہے وہ پیارا سا بچہ کس کا تھا۔ وہ  
آپ کی اپنی بہن شازنہ کا بیٹا تھا۔ ”اس لئے میری  
دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کے بچوں کو سلامت رکھے۔  
آپ سے گزارش ہے کہ میری شمن اور ایمان کے لئے بھی  
دعا کریں اللہ ان کو سلامت رکھے۔“ آمین حمد آمین۔





# بلیک آئی لینڈ

شہزاد خان - صادق آباد

غیریت کا خوف سے چہرہ لبریز تھا، وہ گوشت کھانے میں اس قدر مصروف تھی کہ آسمان پر نمٹانے والے ستارے بھی حیرت و استعجاب سے اسے دیکھ رہے تھے کہ اچانک.....

جسم دجاں پر پگھلی طاری کرتی اور گوں میں خون نچھرتی خوفناک اور ہولناک کہانی

**مئی 1985ء** کی ایک چمکدار صبح ہم لوگوں نے اپنا سفر شروع کیا تو ہم سب کے چہرے انجالی خوشی اور ایک بھرپور امید بھرے سفر سے لطف اندوز ہونے کے لئے تیار تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے عزیز واقارب اور بیوی بچوں سے ایک لمبے عرصے تک دور رہنے کا غم بھی ستارہا تھا۔ ہم سب جن میں میرے علاوہ میرے تین دوست اور ان کے ساتھ ساتھ چھ مزدور جنہیں ہم لوگوں نے ہار برداری اور دوسرے کام کاج کے سلسلہ میں کچھ رقم دے کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کیا تھا۔ ہم چاروں دوست اپنے علاقے میں اچھے اور بہترین شکاری سمجھے جاتے تھے۔ ہم نے اپنی زیادہ تر زندگی خوفناک جنگلوں میں خونخوار درندوں کا شکار کھیلتے گزاری تھی۔ شکار کے دوران کئی بار ہم موت کے منہ سے بچے تھے لیکن اس کے باوجود جان جو کھوں کا کام کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے تھے۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں کسی دور دراز جزیرے پر جاکر شکار کھیلنے کا پروگرام بن گیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک بڑی لالچ کے مالک کو بھاری رقم ادا کر کے ساتھ چلنے پر آمادہ کیا اور کچھ مگھڑے اور تجربہ کار مزدور بھی اس لالچ کے مالک کی مدد سے گئے۔

اور اس کے نتیجے میں اس روز ہم سب ایک بڑی سی

لالچ میں سوار ہو کر سمندر میں اپنے ان دیکھے سفر کا آغاز کر چکے تھے۔ تاجز نگاہ سمندر کا نیلگوں پانی سفید سفید جھاگ اڑاتا شیشے کی سلائیڈ کی مانند چمک رہا تھا اور اس میں سے مچھلیاں پکڑتے سفید سفید آبی پرندے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ لالچ میرے ایک دوست تیور علی کے ہاتھوں میں پانی پر اچھلتی تیزی سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ ہم سب نے بھی لالچ چلانے کی ٹریننگ لے لی تھی کہ نجانے کیسے حالات سے سامنا کرنا پڑے یہ سوچ کر سب نے اچھی طرح اور ذمہ داری سے تربیت حاصل کر لی تھی تاکہ کسی ممکنہ حادثہ سے فوری طور پر بچا جاسکے اس کے ساتھ ساتھ ہم نے مزدوروں کو بھی تھوڑی بہت ٹریننگ دے دی تھی تاکہ وہ بھی اپنا شوق پورا کرتے رہیں۔

ہم سب خوش گپیوں میں مصروف تھے، ہم نے گھر سے چلتے وقت اپنے سامان میں نقشہ، رسیوں کے بٹول، گرم چادریں، چھریاں، چاقو، مٹی کے تیل کے کنسترو، ماچسوں کے پیکٹ، کافی کی بوتلیں، نمک، مرچ غرض ضرورت کی ہر چیز رکھ لی تھی جس کی ہمیں کسی بھی وقت ضرورت پڑ سکتی تھی۔ کار تو سوں کی بڑی بڑی پٹیلیاں، راکٹلیں اور ماڈرن وغیرہ اپنی ضرورت سے بھی زیادہ لالچ میں رکھ لئے تھے اس لئے ہم سب بے فکری سے سفر سے لطف

سچچہا حسن

اندوز ہو رہے تھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم کسی پلنگ پوائنٹ پر تقریر کی غرض سے جا رہے ہوں۔

نقشے کے مطابق ہم سب کی منزل سمندر میں موجود دور دراز کا ایک جزیرہ ”بلیک آئی لینڈ“ تھا۔ جس کے بارے میں ایک عام روایت تھی کہ یہ جزیرہ دنیا کے خوفناک ترین جزیروں میں سے ایک ہے۔ اس کے اندر آج تک کوئی شکاری یا سیاح نہیں جا سکا اور نہ ہی وہاں سے کسی قسم کی معلومات کوئی لاسکا۔ اس لئے یہ جزیرہ ابھی تک دنیا والوں کے لئے ایک سر بستہ راز ہی تھا ان لوگوں نے اسے اپنے لئے ایک چیلنج سمجھتے ہوئے انتخاب کیا تھا۔

شروع شروع میں جو بھی اس کا نام سنتا اسے کانوں کو ہاتھ لگانے لگتا۔ ان چھ مزدوروں میں سے بھی چار مزدوروں نے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر جب میں نے انہیں حوصلہ دیا اور کافی ساری رقم کی جھلک دکھائی تو وہ ساتھ چلنے پر آمادہ ہوئی گئیں۔ ہم نے ان مزدوروں کو کچھ مقول رقم پہلے ہی دے دی تھی تاکہ وہ اپنے گھر والوں کو خرچہ وغیرہ دے سکیں تاکہ انہیں بعد میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور اس سارے مرحلے کو بخوبی طے کرنے کے بعد ہم اپنے سفر کا آغاز کر چکے تھے اور بلیک آئی لینڈ کی جانب رہاں دوں تھے۔ اس دوران ہم سب نے باری باری لا لائچ کو چلایا تھا تاکہ دوسرے افراد بھی تھوڑا آرام کر سکیں اور تازہ دم رہیں۔ ایسا کرنے سے ہم سب کے چہروں پر بشارت تھی اور ہم آنے والے وقت سے بے خبر خوش کہیوں میں مصروف تھے۔

شام کا بھٹ پڑا ہوا سو پھیلنے لگا تھا آبی برندے قطاریں باندھے واپس اپنے گھر و کلوٹ دے تھے آسمان پر کہیں کہیں آثار ہواڈا اٹھ لیاں کرتے پھر رہے تھے۔ سمندر کا پانی خاموش ہو گیا تھا اور ننھے ننھے ستارے آسمان پر ٹھٹھانے لگے تھے جن کے بھر مٹ میں چاند بھی کبھی کبھی اپنا روشن چہرہ نکال کر لا لائچ کے مسافروں کی طرف جھانک لیتا تھا۔ ہم سب نے ہلکا ہلکا کھانا کھا کر اپنے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھام رکھے تھے آگ جلانے کے لئے ہم نے ٹیکس سے چلنے والے چولہے کا بندوبست سب سے پہلے کیا تھا

تیسرے صاحب کیا خیال ہے ہم کب تک اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے؟ افضل احمد نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ اگر ہم بغیر کسی ای وقتار سے آگے بڑھتے رہے تو میرے خیال میں برسوں دوپہر تک ہم ”بلیک آئی لینڈ“ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ تیسرے علی نے لا لائچ کا اسٹیرنگ گھما تے ہوئے جواب دیا۔

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ لوگوں نے خوفناکہ کیوں اس جزیرے کو منحوس اور آسیب زدہ مشہور کر رکھا ہے“ میرے ایک دوست شان نے کندرے اچکاتے ہوئے فقرہ دیا۔ ”انگور کھٹے ہیں دوستو! جو لوگ کسی کام کو سر انجام نہیں دے سکتے وہ ایسی ہی بے سرد پابائیں کر کے خود کو ہموکھا دیتے ہیں۔“ تیسرے علی نے جواب کیا۔

”باقی اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اس کا تو وہاں چل کر ہی پتہ چلے گا اس لئے جب تک ہم وہاں پہنچ نہیں جاتے اس قسم کی قیاس آرائیاں کرنا فضول ہے۔“ میں نے بھی دغل در معقولیات دیتے ہوئے کہا۔ اسی قسم کی ہنسی اور ہلکا ہلکا مذاق کرتے ہوئے ہم سمندر میں آگے کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔

ہمارے پاس فیول کا اسٹاک تھا اس لئے اس کی طرف سے تو ہم بالکل بے فکر تھے باقی خوراک کی طرف سے بھی ہم نے ہاتھ کھلا رکھا تھا اور ضرورت سے زیادہ ہی خوراک اسٹور کی تھی کہ نجانے کتنے روز ہمیں جزیرے پر رہنا پڑے اور کن حالات کا سامنا کرنا پڑے۔

رات کے وقت سمندر کے پانی پر چاند کی سفید چاندنی بہت بھلی لگ رہی تھی رات دھیرے دھیرے اپنا سفر جاری رکھے اجالے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تیسرے علی نے لا لائچ کا اسٹیرنگ ایک مزدور کو تھا کر کچھ ہدایات دیں اور خود ایک طرف بے تکین کی جانب بڑھ گیا۔ ہم دیگر دوست پہلے ہی تکین میں بیچے ہوئے موٹے موٹے گدوں کے بستر وں پر براجمان تھے اور آنے والے حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ تیسرے علی بھی ایک خالی بستر دیکھ کر ان پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر وہ بھی ہمارے ساتھ ہماری باتوں میں شامل ہو گیا اور باتیں کرتے کرتے ہم نیند کی آغوش میں کھو گئے۔

صبح جب ہماری آنکھ کھلی تو سورج کافی نکل چکا تھا اور لا لائچ سمندر کے پر شور پانی پر اچھلتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہم نے نقشے اور کمپاس کے حساب سے دیکھا تو ہم اپنی منزل سے ایک دن کی دوری پر تھے۔ ہم نے باری باری ناشتہ کیا اور مزدوروں سے رات کے سفر کے متعلق بات چیت کرنے لگے انہوں نے بتایا کہ وہ ساری رات باری باری لا لائچ کو چلاتے رہے تھے اور اس دوران کوئی غیر معمولی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میں نے ایک مزدور کے ہاتھوں سے اسٹیرنگ پکڑا اور اسے ناشتہ کرنے کا کہہ کر لا لائچ کی رفتار بڑھا دی۔

لا لائچ ایک جھٹکا لیتے ہوئے پانی کی لہروں پر اچھلی اور ہندو کی گولی کی مانند اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ابھی ہمیں سفر کرتے آدھا گھنٹہ ہی گزر رہا تھا کہ پانی کی لہروں میں کچھ کچھ حرکت ہونے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے لہروں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ لا لائچ پانی پر ڈولنے لگی اور اس کا اسٹیرنگ میرے ہاتھوں سے نکلنے لگا جسے میں نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا مگر اس کے باوجود میرے ہاتھ اسے سنبھالنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ لہروں کے پر زور شور میں کان بڑی آواز سنائی دے رہی تھی ہم سب نے چیخنے ہوئے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا اور پھر تیسرے علی کی ہدایات پر مزدوروں نے لا لائچ پر سے وزن کم کرنے کے لئے اپنا فالتو سامان اٹھا اٹھا کر سمندر کے پانی میں پھینکنا شروع کر دیا کہ شاید وزن ہلکا ہونے سے لا لائچ کے اٹنے کا خطرہ کم ہو سکے مگر موجوں نے اسے مزید اور جھٹک دینے شروع کر دیے۔

میں نے چیخنے ہوئے افضل احمد کو آواز دی کیونکہ مجھ سے اب لا لائچ کا اسٹیرنگ کنٹرول کرنا مشکل ہو گیا تھا اور میرے ہاتھ شل ہو چکے تھے۔ افضل احمد نے آہستہ آہستہ میرے قریب آن کر مجھ سے اسٹیرنگ لے لیا اور لا لائچ اسی رفتار سے آگے بڑھتی جا رہی تھی مگر اس کے چلنے کے انداز میں فرق آ گیا تھا پہلے وہ پرسکون انداز میں آگے بڑھ رہی تھی مگر اب وہ مینڈک کی طرح اچھلتی کودتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمیں اس انداز میں سفر کرتے مسلسل دو گھنٹے ہو گئے تھے مگر ان دو گھنٹوں کو ہم نے کس لذت سے گزرا تھا یہ ہم یا

ہمارا خدا ہی جانتا تھا۔

لا لائچ کے مسلسل جھٹکوں نے ہم سب کے جسموں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور ہمارا انگ انگ درد سے تڑپ رہا تھا۔ اور پھر کچھ ہی دیر میں میں مجس کم ہونا شروع ہو گئیں اور پھر یکدم سمندر کا پانی یوں ساکت اور پرسکون ہو گیا جیسے کسی امی میں طغیانی آئی ہی نہ ہو۔ سمندر کے پرسکون ہوتے ہی ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سورج اب ہمارے سین سروں پر آ گیا تھا اور ہمیں اب بھوک نے بھی ستانا شروع کر دیا تھا ہم نے مزدوروں سے کہہ کر کھانا تیار کروایا اور پھر میر ہو کر کھایا۔ موجوں سے لڑنے کی وجہ سے ہمیں بھوک بھی بہت لگی تھی اس لئے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ کھانا کھا کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔

صبح سویرے ہم اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے اس لئے ہم وہاں تازہ دم ہو کر جانا چاہتے تھے جزیرے کے متعلق سننے والی عجیب و غریب باتیں اور قصے ہمارے ذہنوں میں گونج رہے تھے اور ہمارے دلوں کی جھڑکیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ لا لائچ اپنی پوری رفتار سے سمندر کے پانی پر اچھلتی بھاگی چلی جا رہی تھی کہ چانک یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی بھنور میں پھنس گئی ہو اور پھر تیزی سے گھومنے لگی۔ لا لائچ میں موجود دوسرے افراد پریشانی کی کیفیت میں کھڑے سمندر کے پانی کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ”کیا ہوا یہ لا لائچ کو چکر کیوں آرہے ہیں؟“ شان نے قریب آ کر پوچھا۔

”میرے خیال میں ہم شارک مچھلیوں کے علاقے میں پہنچ گئے ہیں کیونکہ آپ لوگوں سے ملنے سے پہلے میں ایک بحری جہاز میں ملازمت کرتا تھا اور اکثر و بیشتر میں ان حالات سے واسطہ پڑتا رہتا تھا اس لئے لا لائچ کو جس طرح کے جھٹکے لگ رہے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں شارک مچھلیوں کی بہتات ہے اس میں زیادہ گھبرانے والی بات نہیں ہے کیونکہ جب تک شارک مچھلیوں کو تنگ نہ کیا جائے اس وقت تک یہ کچھ نہیں کہتی ہیں۔ ہاں اگر ان پر حملہ کرنے میں ہم باہل کریں گے تو اس کے نتیجے میں اگر ان میں سے کوئی زخمی ہو جائے تو پھر ہمیں ان کا لقمہ بننے

سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ان سے بچاؤ کا کوئی طریقہ ہے کہ خاموشی سے اپنا سفر جاری رکھا جائے اور کسی نہ کسی طریقے سے لالچ کو اس علاقے سے فوراً دور لے جایا جائے۔ ایک مزدور نے تمام تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات سنتے ہی تیرو علی نے لالچ کو کنٹرول کرتے ہوئے منصور سے نکالا اور اس کی رفتار تیز کر دی۔

لالچ نے ایک جھک لایا اور مینڈک کی مانند اچھلتی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں ہم اس علاقے سے بہت دور نکل آئے۔ مسلسل چار پانچ گھنٹوں تک سفر کرنے کے بعد ہمیں دور بہت دور ایک سیاہ لکیری نظر آئی، ہم سمجھ گئے کہ یہی سیاہ لکیر ہی ”بلیک آئی لینڈ“ ہے یہ دیکھ کر ہم سب نے ضروری سامان ایک ترتیب سے ایک جانب رکھنا شروع کر دیا، ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ صرف وہی سامان جزیرے پر لے جایا جائے جس کی ہمیں اشد ضرورت پڑے گی فالٹو سامان لیجانے سے غراؤ اواسے سنبھالنا پڑتا۔

جوں جوں ہم اس لکیر کی جانب بڑھتے جا رہے تھے توں توں اس سیاہ لکیر کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس سیاہ لکیر نے ایک وسیع جزیرے کی شکل اختیار کر لی۔ جزیرے کی سر زمین پر درختوں کی قطاریں دور سے ہی دکھائی دینے لگی تھیں۔ دور سے وہ ایک گھٹا اور گھٹا نظر آ رہا تھا۔ کچھ ہی دیر میں لالچ نے جزیرے کی سر زمین کو چھوا اور جھک کھاتے ہوئے رک گئی۔ تیرو علی نے جزیرے کے نزدیک پہنچتے ہی اس کی رفتار کم کر دی تھی اس لئے وہ پانی پر تیرتی ہوئی جزیرے کی زمین سے ٹکرا کر رک گئی۔ بعد میں اس نے لالچ کا اچھٹا بند کر کے چابی میری جانب اچھٹا دی جسے میں نے جلدی سے اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بے خیالی میں اپنی چٹانوں کی سائیز والی جیب میں ڈال لیا۔ ہم نے پہلے تمام مزدوروں کو نیچے اتارا اور پھر سامان اٹھا کر انہیں پکڑانے لگے جسے وہ زمین پر ایک طرف رکھنے لگے۔

سارا ضروری سامان اتار کر ہم بھی لالچ سے نیچے آ گئے اور بڑے فور سے جزیرے کو دیکھنے لگے۔ جزیرے پر ایک پراسراری خاموشی طاری تھی لیکن لالچ تھا جیسے صدیوں سے کوئی انسان اس طرف نہ آیا ہو۔ حتیٰ کہ کہیں سے کسی چرند

پرند یا کسی درندے کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی شاید ایسا شام کا جھپٹا چھا جانے کی وجہ سے محسوس ہو رہا ہو۔ پھر کچھ دیر میں ہم نے آپس میں فیصلہ کر کے رات میں ساحل سمندر پر بسر کرنے کے ارادے سے سامان میں سے مضبوط کپڑے کے خیمے نکالے جنہیں مزدوروں نے بڑی مہارت اور چالاکدستی سے ساحل کی ریت پر کھونٹے گاڑ کر لگا دیا۔ ہم نے اپنے ساتھ سفری بستر بھی لائے تھے وہ بھی انہوں نے جھپٹ پٹ خیموں میں لگا دیے۔ پھر اطمینان سے رات کا کھانا کھایا اور سونے سے پہلے ہم نے احتیاط کے پیش نظر باری باری پھر دینے کی ڈیوٹیاں لگادی تھیں تاکہ کسی ممکنہ خطرے سے فوری طور پر نینا جاسکے۔

ہم چند گھنٹوں کے اندر اترے اس لئے ہم نے دو دروازوں کی ٹولیاں بنالیں اور ہر ٹولی کے ذمے دو گھنٹے جاگ کر پھرہ دینے کی ڈیوٹی لگائی اور اس بات کی سختی سے تاکید کی گئی کہ ہر ٹولی کے افراد انتہائی چالاکدستی اور ذمہ داری سے پھرہ دیں گے۔ اس کے باوجود کہ جزیرے پر ہمیں کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہیں دی تھی لیکن پھر جزیرے ہم نے پھرہ دینے کے کام کو اہم جانتا تھا۔ باری کے مطابق پہلی ٹولی میں دو مزدور ہاتھوں میں راتھیں لے کر خیمے سے ذرا ہٹ کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے تھے اور ہم آرام کرنے کی غرض سے اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

چاند ایک لمحے کے گولے کی مانند آسمان پر چمک رہا تھا ستارے سب سے سببہ انداز میں زمین پر اس جانب دیکھ رہے تھے جس طرف ایک عجیب و غریب مخلوق اپنے بے ذھن جسم کے ساتھ لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب بڑھتی جا رہی تھی اس کے لڑھکنے کے انداز کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ جیسے تیل کا ڈرم زمین پر لڑھکتا جا رہا ہو۔ یہ ”چوملنگما“ تھی اس خوفناک اور کالے جزیرے کی انتہائی خطرناک مخلوق۔ اس کے جسم پر بھورے رنگ کے گھٹے پال تھے جو سرکنڈوں کی مانند لڑھکتے تھے اور اس کے پنجوں کی چھ چھ انگلیاں تھیں جن کے ناخن اپنی لمبائی کی وجہ سے آگے سے کسی قدر مڑ گئے تھے اور اس کا چہرہ کیٹنگر کی شکل جیسا تھا اور ناک چوڑا اور انتہائی بھدا تھا اس کے جھڑوں کا گوشت منہ

کے دونوں اطراف سے باہر کی جانب نکلا ہوا تھا اور اس کے سائیدوں سے لٹکے ہوئے پیلے پیلے دانت اس کی ٹھوڑی تک جمبول رہے تھے۔ اس کے چلنے کا انداز قدرتی طور پر لڑھکنے جیسا تھا اور ایک نظر میں وہ ایک گولے کی مانند ہی دکھائی دیتی تھی وہ تیزی سے لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب جا رہی تھی جیسے کوئی دور بیٹھا اسے ریموٹ کنٹرول سے چلا رہا ہو۔

چاند آسمان پر دھیرے دھیرے اپنے سفر میں مصروف تھا۔ دونوں مزدور ہاتھوں میں پکڑی راتھیں پتھر کے سہارے لگا کر باتوں میں مصروف تھے اور اپنے بھانجک انجام سے بے خبر اس جزیرے کی پراسراریت کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بیوقوفی اور توہم پرستی پر بھی ہنس رہے تھے جنہوں نے اس خوبصورت جزیرے کے متعلق خواہ مخواہ کی بے سرو پا اور جھوٹی باتیں پھیلا رکھی تھیں حالانکہ جب سے وہ لوگ اس جزیرے پر پہنچے تھے ابھی تک انہیں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دی تھی جسے دیکھ کر انہیں ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی باتوں کا یقین نہ ہوتا۔

ساتھ ساتھ وہ اس پہلو پر بھی غور کر رہے تھے کہ شاید بحری قزاقوں نے یہاں کوئی خزانہ دفن کر رکھا ہو اور اسے محفوظ کرنے کے لئے اس قسم کی جھوٹی خبریں پھیلا دی ہوں تاکہ کوئی اس جزیرے پر آکر ان کے خزانے کو حاصل نہ کر سکے۔ جزیرے پر ایک سکون کی سی کیفیت طاری تھی کہیں کہیں سے کسی چمٹکر کے بولنے کی آواز سنائی دیتی تو ہل بھر کے لئے خاموشی کا طلسم ٹوٹا اور پھر وہی معمور خاموشی چھا جاتی۔ ایک مزدور جو سامنے کے رخ بیٹھا جزیرے کے درختوں کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔

اچانک باتیں کرتے کرتے اس کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا اور اس کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹی رہ گئیں اس کی نظریں اس عجیب و غریب شے پر پڑی ہوئی تھیں جو ایک ڈرم کی طرح لڑھکتی ہوئی خیموں کی جانب ہی آرہی تھی پہلے تو وہ اسے ایک خالی ڈرم ہی سمجھا مگر جب آگاہانہ وہ چیز ان کے نزدیک پہنچ کر ایک دم اچھل کر کھڑی ہوئی تو خوف و دہشت سے ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں۔ ان

کے سامنے ایک عجیب الخلق شے تھی جس کی طرف دیکھتے ہی ان دونوں کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

خوف سے انہیں اپنے نزدیک رکھی بندوقیں تک اٹھانے کا خیال نہ آیا۔ انہوں نے بھانٹنے کے لئے قدم آگے بڑھنا چاہے مگر ان کے قدموں نے تو زمین کو یوں تھام لیا تھا جیسے کوئی مٹا نہیں لوہے کو پکڑتا ہے۔ ان کے چپٹے چلانے سے جزیرے کی خاموش فضا میں ان کی آوازیں کی بازگشت ابھی تک گونج رہی تھی اور ان کے کندھے چپٹے سے درختوں پر بیٹھے سنگڑوں پر بندے اپنے پر پھر پھڑاتے ہوئے باہر نکل کر آسمان پر اڑنے لگے اور اس کے ساتھ ہی خیموں میں سوائے ہوئے ہم لوگ بھی گھبرا کر ہار نکل آئے اور ہم نے بڑبڑاتے ہوئے اور اپنی آنکھوں کو مسکتے ہوئے حقیقت جاننا چاہی تو ہماری بھی وہی حالت ہو گئی جو اس سے پہلے دیگر مزدوروں کی ہوئی تھی۔

ابھی ہم اپنے بچاؤ کی کوئی صورت سوچ ہی رہے تھے کہ اس بلا کا داؤ چل گیا اور اس نے اپنے نزدیک کھڑے ایک مزدور کے چہرے پر اپنا بھاری چھڑو مار کر پھینک گئے ہی مزدور جو سکتے ہی حالت میں کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اچھل کر دوڑ جا کر اور یہ دیکھ کر دیگر افراد کی چیخیں نکل گئیں کہ پتھر کھانے والے مزدور کا دھڑا اور سر علیحدہ علیحدہ جا کرے تھے یہ دیکھ کر سب نے اس عجیب و غریب بلا کی طاقت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

ہم نے دوڑ کر خیموں سے اپنی بندوقیں نکالیں اور ان کا رخ اس بلا کی جانب موڑ کر گولیاں برسانا شروع کر دیں مگر اس سے پہلے کہ گولیاں اس بلا کے جسم کو چھوئیں اس بلا نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور زمین پر گرے ہی اس کا جسم تیزی سے ایک کمینڈی شکل میں تبدیل ہو گیا اور وہ توپ کے گولے کی مانند زمین پر لڑھکتی ہوئی ہماری جانب بڑھی اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر ہم تیزی سے دائیں جانب ہو گئے۔ وہ تیزی سے آگے نکل گئی اور کچھ دور جا کر اس نے اپنا رخ بدلا اور دوبارہ ہماری طرف بڑھی۔

یہ دیکھ کر ہم نے دوبارہ اس پر گولیوں کی بارش کر دی مگر اس سے پہلے کہ گولیاں اس کے جسم کو چھوئیں وہ



کسی کوئی کی مانند ہمارے جسموں سے آنکھ لائی ہم نے اپنے بچاؤ کی بھرپور کوشش کی مگر اس کے جسم کے شدید جھکے سے ہم سب اچھل کر دور جا کرے اور بندوبست ہمارے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ ہمیں چپے کرتے دیکھ کر وہ یکدم اچھل کر کھڑی ہوئی اور تیزی سے ایک مزدور کو ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اس کے بالوں کو پکڑ کر ایک زوردار جھکا دیا تو اس کا سر اس کے گھڑ سے علیحدہ ہو گیا اور اس میں سے نکلنے والی ٹیس اور رگس ہوا میں لہر لگئیں اور ہڑ ایک جانب جا کر اور زمین پر اس کے جسم کا خون تیزی سے پھیلنے لگا۔

اپنے سامی کا یہ بھیا یک انجام دیکھ کر ہم سب کے جسموں پر لرزہ طاری ہو گیا اور زمین اس جزیرے کے متعلق پھیلی ہوئی آستینی باتوں پر یقین آ گیا ہم اس وقت کوکوں رہے تھے جب ہم نے اس شخص جزیرے پر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم نے دوڑ کر دوبارہ اپنی بندھنوں کو اٹھانے کا ارادہ کیا مگر اب وہ بلا ہمیں اس بات کا موقع کہاں دیتے گئی تھی اس نے دوبارہ اچھل کر ایک اور ساتھی کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا مگر اب ہم سب ہوشیار ہو گئے تھے اس لئے ہم نے اصرار اور ہو کر خود کو اس کے حملے سے بچایا۔

مگر پھر بھی ایک بد قسمت مزدور اس کی گرفت میں آئی گیا جسے اس مخلوق نے جلدی سے پکڑ کر ایک بھرپور پھنڑ اس کے چہرے پر دے مارا اور اس کے چہرے پر پھنڑوں پڑا جیسے کسی نادیہ قوت نے اسے لوہے کا گرز دے مارا ہوا اس کا دایاں گال پھٹ گیا اور اس کی کھال ایک جانب لٹک گئی تھی وہ چیخا ہوا ایک جانب بھاگا مگر وہ اس کی پنجوں سے بے نیاز اسے اپنی جانب ٹھکے گئی اور اپنے قریب آتے ہی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ٹانگوں کو پکڑ کر مخالف سمت میں کھینچ دیا یہ دیکھ کر خوف سے ہماری چیخیں نکل گئیں کیونکہ ایک زندہ شخص ہمارے سامنے دھوڑ میں تقسیم ہو گیا تھا۔

ہم نے لرزے جسموں کے ساتھ اس طرف دوڑ لگادی جہاں ہماری لالچ کھڑی تھی یہ شکر تھا کہ ہم نے اس کو مغربی کے ساتھ رسی سے نہیں باندھا تھا اس لئے اس کے نزدیک پہنچے ہی ہم سب اچھل اچھل کر اس میں سوار ہونے لگے میں نے جلدی سے جب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالنا

چابی تو یہ دیکھ کر بھک سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا کہ جب خالی تھی اور لالچ کی چابی نہ تھی کہاں گئی تھی شاید بھانستے ہوئے جزیرے پر ہی نہیں گئی ہوگی۔

بہر حال یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا اس لئے ہم نے جلدی سے نیچے ہاتھ لالچ کو دھکا لگا کر پانی کے اندر دوڑ تک لے گئے اب ساحل کی زمین اور لالچ کا فاصلہ تقریباً پچیس تیس فٹ کے قریب ہو گیا تھا مگر اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اچھا چٹک وہ بلا پانی کے اندر سے نمودار ہوئی اور ہم میں سے کسی اور بد نصیب کو دبوچ لے گی۔ یہاں سے جزیرے پر پہنچی ہوئی ریت چاند کی چاندنی میں ہیروں کی مانند چمک رہی تھی دور سے وہ بلا ہمیں صاف نظر آرہی تھی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دھوڑوں میں بے ہمارے ساتھی کے سینے کو اپنے ناخنوں سے لہو جھرا اور اس کا دل ٹھگی میں لے کر پھر پھر چبانے لگی ہمیں یہ دیکھ کر ہلکا پھلکا آنے لگیں۔

ہمارے سامی شروعات میں ہی ہم سے پھنڑ گئے تھے جن کی موت کا ہم سب کو بے حد غصوں قائل تھا۔ لہذا اس کے بعد اس کے ہاتھ میں ہمارے مردہ سامی کے پیچھے اور گردے پھول رہے تھے خون سے اس کا چہرہ لبریز ہو گیا تھا خوف و ہشت کی وجہ سے ہم سے اس کی طرف دیکھا بھی نہ جا رہا تھا وہ گوشت کھانے میں اس قدر مصروف تھی کہ اس پاس نظر آنے والے گلیڈز اور گلوگز کو بھی بیٹھے اس کو بڑے غور اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ہم بے بسی کی تصویر بنے اپنے دو معصوم اور بے گناہ ساتھیوں کو اس خوفناک بلا کا کھاجانے دیکھتے رہے اور ان کی خاطر کچھ بھی نہ کر پائے اور اب اپنی جائیں بچا کر لالچ میں چپے بیٹھے تھے خوف سے ہمیں نیند نہیں آئی اور ہم جزیرے پر نظریں لگائے رات گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ خوفناک عفریت پکھدیر بعد دوبارہ اچھل اور اس کا جسم پھر گھول ہوا اور وہ تیزی سے ایک جانب اڑھکنے لگی اور کچھ ہی دیر میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی ہم نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے ہمیں بال بال موت کے منہ سے بچالیا تھا۔

رات کے بچانے کون سے پہر ہماری آنکھ لگ گئی اور

اس وقت جاگے جب سورج کی کرنیں لالچ کے عرشے پر پھیلنے لگی تھیں پہلے تو ہم بے خیالی میں آرام سے لیٹے سورج کو نکتے رہے پھر جیسے ہی ہمیں رات والی خوفناک بلا اور وہ خونی منظر یاد آیا ہم فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور تیزی سے جزیرے کی طرف نظریں دوڑائیں تو ہمیں وہاں پھیلی ہوئی ہریالی نظر آئی جو کہ کل رات اندیرا ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں وہ جا بجا پھیلے ہوئے عجیب و غریب قسم کے عنابی اور پیلے پھول بھی دکھائی نہیں دیئے تھے جن کا سائز ایک پیالے جتنا بڑا تھا اور ان کا رخ اوپر کی بجائے زمین کی طرف تھا یہ کم و بیش چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور بچانے ان میں سے کون سی بھین بھین خوشبو نکل رہی تھی کہ اس کا احساس ہمیں اتنے فاصلے سے بھی بخوبی ہو رہا تھا اس کے فوراً بعد ہم نے جزیرے کے چاروں طرف بھی غور سے دیکھا شروع کر دیا کہ کہیں وہ عفریت دوبارہ ہماری تاک میں نہ چھپی بیٹھی ہو مگر کافی دور دور تک دیکھنے کے باوجود بھی وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

ہم نے ہلکا پھلکا ناشتہ کیا اور پھر باقی باغ جانے والے مزدوروں کے ساتھ مل کر لالچ کو کھیل کر دوبارہ ساحل تک لے آئے اور ایک رسی کی مدد سے قریب کے ایک درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ دیا کہ کہیں لالچ رسی کھل جانے کی وجہ سے گھرے پانی میں نہ چلی جائے۔ ہماری رائفلیں ابھی تک وہیں پڑی تھیں اور خیمے بھی اسی طرح اترتے تھے اس بلا کا فکار ہونے والے ہمارے دلوں ساتھیوں کا بچا کچھا گوشت لگڑ لگڑ کھا گئے تھے اور اب وہیں صرف ہڈیوں کے کڑھانچے ہی بڑے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے اپنی رائفلیں قابو کیں اور پھر خیمہ اٹھا کر ان کو لینا اور احتیاط سے لالچ میں رکھ دیا اور رائفلیں ہاتھوں میں تھام کر جزیرے کے اندر داخل ہو گئے ہم نے چاروں مزدوروں کو اپنے نوکر نظریں جمائے رکھنے کا کہہ دیا تھا ہمیں خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا دوبارہ نہ حملہ آور ہو جائے اس انداز میں ہم آگے بڑھتے جزیرے کے اندر داخل ہو گئے۔

جزیرے میں درختوں کی بہتات تھی اور جنگلی جھاڑیاں جگہ جگہ راستے میں نظر آئیں گھبان درختوں کی وجہ

سے زمین پر اندر چڑھا ہوا تھا اب جیسے ہی ہم جزیرے کے اندر داخل ہوئے تو ہمیں اس میں پھرنے والے جنگلی جانور اور حشرات الارض بھی نظر آنے لگے۔

بڑا عجیب اور پراسرار جزیرہ تھا جس میں سرخ رنگ کے جانور کافی مقدار میں دکھائی دے رہے تھے وہ اپنی ننھی ننھی آنکھوں سے جھاڑیوں میں چپے ہماری طرف دیکھ رہے تھے ان کا جسم خرگوش کی مانند اور چہرہ بلی جیسا تھا ہم نے ایسے جانور پہلے بھی نہیں دیکھے تھے۔

ابھی ہم آپس میں باتیں کرتے اور اصرار دیکھتے تھوڑی دور ہی چلے تھے کہ جزیرے کی زمین یوں ہلنے لگی جیسے کوئی دیوقامت مخلوق اس کو روندنی چلی آرہی ہو ہمارے خوف سے رنگ فق ہو گئے ابھی ہم اپنے بچاؤ کی کوئی صورت سوچ ہی رہے تھے۔

اچانک ہمارے سروں پر موجود درختوں میں ہلچل ہوئی اور زمین پر یکدم تیز روشنی پھیل گئی اور یہ دیکھ کر ہماری دہشت سے چیخیں نکل گئیں کہ ایک ڈانوسا رسل کا جانور اپنی اونٹ جیسی تھوڑی درختوں سے نکلے ہمارے سروں پر موجود تھا اس کا سر درختوں کے اندر آنے سے سورج کی روشنی زمین پر پھیل گئی تھی جس کی وجہ سے دن کا سماں جنگل کے اندر تک پھیل گیا تھا ہم نے اسے دیکھتے ہی ایک جانب دوڑ لگادی ابھی ہم دس قدم ہی بھاگے ہوں گے کہ یکدم ہمارے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی اور ہم چیخنے چلا تے ہوئے سر کے بل ایک گہرے کنوئیں میں گرے چلے گئے۔

یہ شام کے تقریباً پانچ بجے کا وقت ہوگا جب چھ جنگلی ہاتھوں میں بھالے تھاٹے نکلے ہاؤں جنگل میں یوں چلے جا رہے تھے جیسے وہ کانٹوں پر نہیں بلکہ کسی قالین پر چل رہے ہوں ان کے سروں پر کسی جانور کی انتڑیوں کی بنی ہوئی رسیاں بندھی تھیں جن میں رنگ برنگے پٹے پڑے ہوئے تھے گالوں کو سفید رنگ سے رنگا ہوا تھا کالے چروں پر سفید فوسفور دانت اور ٹھوڑیاں قدرے لمبی تھیں۔

چلنے کے ساتھ ساتھ وہ آپس میں ایک غیر مانوس زبان میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے تھوڑے تھوڑے وقفے سے ان میں سے کسی کے ہنسنے کی آواز بھی سنائی دے

جالی تھی۔ یہ سب ”ناواشوگو“ قبیلے کے آخوڑ تھے جنہوں نے جنگلی جانوروں کا شکار کرنے کے لئے جنگل کے وسط میں ایک بہت بڑا اور گہرا کنواں کھود کر اسے جنگلی جھاڑیوں سے ڈھانپ رکھا تھا جس میں اکثر و بیشتر جنگلی جانور بے دھانی میں گر جاتے جنہیں بعد میں یہ لوگ نکال کر اپنی خوراک کے طور پر استعمال کرتے اس کے لئے وہ دوسرے تیسرے روز اپنی اپنی باری کے مطابق چکر لگاتے اور ایسا بھی بکھاری ہوتا تھا کہ انہیں مایوس لوٹنا پڑتا ورنہ زیادہ تر وہ شکار لے کر ہی واپس قبیلے میں لوٹتے۔

آج یہ چھ افراد اپنی باری کے مطابق خوراک کی تلاش میں جنگل کی جانب بڑھ رہے تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اس بار بھی وہ ناکام نہیں لوٹیں گے۔

گڑھے میں گرے ہی، ہم سب ریت کی خالی ہوتی ہوئی بوریلوں کی مانند ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہوتے چلے گئے اندکی زمین نرم ہونے کی وجہ سے انہیں کوئی گہری چوٹ نہیں آئی یوں لگ رہا تھا جیسے گڑھے میں بارش کا پانی جمع ہونے کی وجہ سے زمین کیلی ہو رہی تھی۔ گڑھے کی گہرائی کم و بیش بارہ فٹ کے قریب تھی اور اس کی چوڑائی تقریباً چودہ فٹ کے نزدیک ہوئی۔ انہوں نے کچھ دیر بیٹھ کر اپنی سانسوں کو بحال کیا پھر گڑھے سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگے زمین پر جا بجا چھوٹی بڑی لکڑیاں بھی بھری پڑی تھیں جو جانوروں کے گرنے کے ساتھ ہی شاید نیچے گری ہوں گی۔ تیسوڑلی ایک ڈیڑھ فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی لکڑی اٹھا کر اس کی نوک سے گڑھے کی دیوار میں ایک سوراخ بنانے لگا تقریباً چار انچ گہرا اور چوڑا سوراخ آسانی سے بن گیا دیوار پر چونکہ نرم تھیں اس لئے انہیں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑی۔ یہ دیکھ کر ایک مزدور زمین پر جھک کر بیٹھ گیا جسے دیکھ کر تیسوڑلی اس کی پیٹھ پر چڑھ کر مزید سوراخ نکالنے لگا وہ ایک ایک فٹ کے فاصلے سے سوراخ نکالتا جا رہا تھا اور کچھ ہی دیر میں اس نے تین سوراخ نکال لئے اب مزدور اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور تیسوڑلی اس کے کندھوں پر کھڑا مزید سوراخ نکالنے لگا اور مسلسل آدھا گھنٹہ محنت کرنے کے بعد وہ مزید تین سوراخ نکال چکا تھا۔

چھ سوراخ نکالنے کے بعد وہ اچھل کر مزدور کے کندھوں سے نیچے کودا اور ہمیں باہر نکلنے کے لئے ہدایات دینے لگا۔ اس تمام کارروائی میں ہم اس کا پلان سمجھ چکے تھے اس لئے اسے ہمیں باہر نکلنے کے طریقے کے متعلق زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑی۔

ابھی ہم باہر نکلنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ہمیں گڑھے کے اوپر ایک شور سنانا دیا ایسے لگا جیسے بہت سے افراد کسی غیر مانوس زبان میں تیز تیز بول رہے ہوں اور پھر یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کچھ ہی دیر میں وہی آوازیں گڑھے کے اوپر آکر کرک کرک لگیں اور کچھ بھیانک چہروں نے ہمیں گڑھے میں دیکھ لیا۔

ابھی ہم اپنے بچاؤ کے بارے میں کوئی منصوبہ بنانی رہے تھے کہ زمین پر درختوں کی چھال سے بنی ری آن گری اور ساتھ ہی ہمیں ایک ناکھ میں آنے والی زبان میں کچھ کہا جانے لگا۔ اور ہمیں یہ سمجھنے میں قطعاً دیر نہ لگی کہ وہ ہمیں اس رسی کے سہارے اوپر آنے کا کہہ رہے تھے ہم سب نے خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر نظروں ہی نظروں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے اس رسی کی مدد سے باہر نکلنے لگے۔

تھوڑی ہی دیر میں ہم سب گڑھے کے باہر تھے۔ باہر نکلنے ہی ہمیں وہاں جھنگ بھر تک وحشی دکھائی دیئے جن کے چہرے ہمیں دیکھتے ہی کھل اٹھے تھے وہ اپنے بھالوں کی انہوں سے ہمیں ایک طرف چلنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ہم ان کے کہنے کے مطابق اس طرف چلنے لگے جس طرف وہ ہمیں لے جانا چاہ رہے تھے۔

جنگل میں اب شام کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے اور ان کے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اندھرا پھیلنے سے پہلے پہلے جنگل سے نکل جانا چاہ رہے ہوں۔ جنگل کے اندر بنے ایک تنگ سے راستے پر چلتے ہوئے جیسے ہی ہم ایک موڑ مڑے ہمیں ایک دڑا نظر آیا جس کے کنارے پر مزید دو وحشی ہاتھوں میں بھالے تھے یوں کھڑے ہمیں آتا دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی انہونی جہز دیکھ لی ہو۔ ہم تیزی سے چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچے

مگنے میں آتا دیکھ کر وہ خوشی سے ناپٹے لگے۔ وحشی ہمیں لئے دوڑے کے اندر داخل ہوئے ہمیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ہم حیرت سے وہاں پھیلے ہوئے خیموں کو دیکھ رہے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم کسی تہذیب یافتہ دنیا میں آگئے ہوں سب خیمے ایک ترتیب سے بنے ہوئے تھے ان کی بناوٹ اور ان میں استعمال ہونے والا سامان سب کا سب ایک جیسا ہی تھا۔ لیکن ایک بڑی سی جمو پڑی جس کا سانسز سب سے بڑا تھا ایک بہت ہی اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھی جس کے اوپر ایک لکڑی پر ہرن کی کھوپڑی لٹکی ہوئی تھی یہ غالباً اس قبیلے کے سردار کی رہائش گاہ ہوگی۔ یہ سوچتے ہوئے ہم چلتے ہوئے تھکی میں داخل ہو گئے۔

جیسے ہی ہم تھکی کے وسط میں پہنچے جمو پڑیوں سے بچے اور عورتیں نکل کر اپنے اپنے گھروں کے باہر جمع ہونے لگے۔ وہ سب جن کے ساتھ ہم یہاں تک پہنچے تھے ہمیں لئے ایک طرف بنے ہوئے جمو پڑے میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک کافی کشادہ جمو پڑی تھی جس کے اندر کچھ ریل کے بستر بچھے ہوئے تھے ایک طرف ایک مٹکا اور دو آب خورے بھی رکھے تھے۔ وہ وحشی ہمیں جمو پڑی میں چھوڑ کر واپس لوٹ گئے۔ ہم کچھ دیر بیٹھو فوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی تدبیر سوچنے لگے۔ ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔

تمام وحشی وسط میں ایک بھیانک اور مکروہ شکل کی عورت کے آگے دوڑا نو بیٹھے ہوئے تھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اسکول بچہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو کوئی سبق پڑھا رہے ہوں۔ وہ بھیانک شکل عورت نجانے کوسی زبان میں اشلوک پڑھا رہی تھی جو ان سب کی سمجھ میں آنے سے قاصر تھی۔ عورت نے اپنے دائیں ہاتھ میں کسی جانور کی ٹانگ کی بڑی تھامی ہوئی تھی اور بائیں ہاتھ میں ایک خرگوش پکڑا ہوا تھا جو خوف سے تڑپ رہا تھا وہ اپنی ہکواس کے دوران بار بار جھگیوں کو اس خرگوش کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی جس کے جواب میں جنگلی اس خرگوش کو دیکھ کر چیختے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس عورت نے ایک جھگٹے سے اس خرگوش کا سر اس کے دھڑے سے علیحدہ کر کے دو پھینک دیا۔

یہ دیکھ کر تمام جنگلی بھدے کی حالت میں زمین پر گر گئے۔ انہیں اس طرح دیکھ کر عورت نے ہاتھ میں جھوٹا ہوا خرگوش کا دھڑا اپنے دانتوں سے نوچنا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں خرگوش کے جسم کو اپنے پیٹ میں اگل گئی تھی۔

وحشیوں میں موجود ایک بوڑھا شخص جو اس کی یہ تمام کارروائی کو بغور دیکھ رہا تھا اس کے خرگوش کھاتے ہی اس نے کسی پرندے کے سر کی بنی ہوئی ایک دسل اپنے پیٹ کی جیب سے نکالی اور فوراً اپنے منہ سے لگا کر زوردار پھونک مار دی۔ اس سر میں سے ایک تیز تھکنی نما آواز نکلی اور زمین پر پڑے ہوئے تمام وحشی یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اگر انہیں ایک لمحہ کی بھی دیر ہو جاتی تو ان پر قحط ٹوٹ پڑتی۔ عورت نے بوڑھے شخص کو کوئی بات کہی تو سب اس کی آواز سن کر اس جمو پڑی کی جانب متوجہ ہو گئے جس میں اس وقت ہم سب قید تھے۔

شمان نے اٹھ کر جمو پڑی کی دیواروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا وہ جنگلی گھاس پھوس سے تیار کی گئی تھیں لیکن کافی مضبوط لگ رہی تھی اس نے کوئی تیز دھار قسم کے آلے کے لئے جمو پڑی میں نظریں دوڑائیں لیکن اسے وہاں کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جس کا استعمال کر کے وہ دیوار میں کوئی سوراخ بنا سکیں۔ تیسوڑلی اس کے ارادے کو بھانپتے ہوئے اس کے نزدیک آیا اور کہنے لگا۔ ”کیا سوچ رہے ہو؟“

”میں خود اسی زلوے پر سوچ رہا ہوں لیکن میں رات ہونے کا انتظار کروں گا تاکہ رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم یہاں سے فرار ہو سکیں۔ اس لئے ہمیں چاک و چوبند رہنے کے لئے ایک دو گھنٹوں تک آرام کر لینا چاہئے تاکہ بعد میں کسی قسم کی پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔“

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ اچانک جمو پڑی کا دروازہ کھلا ایک وحشی ہاتھ میں دو گھنٹوں کے اندر داخل ہوا پرندوں کے صرف پر صاف تھے یا بھونٹے ہوئے جل گئے مگر جسم ثابت ہی تھے یوں لگتا تھا جیسے انہیں زندہ ہی بھونٹا گیا ہو۔

یہ دیکھ کر ابا کیا نیاں آنے لگیں۔ وحشی نے اشارہ

کرتے ہوئے پرندے ایک طرف رکھے اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ انہوں نے پرندوں کی طرف دیکھا بھی گوارا نہ کیا اور سستانے کے انداز میں زمین پر بیچے کچرل کے بستر پر بیٹھ گئے۔

رات دیر سے دیر سے گزر رہی تھی اور کچھ ہی دیر میں ایک سکون کی سی کیفیت طاری ہو گئی انہوں نے اٹھ کر جھوپڑی سے باہر جھانکا تو باہر انہیں صرف ایک وحشی بھلا تھا۔ دو دروازے پر پہرہ دیتے نظر آیا اور وہ بھی نیند کی وجہ سے جھوم رہا تھا۔ قسمت ان پر مہربان تھی انہوں نے دو مزدوروں کو اس پر نظر رکھنے کا کہا اور خود تینوں جھوپڑی کے آخری حصے کی جانب بڑھ گئے وہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ٹھوڑی سی تلاش سے انہیں جھوپڑی میں ایک نوکیلی لکڑی مل گئی جس کی مدد سے انہوں نے دیوار میں سوراخ نکالنا شروع کر دیا اور کچھ ہی دیر میں مانتا بڑا سوراخ بنانے میں کامیاب ہو گئے جس سے ایک شخص با آسانی گزر سکے۔ لکڑی ایک طرف رکھ کر وہ باری باری اس سوراخ سے باہر کی جانب نکلے لگے۔

جھوپڑی کے باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی وہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں چلتے ہوئے ایک جانب چل پڑے اندھیرے میں چلتے ہوئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے ان کا ایک غلط قدم انہیں موت کی واوی میں لے جاسکتا تھا۔ ٹھوڑی دور تک چلنے کے بعد انہیں دور پہاڑیاں نظر آئی جو اندھیرے میں جنات کی طرح دکھائی دے رہی تھیں وہ انداز سے لیکن ذرا حیرت قدموں سے ان کی جانب بڑھنے لگے وہ جلد از جلد اس قیلے اور وحشیوں کی پہنچ سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ وحشیوں کو غالباً ابھی ان کے فرار کا پتہ نہیں چلا تھا ورنہ وہ ان کی تلاش میں نکل پڑتے دیے بھی رات کا پھینکا پہرہ ہونے کی وجہ سے وہ ان کی طرف سے بے فکر تھے کہ رات کی تاریکی میں وہ وہاں سے بھاگنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے صرف ایک وحشی کوئی ان کی چوکیداری کے لئے کافی سمجھا تھا۔ تقریباً آٹھ گھنٹہ چلنے کے بعد پہاڑیاں نزدیک آ گئی

تھیں یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پہاڑیاں میلوں فاصلے تک پھیلی ہوئی تھیں وہ اب دوڑنے کے انداز میں چل رہے تھے۔ نزدیک پہنچتے پر انہوں نے دیکھا کہ پہاڑیوں کا رنگ گہرا سیاہ تھا یوں لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں آگ میں دھکا دیا ہو اور اس پاس پڑے چھوٹے بڑے پتھر کی گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ نجانے یہ کوئی سرزمین تھی اس قسم کے پہاڑ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ شمال سے جنوب کی طرف پھیلا ہوا پہاڑیوں کا سلسلہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے کسی نے سیاہ رنگ کی جادو تان بکھی ہو۔

زمین پتھر کی تھی لیکن انہیں بھاگنے میں کوئی دقت نہ ہو رہی تھی وہ مسلسل آگے کی جانب بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ کافی دور تک بھاگنے کے بعد وہ بہت دور نکل آئے تھے اور پھر اپنے سامنے نظر آنے والی ایک غار کے اندر داخل ہو گئے۔ غار کے اندر عجیب طرح کا لہجہ پھیلا ہوا تھا یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں چوگاڑوں کو مار کر محفوظ کر لیا گیا ہو سانس تک لینا دشوار ہو رہا تھا یہ دیکھ کر وہ پلٹ کر دوبارہ غار کے دھانے کے قریب ہو گئے اور یہاں انہیں مکلی ہوا کی وجہ سے سانس لینے میں آسانی محسوس ہو رہی تھی۔

ساتھ ساتھ سب کو یہ بھی فکر ستا رہی تھی کہ وحشیوں کو جیسے ہی ان کے فرار کا پتہ چلا وہ ان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے اور اس بار اگر وہ ان کے ہاتھ لگ گئے تو انہیں موت کے منہ سے کوئی نہیں بچا پائے گا اور یہ سوچ سوچ کر ان کے سانس خشک ہو رہے تھے۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی اور اجالا پھیلنے تک انہیں اسی غار میں ہی پناہ لینے پڑے گی۔ نیند کو سوں دور تھی انہیں صرف اپنی جان بچانے کی فکر تھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگے سہے سہے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ آسمان پر آہستہ آہستہ سپید نمودار ہونے لگا اور ٹھوڑی دیر بعد اجالا پھیلنے لگا۔

روشنی پھیلنے سے غار کے اندر کا منظر بھی واضح ہو گیا تھا۔ ایک تنگ سارا سہ اس کے اندر دور تک جاتا نظر آ رہا تھا اندر اندر اندھیرا ہونے کی وجہ سے آگے تک دیکھنا ناممکن تھا۔ یہ سوچ کر کہ غار کے دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ شاید اندر موجود ہو انہوں نے اندر داخل ہونے کا فیصلہ

کر لیا۔ وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے غار کے اندر کی جانب بڑھنے لگے۔ ٹھوڑا سا اندر جاتے ہی انہیں محسوس ہوا کہ جیسے وہ پانی میں چل رہے ہوں اور جیسے جیسے وہ اندر بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے پانی گہرا ہوتا جا رہا تھا لیکن وہ برابر آگے بڑھتے رہے اور اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ مکر تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور چلتے جا رہے تھے۔

غار شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوئی جا رہی تھی انہوں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اب چاہے ان کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے وہ وہاں نہیں جائیں گے۔ یہ سوچ کر وہ مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ ٹھوڑی دیر میں انہیں آس پاس کا منظر صاف دکھائی دینے لگا شاید باہر سورج نکل آیا تھا۔ غار کی دیواریں سیلن زدہ تھیں جن پر بھی ہوئی سبز کائی کی تہہ میں جھانکتی پتھریاں اپنی چمکدار آنکھوں سے انہیں حیرت سے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے انہوں نے کسی انسان کو پہلی بار دیکھا ہو۔ سبز کائی کی وجہ سے ان کے جسم بھی سبزی ماہی نالی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ آگے بڑھتے رہے جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے ویسے ویسے غار کشادہ ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی وہ چند فرلانگ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ دور انہوں نے ایک دھماکے کی آواز سنی۔ یہ اس کا جیسے کوئی وزنی چیز پانی میں کودی ہو اور وہ آنکھیں میچا رہے اس طرف دیکھنے لگے جس طرف سے وہ آواز سنائی دی تھی لیکن بغور دیکھنے کے باوجود بھی وہ کچھ نہ دیکھ پائے۔

ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ پانی پر دوڑتی ہوئی وہ عجیب مخلوق ان کے سامنے تھی۔ مگر کچھ کی شکل کا ایک عجیب جانور جس کی چھٹانیں اور جسم بکری کے قد کے برابر تھا تیزی سے دوڑتا ہوا ان کی طرف بڑھتا آ رہا تھا اسے اس طرح اپنی جانب آتے دیکھ کر انہوں نے غار کے پچھلے حصے کی جانب دوڑ لگا دی لیکن اس جانور کی رفتار ان سے کہیں زیادہ تھی اور دیکھتے دیکھتے چند لمحوں میں وہ ان کے نزدیک پہنچ گیا۔ اسے اپنے اتنا نزدیک دیکھ کر وہ گھبرا گئے اور اسی گھبراہٹ میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر زمین پر گر گئے اور یہ نیچے گرنا ہی ان کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا اور وہ مخلوق

تیزی سے بھاگتی ہوئی ان کے آگے سے نکل گئی اپنی رفتار تیز ہونے کی وجہ سے وہ کافی دور جا کر دوبارہ چلی۔ لیکن اس عرصہ میں وہ سنبھل گئے تھے انہوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں بڑے بڑے پتھر اٹھائے اور جیسے ہی وہ مخلوق ان کے نزدیک پہنچی انہوں نے تاک کر اپنے اپنے ہاتھوں میں تھامے پتھر اس پر دے مارے۔ پتھر کی کمان سے نکلے ہوئے تیروں کی طرح اڑتے ہوئے اس کے جسم سے ٹکرائے اس کا چمک اٹھا۔ اسے بلا گھبراہٹ ایک لمحے کے لئے رکی اور دوسرے لمحے پہنچتی ہوئی غار کے اندر بھاگتی چلی گئی اس کی دوسرے کراہتی ہوئی آواز کی بازگشت بہت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ہم سب نے سکون کا سانس لیا اور اپنی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

ساری رات ایک طرف تو اس عفریت کے دوبارہ آنے کا خوف اور دوسری جانب وحشیوں کے ڈھونڈ لئے جانے کا ڈر ستا رہا اور رات دیر سے دیر سے اپنا سفر طے کر کے اچالے کی جانب بڑھتی رہی۔ خوف و وحشت سے کسی کی بھی ایک پل کے لئے آنکھ نہ لگی وحشیوں کو شاید ان کے فرار کا پتہ چل چکا ہوگا اور وہ بھوکے بھیر یوں کے طرح ان کی تلاش میں نکل پڑے ہوں گے لیکن ان پہاڑیوں میں ابھی تک ان کے پہنچنے کے کوئی آثار تک نظر نہیں آئے تھے اس لئے کسی قدر مطمئن تھے لیکن وہ ساری عمر اب ان پہاڑیوں میں بھی چھپ کر نہیں بیٹھ سکتے تھے اس لئے دن کا اجالا پھیلنے ہی انہوں نے غار سے نکل کر دوسرے ٹھکانے کی جانب پیش قدمی کا سوچا۔

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہے تھے کہ دن کی روشنی غار کے اندر تک آنے کی وجہ سے انہیں اس کے اندر دائیں جانب ایک سرنگ نظر آئی جس کا دہانہ تقریباً چار فٹ چوڑا ہوگا اس کے منہ کے آگے ایک بڑا سا پتھر رکھا تھا اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی نے بھاگتے ہوئے اسے ٹکرا کر دہانے سے دور ہٹا دیا ہے۔ اور وہ سمجھ گئے کہ رات والی عفریت شاید بھاگتے ہوئے اس پتھر سے ٹکرائی ہوگی اور اس کی زوردار ٹکر سے ہی یہ پتھر سرنگ کے منہ سے سرک گیا ہوگا۔

بہر حال انہوں نے اس پر مزید سوچنے میں وقت



ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اس سرنگ کی جانب بڑھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید اس سرنگ کے ذریعے وہ اس غار سے کہیں اور محفوظ جگہ نکل سکیں گے اور یہی سوچ کر انہوں نے سرنگ کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

غار کے سوراخ سے اندر کی جانب ایک ایک فرد جبکہ داخل ہو گیا اندر جاتے ہی انہیں ایسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہوادار کمرے میں آگئے ہوں کہیں سے تازہ ہوا اس کے اندر آ رہی تھی۔ یہ اندر سے تقریباً بارہ فٹ چوڑی سرنگ تھی جس کے سامنے کے رخ ایک بڑا سا ہل دکھائی دے رہا تھا اس ہل میں سورج کی روشنی کے آنے سے یوں لگ رہا تھا جیسے ہزاروں دھول کے ستاروں بلب ایک دم روشن کر دیئے گئے ہوں۔ اور اس ہل تک پہنچ کر کھن کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔

ہال کے دائیں ہاتھ ایک اور راستہ دکھائی دے رہا تھا جس میں جانے کے لئے تین سیڑھیاں پتھر رکھ کر بنائی گئی تھیں یوں لگتا تھا جیسے کوئی ذی روح یہاں رہتا رہا ہو لیکن اس دور دراز جزیرے میں بھلا کون سرگھرا ہوگا جو یہاں رہائش اختیار کرنے کا سوچیں۔ انہوں نے کچھ فیصلہ کیا اور اس نظر آنے والے راستے میں داخل ہو گئے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس میں چار پانچ تانے کے بڑے بڑے صندوق رکھے تھے جن کے رنگ گردش نیکل و نہار کے باعث سیاہ پڑ چکے تھے اور ان پر مونے مونے نقل پڑے ہوئے تھے جن پر کالی جی ہوئی تھی۔

صندوقوں پر یوں نقش و نگار کندہ ہوئے تھے جیسے بادشاہوں کے وقت میں ایسے صندوقوں پر ہوا کرتے تھے "خدا کی پناہ! اگر میں بھول نہیں رہا تو کیا یہ وہی خزانہ ہے؟" انھیں احمد نے حیرت سے چیتنے ہوئے کہا۔

"تم کس خزانے کا ذکر کر رہے ہو؟" تیسرے نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے ایک تاریخی ناول میں پڑھا تھا کہ ایک معزول بادشاہ نے جسے بغاوت کے ذریعے حکومت سے ہٹا دیا گیا تھا اس نے کسی نہ کسی طرح سے کچھ خزانہ ایک بحری

جہاز کے خزانے کے ساتھ ساز باز کر کے اس کے جہاز میں رکھوا دیا تھا اور خود ہمیں بدل کر اسی جہاز میں ایک ملازم کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا خزانہ دھات کی دس بارہ بیٹھیلیں میں چھپایا گیا تھا ایسا اس لئے کیا گیا تھا کہ خزانہ با حفاظت محفوظ جگہ پہنچ سکے۔

ایک روز بادشاہ نے اپنے خاص نائب کو نہ چاہتے ہوئے بھی خزانے کی حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ دونوں خزانے والے کہیں میں موجود تھے کہ سمندر میں طوفان آ گیا۔ جہاز کھنکوں کی مانند موجوں پر ڈولنے لگا مسافر پریشانی اور گھبراہٹ میں اپنے اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر بھاگنے لگے ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر لگی ہوئی تھی کسی کو کسی کا خیال نہ تھا اور اسی افراتفری میں کہیں سے بحری قزاق لوٹ مار کرتے اور جہاز پر چڑھ کر لوٹ مار چادی اور جوساز و سامان نظر آیا اسے لوٹ کر اپنے چھوٹے سے بحری جہاز میں بھرنے لگے۔

خزانہ جہاز کے نیچے بنے ہوئے ایک خفیہ تہ خانے میں چھپا دیا گیا تھا اس لئے ان کی نظروں سے اوجھل رہا اور عام طور پر دیکھنے میں نظر نہیں آتا تھا۔ تھوڑی دیر تک قزاق لوٹ مار کرتے رہے اور دوبارہ اپنے جہاز میں سوار ہو کر فرار ہو گئے۔

جہاز کے بچ جانے والے مسافروں میں راشد علی نام کا ایک جوڑا بھی تھا جو اپنی شادی کے بعد کھونٹے پھرنے کے ارادے سے یورپ کی جانب روانہ ہوا تھا۔ جہاز پر موجود تقریباً ہر مسافر ان بحری قزاقوں کی لوٹ مار کا شکار بنا تھا۔

راشد علی قزاقوں سے چھپتا ہوا نیچے بنے ہوئے تہ خانے تک پہنچ گیا تھا اور اسے اس بات کا بالکل احساس تک نہ ہوا کہ وہ اس وقت ایک بہت بڑے خزانے کے قریب کھڑا ہے۔

تہ خانے میں ایک جانب چھوٹی سی کھڑکی دکھائی دی جس پر ایک پر پھڑ پھڑانی فاختہ کی تصویر تھی اور اس پر کراس کا نشان بھی بنا ہوا تھا اسے اس تصویر کے یہاں لگانے کا مقصد سمجھ نہیں آیا اور وہ بے خیالی میں چلتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ کر گھبرا گیا۔

ابھی وہ غور سے اس تصویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک جہاز کو ایک جھٹکا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا ہو لیکن ایسا صرف چند لمحوں کے لئے ہوا اور پھر یکدم ایک صمیر خاموشی چھا گئی۔ یہ دیکھ کر راشد علی نے اس تصویر کو دیکھنے سے دیا تو وہ ایک ڈھکن کی مانند پراٹھ گئی اور اس کے اندر ایک اور کمرہ بنا ہوا تھا جس میں جھانکنے سے اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اس کے اندر چھ سات جتنی بیٹھیلیاں رکھی ہوئی تھیں اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں تاکہ اس کمرے کے اندر جانے کا کوئی اور راستہ مل سکے جلد ہی اسے اپنی بائیں جانب اسی طرح کا ایک دروازہ نظر آ گیا۔ اس نے اسے بھی اندر کی طرف دھکیلا تو وہ بھی ایک ڈھکن کی مانند پراٹھ گیا۔

دو فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا ایک راستہ اب اس کمرے کی طرف جانے کے لئے بن گیا تھا۔ وہ اس میں داخل ہوا تو سب بیٹھیلیں پر نقل پڑے ہوئے تھے اس نے آگے بڑھ کر ایک پتلی کا جائزہ لیتا چاہا کہ اچانک جہاز ایک پینڈم کی مانند ڈولنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ بیٹھیلیں میں شاید کوئی خاص چیز بند ہے۔ انسانی فطرت دیکھیں کہ اسے اپنی بچانے کی بجائے پتلی کھول کر دیکھنے کا شوق چرانے لگا۔ حالانکہ جس کسی کی بھی وہ بیٹھیلیاں ہوں گی وہ بھی شاید اب تک اپنی جان بچانے کی فکر میں جہاز سے نیچے نہیں نکلی جانے والی کسی تھی کیوں چکا ہوگا۔

راشد نے تھوڑی سی تلاش سے ایک لوہے کا مونٹا ڈنڈا حاصل کر لیا اور اس کی تین چار ضربوں سے تالا ٹوٹ کر لنگ گیا اس نے ڈنڈا ایک طرف پھینکا اور پتلی کا ڈھکن اوپر اٹھا دیا یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پتلی بالاب سونے کی اشرفیوں، ہیرے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء سے بھری ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈھکن بند کیا اور دروازہ بند کر کے جلدی سے باہر نکل آیا اور سیدھا اپنے کہیں کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی بیوی اس کی منتظر تھی۔

اس نے تمام بات بیوی کو بتائی اور وہیں رہنے کا کہہ کر خود جلدی سے کہیں سے باہر نکل آیا اس نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا اور پھر جلد ہی اسے اپنے مطلب کے

آدمی نظر آ گئے جن کی اسے تلاش تھی اس نے سات آٹھ ملازموں کو دولت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا جس میں یہ طے پایا تھا کہ وہ ایک مضبوط کشتی کا بندوبست کریں گے اور اسے چپکے سے پانی میں اتار کر لوگوں کی نظروں سے بچا کر خزانے والی بیٹھیلیاں جہاز سے دور لے جا کر کسی جزیرے پر چھپا دیں گے۔ اور کچھ ہی دیر میں ان ملازموں نے ریز کی ایک کافی بڑے ساز کی مضبوط کشتی رسوں کے ذریعے سمندر کے پانی میں اتاری اور باری باری چھ بیٹھیلیاں رسوں کی مدد سے کشتی میں اتارنے لگے اس کام میں انہیں بمشکل ایک بڑھ گھٹنہ لگا ہوگا۔

جہاز پر ایک افراتفری کی کیفیت طاری تھی ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی پڑی ہوئی تھی اس ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خاموشی سے اپنا کام مکمل کر لیا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی۔ پھر وہ سب بھی باری باری کشتی میں اترتے گئے اور جب تمام افراد کشتی میں پہنچ گئے تو وہ جلدی جلدی چپوڑوں کو چلاتے ہوئے کشتی کو جہاز سے دور لیجانے لگے۔

اسی اثناء میں انہوں نے دیکھا کہ جہاز اب سامنے سے سمندر کے پانی کی جانب جھٹکے لگا تھا جس سے اس کے عرشے پر بھاگتے ہوئے افراد کھیلوں کی طرح سمندر کے کنارے پانی میں گرے لگے۔ اور جہاز لہجہ بہ لہجہ سمندر میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا اور وہ سب بے بسی کی تصویر بنے اسے دیکھ رہے تھے۔

جہاز کافی بڑا تھا اس لئے اپنے وزن کی مناسبت سے تیزی سے غرق ہو رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سمندر ان کی نظروں کے سامنے اسے یوں نکل گیا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اب وہ تھے اور ان کے سامنے بے کراس پھیلا ہوا سمندر تھا۔ انہوں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا اور کشتی کو باری باری چپوڑوں کی مدد سے آگے دھکیلنے لگے۔

ملازموں نے یہ عقلمندی ضروری تھی کہ اپنے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان جو کہ بندوڑوں میں تھا وہ رکھنا نہ بھولے تھے ایک گتے کے کارٹن میں بہت سے خوراک کے

ڈبے اور کافی مقدار میں منرل و اثری بوتلیں تھیں۔ وہ چونکہ بحری جہاز کے ملازم تھے اس لئے سمندر میں کس چیز کی کب ضرورت پڑ جائے وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ کشتی پانی کی لہروں سے ٹکراتی ہوئی ایک جانب بھونکتی تھی۔

راشد علی نے اپنی بیوی کو بھی کشتی چلانے کا طریقہ سمجھا دیا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ اس وقت سمندر میں ہیں اور کئی بھی وقت نامساعد حالات کا سامنا ہو سکتا ہے اس لئے ہر کئی کوان حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔

وہ کشتی چلانے والے ایک ملازم کے پاس آن کر بیٹھ گیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ ”کیا خیال ہے ہم اس وقت کہاں ہیں؟“

”میرے خیال میں ہم کوس آئی لینڈ کی مغربی پٹی کے نزدیک سے گزر رہے ہیں“ اس ملازم نے کہاں پر نظریں جاتے ہوئے بڑے ملوثی سے جواب دیا۔

”کوس آئی لینڈ“ یہ کوئی جگہ ہے؟ راشد نے دوبارہ پوچھا۔

”یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بحری جہاز کے کپتان گزرنے سے ڈرتے ہیں کیونکہ اس جزیرے پر جانبجا مقناطیس کے پہاڑ ہیں اور اگر بھولے بیٹھے سے کوئی جہاز اس جزیرے کے نزدیک سے گزرے تو وہ مقناطیس کی پہاڑی سے اس طاقت سے اپنی طرف کھینچے ہیں کہ وہ اتنی زور سے ان پہاڑوں سے ٹکراتا ہے کہ پاش پاش ہو جاتا ہے اور لہجہ میں بھاری بھر کم جہاز ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر سمندر کے پانی پر بکھر جاتا ہے اور اگر ہم بھی اب اس وقت کسی لوہے والی چیز میں سفر کر رہے ہوتے تو اس وقت تک ہماری ٹوٹی پھوٹی لائیں سمندر کی مچھلیاں کھا رہی ہوتیں۔ فابری کی کشتی ہونے کی وجہ سے ہم محفوظ ہیں۔“ ملازم نے چہو چلاتے ہوئے اس کی بات کا جواب دیا۔

اس کی یہ بات سن کر راشد علی حیرت اور دہشت سے اس کی طرف دیکھنے لگا اس نے ملازم کی بات سن کر اس پر فوراً یقین کر لیا کیونکہ وہ ان راستوں پر آتا جاتا تھا اس لئے غالباً جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوگا۔

اب رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور آسمان پر بادل چھانے لگے تھے پس لگ بھگ دھاتھا جیسے کسی بھی لمحے موسلا دھار بارش ہونے لگے گی وہ اپنے بچاؤ کی ترکیب کرنے لگے کشتی میں سوار کھلے سمندر میں اور لوہے سے بارش ان کے لئے کافی مشکلات پیدا کر سکتی تھی وہ دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہے تھے کہ بارش نہ برے۔ اور شاید وہ گھڑی قبولیت کی ہوگی کہ اچانک ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور پھر چند ہی منٹوں میں بادل یوں آسمان سے غائب ہو گئے جیسے وہ انہیں خوفزدہ کرنے کے لئے آسمان پر نمودار ہوئے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ شکر ادا کیا اور اطمینان سے بیٹھ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات دیکھتے دیکھتے اپنا سفر ختم کر رہی تھی اور درافق پر ستارے اپنی چمک کھورہے تھے صبح کا سپیدہ آہستہ آہستہ اپنی پوجھل آنکھیں کھول رہا تھا۔ کشتی کو باری باری چلاتے انہیں کوئی ممکن محسوس نہ ہو رہی تھی اور خوراک کا بھی انہیں بہت فائدہ ہوا تھا جس کے کھانے سے انہیں اپنے جسم کو توانا لگ رہا تھا اور وہ پوری طرح چاق و چوبند تھے۔

انہیں اس بات کی بے انتہاء خوشی تھی کہ ان کے ہاتھ ایک بہت بڑا خزانہ لگ گیا تھا جو ان سب کی قسمت بدل سکتا تھا اگر کسی طرح زندہ سلامت وہ سب اپنے اپنے وطن لوٹ گئے تو ان کی ساری زندگی عیش و آرام سے گزرے گی۔ اس بات کو سوچتے ہوئے وہ اپنے سفر کو جاری رکھے ہوئے تھے آپس میں ملے کر کے انہوں نے خوراک کو احتیاط سے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ اگر ان کے پاس خوراک ختم ہوگئی تو انہیں بے بسی کی موت مرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا صبح کا سپیدہ نمودار ہوتے ہی انہیں دور بہت دور ایک سیاہ لکیر نظر آئی اسے دیکھتے ہی ان سب کے منہ سے خوشی سے جھپٹن لگ گئیں وہ سمجھ گئے کہ دور نظر آنے والی سیاہ لکیر کسی جزیرے کی موجودگی کو ظاہر کرتی ہے۔ انہوں نے تیزی سے کشتی کو اس جزیرے کی جانب چلانا شروع کر دیا جیسے جیسے وہ اس سیاہ لکیر کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے ویسے ویسے سیاہ لکیر چوڑی ہوتی جا رہی تھی اور بہت

جلد انہیں اس پر لگے ہوئے درخت نظر آنے لگے۔

جزیرے پر سیاہ چٹانیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور ہزاروں سال کی گردش میل و نہار کے باعث ان کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا جنہیں دیکھ کر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ قریب جانے پر انہیں چٹانوں کے عقب میں عجیب و غریب قسم کے درخت نظر آئے جو انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔

وہ جلدی جلدی کشتی کو چلاتے اس جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھتے گئے کچھ ہی دیر میں کشتی نے جزیرے کے ساحل کی زمین کو چھوا اور کنارے سے ٹکرا کر رک گئی۔ کشتی کو ایک دہائی کی مدد سے ایک بڑے سے پتھر سے مضبوطی سے باندھ کر ملازموں کی مدد سے خزانے کی بیٹیوں کو ساحل پر اتار دیا گیا۔ خوراک کے بچے ہوئے ڈبوں کو بھی ایک طرف رکھ دیا گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے ڈبوں سے خوراک نکالی اور پیٹ بھر کر کھایا اور پانی کی بکری کچھ دیر آرام کیا سب سورج نکل آیا تھا اور جزیرے کی ریت پر دھوپ میں لیٹنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔

کچھ دیر تک آرام کرنے کے بعد اب وہ آئندہ پیش آنے والے حالات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ اس پہلو پر بھی سوچ رہے تھے کہ اتنے بڑے خزانے کو اپنی دنیا میں کس طرح لے جائیں گے۔ یہ سوچ کر سب سے پہلے انہوں نے اس خزانے کو کسی محفوظ جگہ چھپانے کا فیصلہ کیا اور پھر سب پھیل کر چٹانوں میں نظر آنے والے غاروں کی طرف بڑھ گئے۔ غار اندر سے خالی تھے اور ان میں کسی قد رسیدن ہی ہو رہی تھی غالباً ایسا سمندری طوفانوں کے آنے سے سمندر کا پانی چٹانوں کو روندنا ہوا ان غاروں تک پہنچنا ہوگا جن کی وجہ سے یہ غاریں سیلن زدہ ہوگئی تھیں اور ان کی دیواروں پر سبز کائی جم گئی تھیں لیکن اس کے برعکس غار اندر سے کافی کشادہ اور ہوادار تھے کیونکہ وہاں کسی قسم کی مٹھن کا احساس تک ہوتا تھا انہیں یہاں آکر کافی سکون محسوس ہوا۔ انہوں نے ایک غار منتخب کیا اور اپنا سامان لا کر اس میں ایک صاف جگہ پر رکھ دیا۔ غار کے باہر چمکیلی دھوپ اپنے پر چھیلانے ہوئے تھی۔

کچھ دیر تک سستانے کے بعد راشد علی غار سے نکلا اور باہر کا جائزہ لے کر دوبارہ اندر داخل ہوا اور اپنے ساتھ تین ملازموں کو لے کر دوبارہ باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ انہیں چوکس رہنے کا کہہ گیا تھا۔ بیوی کو اس نے ساتھ نہیں لیا تھا۔ ساتھ ہی وہ اسے کہہ گیا تھا کہ ان کی واپسی تک دوسرے ملازموں کی مدد سے آگ جلا کر ڈبوں کا کھانا گرم کر کے رکھے کیونکہ ٹھنڈا کھانا کھا کر وہ تنگ آ گئے تھے۔ اسی لئے اس نے اسے اپنے ساتھ لیجانے سے گریز کیا تھا۔

جزیرے پر نظر آنے والے درختوں کے نزدیک پہنچ کر انہیں اس پر لگے ہوئے عجیب و غریب پھل نظر آئے جن کی شکل امرودی طرح اور رنگ سبز تھا جن میں ہلکی سی پیلے رنگ کی آمیزش بھی تھی۔ یہ ”ایلو“ کے درخت تھے جو ایک جنگلی پھل ہے جس کا ذائقہ کیسیلا لیکن مزیدار تھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے ایک پھل تو ڈر کر منہ میں ڈالا تو اس کا ذائقہ اتنا برانہ تھا جتنا وہ سوچ رہے تھے یہ دیکھ کر انہوں نے بہت سے پھل تو ڈر کر اپنی اپنی بیبیوں میں بھر لئے اور واپس غار کی طرف لوٹ گئے۔

پہلے تو انہوں نے سوچا تھا کہ جزیرے پر محسوس پھر کر دیکھنے کے ساتھ ساتھ کوئی جنگلی خرگوش وغیرہ نظر آ گیا تو اسے شکار کر کے تازہ گوشت حاصل کر سکیں گے تاکہ بند ڈبوں کا کھانا کھا کر منہ کا ذائقہ تبدیل ہو گیا تھا لیکن اب ان پھلوں کو کھانے کے بعد انہوں نے سوچا کہ اس میں اپنے دیگر ساتھیوں کو شال کرنا چاہئے یہ سوچ کر انہوں نے جزیرے پر گھومنے کا پروگرام ملتوی کر کے واپس غار میں جانے کی کٹائی تھی۔

خزانہ انہوں نے غار میں بنے ہوئے ایک کمرہ نما جگہ میں چھپا دیا تھا کہ اگر وہ زندہ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو اس خزانے کو اپنے ساتھ لے جائیں گے ورنہ اگر کبھی کوئی بھولے بسرے اس جزیرے پر آ چکا تو شاید قسمت کی دیوی اس پر مہربان ہو جائے اور وہ یہ خزانہ حاصل کر لے۔ جزیرہ اتنا لمبا چوڑا نظر نہ آ رہا تھا لیکن اس پر درختوں کی بہتات اور ہریالی بہت تھی۔ کسی قسم کا موڈی جانور بھی ابھی تک نظر نہ آیا تھا یا شاید وہ پورا جزیرہ نہ دیکھ

پائے تھے اور نہ ہی تمام غاروں میں جھانک سکے تھے۔  
جزیرے پر رہتے ہوئے انہیں دس بارہ روز ہو گئے تھے اس دوران دومرتبہ سمندری طوفان بھی آئے تھے لیکن غاروں کی وجہ سے انہیں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس دوران وہ پہرہوں ایک اونچی چٹان پر بیٹھ کر دور سمندر میں دیکھا کرتے تھے کہ شاید بھولے بھٹکے سے کوئی بحری جہاز اس طرف آنکھ تو وہ اسے اپنی مدد کے لئے بلا سکیں اور ساتھ ہی خزانہ بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ مگر ہر روز گھنٹوں بیٹھے رہنے کے باوجود انہیں اب تک کوئی جہاز نظر نہیں آیا تھا۔

دوسری صبح کا سورج ان کے لئے خوشی کی نوید لے کر آیا کیونکہ جیسے ہی راشد علی غار سے نکلا تو دور سمندر میں اسے ایک جہاز نظر آیا جس کی چٹنی سے نکلنے ہوئے دھوئیں کو وہ دور سے ہی دیکھ رہا تھا اس نے جلدی سے ایک بلند چٹان پر چڑھ کر اپنی پیش آناری اور زور زور سے اسے فضا میں ہلانے لگا اور شاید جہاز کے عرشہ پر کوئی دور بین سے جزیرے کی طرف طرف ہی دیکھ رہا تھا کہ جہاز نے اپنا رخ جزیرے کی طرف موڑ لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ عین وقت پر غار سے نکلا اگر اسے ایک لمحے کی بھی دیر ہو جاتی تو اس جزیرے پر ایڑیاں رگڑتے رگڑتے وہ سب اپنی جان دے دیتے اسے اس بیسی مدد پر حیرت ہو رہی تھی۔

جہاز آہستہ آہستہ جزیرے کے ساحل کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا اسے عرشہ پر ایک دو افراد کمزے صاف نظر آ رہے تھے جو ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلارہے تھے۔ اس نے زوردار آواز سے اپنے دیگر ساتھیوں کو پکارا اور جزیرے پر سناٹا ہونے کی وجہ سے اس کی آواز اس کے ساتھیوں کے کانوں تک با آسانی پہنچ گئی اور وہ سب ایک کر غار سے باہر نکل آئے اور یہ دیکھ کر ان کی خوشی سے ہاتھیں کھل گئیں کہ ایک درمیانے سائز کا بحری جہاز ان کے سامنے تھا۔

راشد علی پہلے ہی ساحل پر کھڑا جہاز کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاز کنارے سے زوردار ہی رگ گیا تھا اور ایک رسی کی میزمری اس کے اندر سے باہر نکلا گئی تھی۔ جہاز سے دو افراد باہر

کے ہاتھ لگی جوان دونوں میاں بیوی کی آخری رسومات کے لئے پہنچا تھا۔ اور بعد میں اس نے وہ ڈائری اپنے ایک ناول نگار دوست کو دے دی تھی کیونکہ وہ اس میں لکھے ہوئے تمام واقعات کو جھوٹا ہی سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے اس ڈائری میں بنے ہوئے نقشہ کو بھی غور سے دیکھنا گوارہ نہ کیا۔ اور اس طرح یہ قصہ ایک داستان کی صورت میں بدل گیا اور خزانہ حاصل کرنے کی کسی نے کوشش تک نہ کی۔

مگر آج اس خزانے کو یہاں دیکھ کر مجھے ناول میں لکھی ہوئی تحریر یاد آگئی۔ "انضال احمد نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے ان کے چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو نہ بچاڑے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ سب اس کی باتوں میں اس قدر کھوئے تھے کہ یہ تک بھول بیٹھے تھے کہ وہ اس وقت کس قسم کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ باتوں کے دوران انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور یہ بھی خیریت رہی کہ ابھی تک شاید دھبیوں کو ان پہاڑیوں تک پہنچنے کا خیال تک نہ آیا تھا اور نہ اب تک وہ ان تک پہنچ کر انہیں پکڑ سکے ہوتے۔

غار میں تاریکی پھیلنے لگی تھی اور انہیں بھوک بھی ستا رہی تھی۔ تو دور اور شان نے باہر جھانکا تو دور دور تک اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور انہیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر بھی کوئی جانور یا پرند نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر انہوں نے غار سے باہر نکل کر کھانے کے لئے کوئی جھاڑی دلدرد جنگلی پھل وغیرہ یا کوئی جنگلی خرگوش کی تلاش شروع کر دی۔ لیکن انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ مدت کا اندھیرا پھیلنے سے یہاں ناممکن تھا۔

وہ ابھی واپسی کا سوچ ہی رہے تھے کہ ایک جانب چند قدم دور انہیں تین چار جھاڑیاں نظر آئیں جن پر کچھ لگا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے نزدیک پہنچے تو دیکھا کہ ان پر آلو بخارے کی شکل کے پھل لگے ہوئے تھے جن کا رنگ گہرا لہو تھا اور ان پر سیاہ دھاریاں بنی ہوئی تھیں۔ نجانے کس قسم کے پھل تھے۔ ہم سوچ میں پڑ گئے کیونکہ وہ عجیب و غریب پھل کھانے کے لئے ان کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اگر وہ زہریلے پھل ہوئے تو؟ یہ سوچ کر وہ لرز کر رہ گئے۔ لیکن بھوک بھی ستا رہی تھی انہوں نے ایک دوسرے

کی طرف دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے تیسورے ایک پھل توڑا اور اپنے دانتوں سے اسے تھوڑا سا کاٹا پھل کا چھلکا موٹا اور رسیا تھا اسے اپنے منہ میں کھٹاس کا احساس ہوا تو وہی دیر تک تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی لیموں کھایا ہو لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہاء نہ رہی کہ چند لمحوں کے بعد اس کے منہ کا ذائقہ یوں بدل گیا جیسے اس نے شہد منہ میں اٹھل لیا ہو۔ یہ بات اس نے شان کو بتائی وہ بھی حیرت اور خوشی سے اس پھل کو دیکھنے لگا۔ میرے تسلی دینے پر اس نے جلدی جلدی بہت سے پھل توڑ کر اپنی جیبوں میں بھر لئے۔ میں نے بھی اس کی تقلید میں اپنی جیبیں پھلوں سے بھر لیں اور واپس غار کی جانب پیش قدمی کی۔

غار میں آکر ہم نے وہ پھل اپنے دیگر ساتھیوں میں بانٹ دیئے۔ انہوں نے بھی حیرت سے دیکھ کر وہ پھل کھائے۔ ہم سب قدرت کے اس عجیب و غریب پھل اور اس کے ذائقے پر عرش عرش کر رہے تھے۔ رات ہم نے اسی غار میں بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور حفاظت کے لئے دو افراد کو مقرر کرتے ہوئے باقی تان کر سو گئے۔

صبح تک ہم کھوئے پھل کھاتے رہے اور پھر اچانک غار میں پانی گرنے کے شور سے یکدم ہڑبڑا کر اٹھ گئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دور کہیں آبشار کا پانی غار کے اندر گر رہا ہو۔ ہم حیران تھے کہ اگر یہ آبشار ہی ہے تو اس کی آواز رات کو ہمیں کیوں سنائی نہ دی تھی۔ ہم نے اس طرف اپنی نظریں گھمائیں جہاں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی تو دور ہمیں ایک سفید نشان جس کا سائز تقریباً ایک فٹ بال جتنا معلوم ہو رہا تھا دکھائی دیا۔ ہم فوراً سمجھ گئے کہ وہ اس سرنگ کا دہانہ ہوگا جو دور ہی کی وجہ سے ہمیں چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم نے سکون کا سانس لیا اور مطمئن ہو گئے پھر ہم نے رات کے بچے ہوئے پھلوں کو اپنے معدے میں اتارا اور جلدی سے اس دہانے کی جانب پیش قدمی کی۔

دن کی روشنی پھیلنے کے باوجود غار میں ملگجاسا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور جابجا پتھر بھی ہمارے پاؤں سے



نکمر رہے تھے ہم چھوٹک چھوٹک کر قدم اٹھا رہے تھے اور یہ احتیاط ہی ہمارے کام آگئی کہ اچانک ایک موڑ مڑتے ہی ہمیں یکدم رکنا پڑا ہمارے سامنے ایک بہت بڑی کھائی تھی جس کا پائٹ کم و بیش بیس فٹ کے قریب ضرور ہوگا۔ اگر ہم احتیاط سے کام نہ لیتے تو اس وقت ہمارے جسم گوشت کے ٹکڑوں میں تقسیم ہوئے ہزاروں فٹ گہری کھائی میں پڑے ہوتے۔ ہم نے کھائی کے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کہ شاید کہیں سے کوئی راستہ دہانے کی جانب جانے کے لئے مل جائے مگر مدغم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں سے بھی کوئی رخ نہ یا پائی دکھائی نہ دی جس کے سہارے ہم اس کھائی کو پار کر کے دہانے کی جانب بڑھ سکتے۔

ابھی ہم یہی سوچ رہے تھے کہ اچانک غار کے اس دہانے کی طرف سے بہت سی ٹلی جلی آوازوں کا شور سنائی دیا جہاں سے ہم اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر خوف و وحشت سے ہماری سانسیں رک گئیں، ہم فوراً سمجھ گئے کہ وہ نہ ہو یہ ایسی قبیلے کے وحشی ہیں جو ہمیں ڈھونڈتے ہوئے اس غار تک آچکے ہیں۔ ہم نے اپنے بچاؤ کے لئے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور پھر ہمیں سامنے دائیں رخ ایک تنگ راستہ اندر جاتا دکھائی دیا ہمارا سوچتے سمجھتے کی تمام صلاحیتیں حلب ہو چکی تھیں اس لئے کچھ سوچے بنا ہم نے اس تنگ راستے کی جانب دوڑ لگا دی۔

یہ تقریباً بیس یا بیس تنگ دھڑنگ وحشی تھے جنہوں نے درختوں کے پتوں سے اپنے جسموں کو ڈھانپ رکھا تھا اور چہروں پر سرخ اور پیلے رنگ سے دھاریاں بنائی ہوئی تھیں ان کے ہاتھوں میں زہریلے دلی ٹنگلیاں تھیں اور چہروں پر خباثت چھائی ہوئی تھی ان کی حرکات سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کی تلاش ہے اور اگر وہ اسے مل گیا تو وہ اسے کچا چا جائیں گے۔ ان میں شامل ایک بوڑھا جس کے ہاتھ میں پرندوں کی کھوپڑیوں کی بنا ہوئی ایک ملا لنگ رہی تھی تیزی سے کچھ موگھتا ان سے آگے آگے چل رہا تھا اور اس کا رخ سیدھا غار کی طرف ہی تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے غار میں سے ان کی خوشبو آ رہی ہو

اور پھر دوسرے وحشیوں کو لئے غار کے اندر داخل ہو گیا۔ غار میں موجود پھلوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے کوئی یہاں ٹھہرا ہوا یہ دیکھ کر اس بوڑھے نے وحشیوں کو اپنی زبان میں کچھ کہا جسے سن کر ان میں سے تین وحشی غار کے اندر چلے گئے بھلیا وحشی وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں دوسری وحشی بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے اور انہیں کچھ کہا جسے سن کر وہ بھی تیزی سے دوڑتے ہوئے غار سے باہر نکل گئے۔

تنگ راستہ مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا لیکن ہم بنا ہمارے سیدھے بھاگتے چلے جا رہے تھے تقریباً ایک میل تک دوڑتے رہنے کی وجہ سے ہمارے سانس خوشی کی مانند چل رہے تھے لیکن ہمیں جانوں کی فکر تھی اس لئے اپنے بچاؤ کے لئے بھاگتے رہنے میں ہی عافیت تھی اور ہم جلد از جلد اس علاقے سے دوڑ نکل جانا چاہتے تھے۔

وحشی چونکہ اس علاقے کے باشندے تھے اس لئے ہمیں فکر تھی کہ کہیں وہ ہماری پوس گھتے ہوئے ہمارے پیچھے نہ آ رہے ہوں۔ لیکن اتنی دیر بھاگتے رہنے کے باوجود ابھی تک ہمیں سرنگ میں بھاگتے ہوئے صرف اپنے قدموں کی آوازیں ہی سنائی دے رہی تھیں۔ وحشیوں کی طرف سے تسلی ہوتے ہی ہم نے کچھ آرام کرنے کا سوچا تا کہ دوبارہ تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کر سکیں۔

سرنگ میں اب سامنے سے تازہ ہوا کے جھونکے آنے لگے تھے یہ دیکھ کر ہم خوشی سے ناچنے لگے کہ شاید اب ہم باہر نکلنے کے قریب تھے اور اس سرنگ کا دہانہ کہیں آس پاس ہی ہوگا۔ یہ دیکھ کر ہم نے آرام کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور دوبارہ بھاگنے لگے۔ جلد ہی ہمیں اپنے اندازے کی داد دینا پڑی ہمارے ایک موڑ مڑتے ہی بائیں جانے ایک دو فٹ چوڑا اور تین فٹ اونچا سوراخ تھا جس کے باہر سے تازہ ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ ہم تیزی سے بھاگتے ہوئے اس سوراخ کے نزدیک پہنچے اور ایک ایک کر کے اس سے باہر آ گئے۔

سرنگ سے باہر آتے ہی ہمارے سامنے سرسبز میدانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جس میں جا بجا جنگلی پھلوں کے درخت لگے ہوئے تھے۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ

ایک ہی درخت پر کئی قسم کے پھل لگے ہوئے تھے جن میں سے کچھ کی شکل لمبوری، کچھ چوکور اور کچھ گول تھے اور ان کا سائز بھی ایک دوسرے سے مختلف تھا اور رنگ میں بھی مشابہت نہ تھی ہماری معلومات کے مطابق پیوندکاری تو ہم نے ہی تھی جس سے ایک درخت پر دو قسم کے پھل لے سکتے ہیں لیکن اس دور دراز علاقے میں اس طرح کے درختوں پر کس نے پیوندکاری کی ہوگی یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے ایک نزدیک کے درخت سے کچھ پھل توڑے اور انہیں چکھا اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان کا ذائقہ یوں لگا جیسے ہم نے تازہ روٹی کا نوالہ منہ میں ڈال لیا ہو۔ ہم قدرت کے اس کرشمہ پر حیرت زدہ رہ گئے۔ ہم سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کیا میں کہیں ایسے درخت بھی پائے جاتے ہیں جن کے پھلوں کا ذائقہ روٹی کی طرح کا ہو۔ بحال حقیقت ہمارے سامنے تھی اور ہم اس حقیقت کو جھٹکا نہیں سکتے تھے۔

ہم نے جلدی جلدی بہت سے پھل توڑے اور انہیں اپنی جھولیوں اور جیبوں میں بھر لیا۔ ان پھلوں کی وجہ سے کم از کم ہماری بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا تھا ورنہ اس دیرانے میں ہمیں خوراک کہاں سے دستیاب ہوتی۔ خزانہ ہم نے وہیں غار میں ہی محفوظ کر دیا تھا کہ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو دوبارہ وہاں آ کر اسے لے جائیں گے مگر اس وقت تو اپنی جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے اس خزانے کو کہاں سمجھتے پھرتے اس لئے ہماری جانیں اس خزانے سے کہیں زیادہ قیمتی تھیں۔

میدانوں میں مگی ہری بھری گھاس بہت بھلی لگ رہی تھی اور دور تک ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے بنز رنگ کا قالین زمیں پر بچھا دیا ہو۔ ہم جلد از جلد یہاں سے کسی محفوظ جگہ پہنچ جانا چاہتے تھے کیونکہ جس طرح ہم اس سرنگ کے راستے یہاں نکل آئے تھے اسی طرح وہ وحشی بھی کس وقت ہمارے سروں پر پہنچ سکتے تھے۔ ہم کچھ دیر تک کھڑے چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتے رہے لیکن دور دور تک دیکھنے کے باوجود ہمیں کہیں کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی تھی جہاں ہم خود کو چھپا سکیں۔

اس عرصہ میں سورج ہمارے سروں پر آ پہنچا تھا اور ہم ابھی تک اپنی شش و پنج میں تھے کہ کہاں جائیں۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اپنے دیگر ساتھیوں کی تھی جو اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ کر ہمارے ساتھ آئے تھے اور تمام مشکلات کو جھیلنے میں ہمارا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ پھر ایک فیصلہ کرتے ہوئے ہم ناک کی سیدھ میں ایک جانب بڑھ گئے ہم نے سوچا کہ دیکھتے ہیں یہ میدانوں کا سلسلہ کہاں تک چلتا ہے اگر نصیب میں زندگی لکھی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں موت کے من میں نہ جانے دے گی۔

تین گھنٹوں تک پیدل چلتے رہنے سے ہماری حالت پتلی ہو رہی تھی پاؤں من من بھر کے ہو گئے تھے دل چاہتا تھا کہیں گر کر لمبی تان کر سو جائیں لیکن یہ سب کچھ صرف سوچنے کی حد تک ہی ٹھیک تھا کیونکہ اس وقت ہم بارود کے ڈھیر پر بیٹھے تھے وہ وحشی کسی بھی وقت ہمارے سروں پر پہنچ کر ہمارا ٹیٹو دا بکتے تھے اس لئے مسلسل چلنا ہماری مجبوری تھا آپس میں باہم صلاح و مشورہ سے ہم وقفے وقفے سے آرام بھی کر لیتے تھے تاکہ ہمارے جسم چست و توانا رہیں۔

مسلسل دو دن اور دو راتوں تک سفر کرنے سے ہمارے پاؤں میں چھالے بن گئے تھے جو چلتے میں ہمیں تکلیف دے رہے تھے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے ہمیں عجیب شکل کے پودے دکھائی دیئے جن کے زور رنگ کے پتے تھے ہم نے کچھ سوچتے ہوئے وہ پتے توڑ کر اپنے زخموں پر باندھ لئے ظاہر ہے ان دیرانوں میں ہمیں مزہم کہیں سے ملتی اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جہاں جہاں زخموں پر پتے باندھے تھے وہ ڈھم اس طرح بھرنے لگے جیسے کبھی ہوئے ہی نہ ہوں۔ ہم نے بہت سے پتے توڑ کر اپنے ساتھ لے لئے کہ شاید ان کی بھر بھی ضرورت پڑ جائے ان عجیب پتوں نے ہمارے زخموں کو پل بھر میں ٹھیک کر دیا تھا اور ہمیں اپنے زخموں میں ایک ششک کا احساس ہو رہا تھا ہم خدا کی طرف سے اس بروقت مدد کا شکر ادا کر رہے تھے۔

چلتے چلتے ہم ایک ایسے علاقے سے گزرے

جہاں ہمیں ایک اور عجوبہ نظر آیا ہم حیرانی سے ان بلی نما جانوروں کو دیکھ رہے تھے جو اپنے سروں پر ایک ٹوکدار بینک لئے اچانک نمودار ہوئے تھے ان کی تعداد کم از چالیس بچاس کے قریب تھی ان کا رنگ خاکستری اور نیلا تھا اور ان کی آنکھیں گول کی بجائے بیضی تھیں اور ایسے لگتا تھا جیسے کسی نے انہیں سر مڑا لیا دیا ہو۔ بڑی عجیب نسل کے جانور تھے جو اس پاس موجود چھوٹے چھوٹے پودوں پر لگے اسرو کی شکل کے پھل پوں رغبت سے کھا رہے تھے جیسے وہ ان کا سن پسند کھا جا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے منٹوں میں بہت سے پودے اجاڑ دیئے اور پھر جس تیزی کے ساتھ ان کے سامنے آئے اسی تیزی کے ساتھ واپس دوڑ گئے یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ کر نیند سے جاگے ہوں۔

”خدا کی پناہ! میں نے تو اس قسم کے جانوروں کے متعلق کہیں نہیں پڑھا شاید یہ نسل اس علاقے میں ہی پائی جاتی ہو چنکے یہ علاقہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں اس لئے کوئی ان کے بارے میں نہیں جانتا۔ شان نے بھر بھری لیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں! میں بھی یہی کہنے والا تھا میں خود اس قسم کے جانور پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔“

تھوڑی دیر تک سستانے کے بعد ہم دوبارہ چلنے لگے اس دوران ہم وقفے وقفے سے اپنے پیٹ کی آگ بجھی بجھاتے رہے تھے اس لئے زخموں کے پھر جانے اور پیٹ بھر جانے کی وجہ سے ہماری رفتار تیز تھی۔ ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی بجائے وہ چھوٹی چھوٹی میالے رنگ کی ٹیلیاں تھیں جن میں جابجا سانپوں یا نیلیوں کے بل بنے ہوئے تھے ہم ان سے دور دوری رہے اس سرزمین پر کب اور کیا واقعہ ہو جائے ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔ شام کے سامنے گھر سے ہو چلے تھے دور دور تک کوئی زری روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سورج مغرب میں غروب ہوتے ہوئے یوں لگ رہا تھا جیسے تاجے کی کوئی چمک دار پلیٹ کسی نے آسمان پر جڑی ہو۔ چل چل کر ٹھکن سے ہمارا برا حال ہو گیا تھا ابھی تک ہم ایک دوسرے کی بہت بندھنا تے چلتے رہے تھے لیکن اب ہمیں محسوس ہو رہا تھا کہ رات کے آنے سے پہلے ہمیں کوئی مناسب ٹھکانہ ڈھونڈنا ہوگا ورنہ ہم ان

دیرانوں میں ہی ایڑیاں پر گزر کر موت کو گلے لگا لیں گے۔ ابھی ہم اسی جگہ پر سوچ رہے تھے کہ تیرو پل کی نظر نیچے زمین پر پڑی تو اس کے ہوش اڑ گئے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جی ہاں از میں کا رنگ شام کے سامنے پھیلنے ہی سیاہ ہونا شروع ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام زمین سیاہ رنگ میں بدل گئی اس پر اُگے ہوئے جھاڑ جھکار بھی اپنی رنگت سبز سے سیاہ میں بدل چکے تھے۔ زمین کا رنگ سیاہ ہونے کی وجہ سے اندھیرا مزید بڑھ گیا تھا اور ہمیں چلنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔ ابھی ہم آگے بڑھنے کا سوچ رہے تھے کہ اچانک ہماری نظروں نے ایک اور عجیب منظر دیکھا ہمیں یوں لگا جیسے زمین پر اُگے ہوئے پودے چلنے لگے ہوں اور زمین پر بڑے پتھر ادھر ادھر لڑھکتے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی زلزلہ آنے والا ہو لیکن ایسا صرف چند لمحوں تک ہی ہوا اور پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔

موت کی سی خاموشی ہمیں اپنے دلوں کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی اور پھر ہمیں اس پر اسرار خاموشی سے وحشت ہونے لگی ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ ہم دھاڑیں مار مار کر روئیں اور کوئی ہمیں جب کروانے والا بھی نہ ہو۔ مگر ایسا ہم صرف سوچ سکتے تھے کیونکہ عملی طور پر ہم ایسا کرنے سے معذور تھے کیونکہ باوجود ہزار کوشش کے ہم منہ تک نہ کھول پائے ہمیں ایسا لگا جیسے کسی پر اسرار طاقت نے ہم سب کے منہ پر کوئی ٹیپ لگا دی ہو۔

ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ انہوں نے دور سے بھیڑیوں کے چیخنے کی آوازیں سنیں بہت سے بھیڑیے مل کر چیخ رہے تھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہوانے انہیں ان کی موجودگی کا پتہ دے دیا ہو۔ ہم خوف سے تھوک نچلتے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ اب کچھ ہی لمحوں میں ہم موت کے نزدیک پہنچ جائیں گے۔ خوفناک ویرانہ اور خوفناک بھیڑیے اور وہ سب خالی ہاتھ۔ ہمارے انجام کا اندازہ لگانا مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ لور کچھ ہی دیر میں خوفناک بھیڑیوں کا ایک غول دوڑتا ہوا ہمارے سامنے نمودار ہوا اور جیسے ہی انہوں نے ان پر حملہ کرنا چاہا یکدم نیلے رنگ کا

دھواں اُٹھتا ہوا ہمارے سامنے آ گیا۔

دھواں میں ایک عورت کی شبیہ واضح نظر آرہی تھی جسے دیکھتے ہی بھیڑیے دم بجا کر بھاگ گئے۔

ہم سب حیرت سے اس دھواں کو لور اس میں نظر آنی والی مخلوق کو دیکھ رہے تھے جس نے برقت پہنچ کر ہمیں بھیڑیوں کی خوراک بننے سے بچا لیا تھا۔ ”چنگل کھوری اس سرزمین پر خوش آمدید کہتی ہے یہ حیرتوں کی سرزمین ہے یہاں پر حیران ہونے والا ایک درناک عذاب کا شکار ہوتا ہے ”شگورین“ کا علاقہ ہے۔ میں بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ دکھاتی ہوں تمہیں مصیبت میں دیکھا تو مدد کے لئے آچکی“ اس نے ان کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

لیکن افضال کی نظریں اس کے پیروں پر پڑی ہوئی تھیں جس نے زندہ کچھوئوں کی طرح اپنے پیروں میں پائین رکھا تھا اور جب وہ وقفے وقفے سے پاؤں پر زور دیتی تو بل بھر کے لئے پھوے اپنی گردنیں باہر نکالتے اور دوبارہ اندر کر لیتے۔ یہ سب دیکھ کر افضال احمد نے شان کو اور تیر کو اس طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ منظر دکھایا۔ یہ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ ہمیں ڈھکا دیا جا رہا ہے اور قصہ کچھ اور ہے ہم نے جلدی سے اپنے اپنے گھٹے میں پہنچنے سے پہلے ہی کارخ اس مخلوق کی جانب کیا تو وہ چپٹی چلائی یکدم غائب ہو گئی اور ہم نے سکون کا سانس لیا۔

رات کافی گہری ہو چلی تھی ہم نے گھوم پھر کر کوئی جائے پناہ تلاش کرنا چاہی تو دور میں ایک عجیب شکل کا مکان بنا ہوا دکھائی دیا ایک نظر میں یوں لگتا تھا جیسے کوئی اونٹ بیٹھا ہو یا مکان کا رنگ گہرا سیاہ تھا اس لئے شاید ہمیں پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیا تھا۔ قریب جانے پر معلوم ہوا کہ اس عجیب و غریب مکان کا کوئی دروازہ ہی نہ تھا سامنے کے رخ داخلی دروازے پر دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے ستون بنے ہوئے تھے جن پر سفید رنگ سے دھاریاں بنائی گئی تھیں غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ دھاریاں نہیں بلکہ سفید رنگ کے سانپ تھے جو ستونوں پر لیٹے ہوئے تھے ایسا اس وقت محسوس ہوا جب انہیں وہ دھاریاں ملتی ہوئی محسوس ہوئیں تھیں۔

ہم یہ سوچ رہے تھے کہ آیا مکان میں جانے کا رسک لیا جائے یا نہیں سے لوٹ جایا جائے اور کوئی اور ٹھکانہ تلاش کیا جائے۔ ابھی ہم اسی شش و پنج میں تھے کہ وہ سیاہ مکان دو حصوں میں تقسیم ہوا اور اس کے اندر سے وہی عفریت ”چنگل کھوری“ برآمد ہوئی اس کے چہرے پر خباثت چھائی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں کا رنگ گہرا سرخ تھا یوں لگتا تھا جیسے وہ خونخوار بلا ابھی ابھی تازہ خون پی کر آئی ہو اس کی ہاتھوں سے خون کے قطرے ابھی تک ٹپک رہے تھے اس کے ارادے خطرناک لگ رہے تھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ انہیں دیکھ کر غصے سے تلملارہی ہو۔

وحشی غار سے نکلے ہی سیدھے جنگل میں جانے والے راستے پر بھاگتے چلے گئے وہ جلد از انہیں تلاش کرنا چاہتے تھے وہ انہیں بہت پہلے ہی تلاش کر لیتے لیکن انہیں ان کے فرار ہونے کا پتہ بہت دیر بعد چلا جب پہرے دار وحشی انہیں دیکھنے کے لئے جھوپڑی میں داخل ہوا۔ جھوپڑی میں انہیں نہ پا کر اس نے شور مچادیا اور پھر سارے قبیلے میں ان کے فرار کی خبر پھیل گئی اور بیس بائیس خونخوار وحشی ان کی تلاش میں نکل پڑے وہ انہیں تلاش کرتے کرتے کالی پہاڑیوں تک جا پہنچے تھے لیکن انہیں وہاں نہ پا کر وہ واپس جنگل کی طرف بھاگ گئے اور انہیں غار کے اندر ہی ہونی سرنگ کا خیال نہ آیا اور نہ اگر وہ اس کے ذریعے با آسانی ان تک پہنچ سکتے تھے۔

جنگل طویل ہونے کی وجہ سے انہیں بہت تیزی سے سفر کرنا پڑ رہا تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ اگر انہیں جنگل میں تلاش نہ کر سکے تو سیدھے ساحل پر جا کر چھپ کر بیٹھ جائیں گے اور وہیں سے انہیں شکار کر کے اپنے قبیلے کے لئے خوراک کا بندوبست کریں گے۔ ”چنگل کھوری“ کو دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے ہم اس کو اس طرح اپنے سامنے یوں اچانک دیکھ کر ٹھک کر رک گئے پھر اچانک ایک خیل کے آتے ہی تیرو نے دوبارہ تعویذ کی جانب ہاتھ بڑھایا یہ دیکھتے ہی ایک ایک پتھر زوردار آواز سے اس کے دائیں ہاتھ پر پڑا وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب بھاگا اور یہ جھلکتا ہی اس کے لئے فائدہ مند

ثابت ہوا اور ایک گول کڑا جس کے چاروں طرف تیز دھار دندلے بنے ہوئے تھے اس کی کمر سے شاخیں شاخیں کی آواز نکلتی ہوا اس کے پیچھے نظر آنے والے درخت کے تنے میں بیوست ہو گیا۔

اس عفریت نے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ اس پر دار کر دیا تھا شان نے قریب پڑا پتھر اٹھا دیا تاکہ اس عفریت پر دے مارا پتھر اڑتا ہوا سیدھا اس کی پیشانی پر لگا اس نے ایک جھٹکا کھاتے ہوئے خود کو سنبھالا اور اپنا دایاں ہاتھ ان کی جانب کر کے ایک جھٹکا داس کے ہاتھ سے جن کی انگلیاں سانپوں کی مانند لہرائی تھیں شعلے اٹکتی ہوئی ان کی طرف بڑھیں۔

یہ دیکھ کر ہم سب نے خود کو ان سے بچایا اور بھاگتے ہوئے سامنے نظر آنے والے مکان کے کھلے حصے سے اندر داخل ہو گئے۔

جنگل میں پوری طرح تلاش کر لینے کے بعد تمام وحشی ساحل پر موجود درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ گئے وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کا شکار آخر کار نہیں سے ہی واپس جائے گا ان میں موجود ایک بوڑھے وحشی نے فضا میں کچھ سونگتے ہوئے انہیں ہاتھ کے اشارے سے کچھ سمجھانا چاہا جسے وہ تمام سن کر پریشان ہو گئے۔ بوڑھا جیسے جیسے تفصیل بتاتا تھا ویسے ویسے وہاں موجود وحشی خوف و وحشت سے آنکھیں پھاڑے اس کی گفتگو سن رہے تھے۔ بوڑھے نے انہیں بتایا کہ ”فرار ہونے والوں کی تلاش میں جانے والے افراد کے متعلق وہاں کے قبیلے کے سردار نے اسے خبردار کیا تھا کہ اگر وہ سب ناکام لوٹتے ہیں تو ان کے ساتھ ساتھ ان کے بیوی بچوں کو بھی زندہ آگ میں جھونک دیا جائے گا تاکہ سورج و پیمانہ کی جبینٹ لے کر ان کے قبیلے پر آئندہ دلی معصیت ٹال سکے اس لئے ان کی اور ان کے گھر کے دیگر افراد کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ جیسے تیسے کر کے فرار ہونے والے افراد کو تلاش کر کے واپس قبیلے میں لے جائیں۔“ ..... بوڑھے نے لمبا سانس لیتے ہوئے بات ختم کی۔ بوڑھے کی اسی بات نے ہی ان سب وحشیوں کا خون خشک کر دیا تھا اس لئے انہوں نے ان سب کی واپسی تک

نہیں انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا جس میں داخل ہوتے ہی ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی تیز رفتار کشتی ہوئی چکی پر بیٹھ گئے ہوں ہم سب نے سنبھلنے کے لئے ابھی قدم جمائے ہی تھے کہ ہمارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور ہم سب سروں کے بل لٹے یا تال میں کرتے چلے گئے ہمارے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں لیکن جیسے جیسے ہم نیچے کرتے جارہے تھے کمرے میں بے پناہ شور مچنے لگا جس میں ہم سب کی چیخیں دب کر رہ گئیں۔ کافی دیر تک نیچے کرنے کے بعد چھپا کی آواز کے ساتھ ہی ہم پانی میں جا کر رہے۔ پانی اس قدر خشک تھا کہ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم کسی برف کے کارخانے میں داخل ہو گئے ہوں اور سردی سے ہمارے دانت بجتے لگے اور اسی کیفیت میں ہماری آنکھیں پھول ہوئے گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ہم پر نیند کا غلبہ طاری ہوا اور ہم سب کسی مردہ سانپ کی طرح پانی کی سطح پر تیرنے لگے شاید ہماری زندگی کا چراغ بجھ گیا تھا۔

دن کا اجالا پھیلنے ہی ہمیں ہوش آ گیا لیکن اب ہم پانی کی بجائے ایک سرسبز علاقے میں تھے ہمارے کپڑے بھیکے ہوئے تھے لیکن اب ہمیں سردی محسوس نہ ہو رہی تھی ہم بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور کچھ دیر تک نیند کی سی کیفیت میں ادھر ادھر دیکھتے رہے لیکن اپنے سامنے کے منظر پر نظر پڑتے ہی ہمارے ہوش ٹھکانے آ گئے ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہاں دیکھ رہے تھے۔

ہمارے سامنے پرگلا کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے موٹے تنے کے ساتھ ایک دودھیا رنگ کا اور نیلا دھاری دار اور ڈھولپٹا ہوا تھا وہ جس درخت کے ساتھ لپٹا ہوا تھا اس کے نیچے ایک پتھر کی سل رکھی ہوئی تھی جس کی شکل گول تھا بالترتیب اس کے درمیان ایک زرد رنگ کا پتھر کا پیالہ رکھا تھا جس کے کناروں میں دودھ کڈے لگے ہوئے تھے ان کنڈوں کے ساتھ ایک سفید رنگ کی زنجیر بندھی ہوئی تھی جس کا ایک سر اور دخت کے پیچھے کی جانب جاتا دکھائی دے رہا تھا اور دھاگردن جھکائے پیالے میں دیکھ رہا تھا جس

میں تجانے کہاں سے دودھ بھر کر آ رہا تھا جسے وہ پینے میں لگن تھا ابھی وہ اسی شش و پنج میں تھے کہ ایک چھپا کا ہوا اور ”چنگل کھوری“ پھر آن لگی۔ ”اس سے پہلے کہ تم اس اڑھے کو ختم کر دو جس میں میری جان ہے میں تم سب کو جلا کر ہضم کر دوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ان کی طرف اپنی انگلیاں جھنجکیں۔ سبز رنگ کی لہریں تیزی سے ان کی جانب بڑھیں اور سیدی تیلور علی کے سینے پر پڑیں اسے یوں لگا جیسے کسی نے لوہے کی گرم سلاخیں اس کے سینے میں دھنسا دی ہوں۔

وہ چیختا ہوا زمین پر گر گیا یہ دیکھ کر شان اور افضل نے بھاگ کر اسے تھامنا چاہا لیکن وہ کسی ریت کی خالی ہوتی ہوئی پوری کی مانند ان کے ہاتھوں سے نکل کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اس کے چہرے پر کرب کے آثار پھیل گئے تھے یوں لگد ہا تھا جیسے اسے انتہائی تکلیف ہو رہی ہو۔

شان نے جلدی سے اس کے سینے کو مسلتا شروع کر دیا اور میں نے اس کے پاؤں کے تکیاں تکیے مسلتے لگا۔ وہ عفریت دور کھڑی قہقہہ لگاری تھی اور ان کی بے بسی کا مذاق اڑا رہی تھی یہ دیکھ کر شان نے جلدی سے تیلور علی کے گلے سے تعویذ اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور اللہ کا نام لے کر اس کا رخ اس بلا کی جانب کر دیا۔ شاید قدرت کو ہماری بے بسی پر رحم آ گیا تھا اس لئے جیسے ہی اس نے تعویذ کا رخ اس کی طرف کیا ایک سفید ہلا سا چکراتا ہوا اس عفریت کی جانب بڑھا اور سیدھا اس عفریت کے گلے میں جا کر فٹ ہو گیا مگر یہ دیکھ کر ہم حیرت زدہ رہ گئے کہ وہ اسی طرح ایک طرف کھڑی قہقہہ لگاری تھی۔

اور پھر ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح شان کے دماغ میں آیا کہ اس کی جان تو سامنے موجود اڑھے میں پوشیدہ ہے یہ خیال فوراً آتے ہی اس نے تعویذ کا رخ دوبارہ اس اڑھے کی جانب کر دیا اور اسی طرح ایک گول پتھر تیزی سے گھومتا ہوا گیا اور اس بار اڑھے کے منہ پر جا کر فٹ ہو گیا۔

اڑھا جو دودھ پینے میں مصروف تھا اچانک افتاد ہو گیا اور اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا اور گول کڑے

نے اس کی گردن میں فٹ ہوتے ہی تنگ ہونا شروع کر دیا اور فٹ یہاں تک پہنچی کہ اس کا سارے ایک رات تک ہو گیا اور اڑھے کی گردن پچک کر رہ گئی اور دوسری طرف ”چنگل کھوری“ یہ دیکھ کر چیختی چلائی اس کی طرف بھاگی مگر چند قدم دور آ کر لہر آ کر گر گئی اور اس نے اپنی گردن کو یوں پکڑا ہوا تھا جیسے کسی نے اس کی گردن کو کسی مضبوط شکنے میں پکڑ رکھا ہو۔ اس عرصے میں افضل کی کوشش رنگ لائی اور تیلور علی نے ایک سانس لیا اور اپنی آنکھیں کھول دیں اور جیسے ہی اسے سامنے کا منظر نظر آیا اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر افضل نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور پھر اسے وہاں ٹھیس آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔

اس عفریت کی موت کا سن کر تیلور علی نے اطمینان کی سانس لی اور شان کی بہادری پر اسے مبارکباد دی جس نے بروقت سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اور ان کی جانوں کو اس عفریت کی وحشت کا شکار ہونے سے بچایا۔ اب وہ جلد از جلد یہاں سے ساحل کی جانب جانے والے راستے کی تلاش میں تھے تاکہ وہاں سے کسی جہاز کی مدد سے اپنے ملک روانہ ہو سکیں مگر ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم یہاں سے کیسے نکلیں کیونکہ چاروں طرف سرسبز زمین پھیلی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی ایسا راستہ نظر نہیں آ رہا تھا جس پر چل کر ہم ساحل کی طرف جا سکیں۔

پھر یہ فیصلہ کر کے کہ وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ کسی جانب پیش قدمی کی جائے اللہ تعالیٰ کوئی سبب ضرور پیدا کرے گا یہ سوچ کر سب نے مشرق کی سمت سفر شروع کر دیا چلتے چلتے شام ہوئی اور ایک جگہ سستانے کے بعد ہم دوبارہ چل پڑے اسی طرح مزید دو تین گھنٹے چلنے کے بعد سامنے یوں لگا جیسے کوئی درختوں کے جھنڈ ہیں ان پر نظر پڑتے ہی ہم تیزی سے سوڑتے ہوئے اس کی جانب بڑھے جیسے جیسے ہم نزدیک ہوتے جارہے تھے ویسے ویسے درختوں کے آثار واضح ہوتے جارہے تھے قریب جا کر ہم نے دیکھا کہ ان درختوں کے درمیان میں ایک تالاب بنا ہوا تھا۔ ہم خوش خوشی اس کی طرف دوڑے کہ شاید اس میں پانی موجود ہو لیکن یہ دیکھ کر ہماری خوشی باپوسی میں بدل گئی کہ

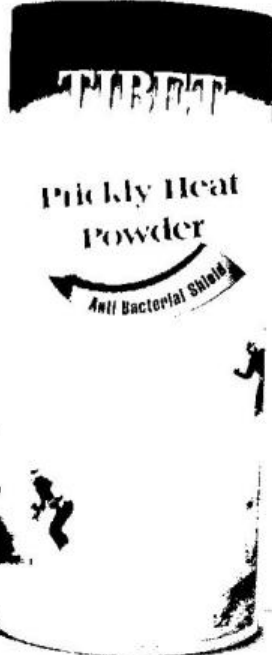


اب گرمی بھی ہوگئی ٹھنڈی...

تبت

پریکٹ بیٹ

پاؤڈر



تبت پریکٹ بیٹ پاؤڈر

گرمی دانوں سے نجات اور ٹھنڈک کا خوشگوار احساس

T111102/2K17

وہ ایک سوکھا تالاب تھا جس میں جا بجا جنگلی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور ان میں جنگلی چوہے دوڑتے پھر رہے تھے۔ سب اپنی قسمت کو کوسے ہوئے پلٹ کر درختوں کے نیچے آن کر بیٹھ گئے اور کچھ دیر ستانے کا سوچ کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ رات کا چھپلا پہر ہوگا جب شان کے پیٹ میں اچانک درد اٹھا اور وہ ہڑپڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے منہ سے ہلکی ہلکی سسکاریاں نکل رہی تھیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اس کے پیٹ میں فٹ بال چھینک دی ہو جو اھر اھر لوہکتی پھر رہی ہو اس کی سسکاریاں اچانک چیخوں میں بدل گئیں اور اس کے اس طرح چیخنے سے اس پاس لیٹے دوسرے افراد بھی اٹھ گئے وہ اچانک اس ناگہانی افتاد پر بوکھلا کر شان کی طرف دیکھنے لگے جو بری طرح چیخ رہا تھا۔ شان بار بار اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ انتہائی کرب کی حالت میں ہو۔

یہ دیکھ کر تیمور بھاگ کر اس کی جانب بڑھا اور اس کے پیٹ کو پکڑ کر ٹٹولنے لگا اسے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گول مٹول شے اس کے پیٹ میں کودتی پھر رہی ہو اسی دوران شان پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی ہم نے جلدی سے اسے ایک درخت کے نیچے لے جا کر لیٹا دیا اس کا پیٹ اسی طرح پھول اور پچک رہا تھا کہ تیمور نے کچھ سوچ کر جیسے ہی دونوں ہاتھوں سے اسے دوپٹے کر دیا شان کا منہ ایک لمحے کے لئے کھلا اور ایک دھول سا اس کے منہ سے نکل کر فضا میں ایک شہیہ کی صورت میں ڈھلنے لگا جلد ہی اس نے ایک دھول کی شکل اختیار کر لی۔

وہ ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا پتلا تھا جس کا رنگ رات کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا اور اس کی گولی گول آنکھیں بنام چٹلیوں کے ہماری طرف ہی دیکھ رہی تھیں جنہیں دیکھ کر وحشت طاری ہوتی تھی۔ ”مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ تم نے شہور بن کے علاقے میں گھسنے کی جرأت کیسے کی؟“ اس پتکے کے منہ سے ایک پتلی کی آواز نکلی۔

ہم سب سکتے کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے یہ سننے ہی جیسے ہوش میں آگئے ہم نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے درختوں کے باہر کی طرف

